آئینہ نما
(۲)

آئینہ نما

{ ۴ }

مرتب

قرۃ العین

نام کتاب : آئینہ نما (۴)

مرتب / ناشر : قرۃ العین

پتہ : باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئینٹ ہسپتال
برزلہ سرینگر کشمیر فون: 2433795

کمپیوٹر کمپوزنگ : TFC سنٹر مدینہ چوک گاؤ کدل سرینگر
فون: 2473818

سرورق : تصور: شجاع سلطان
عمل: ارشد

سال اشاعت : 2004ء

قیمت : عام ایڈیشن =/200 روپے
لائبریری ایڈیشن =/300 روپے

ترتیب

◆◆◆

اپنی بات

آئینہ نما کا چوتھا شمارہ منظرِ عام پر آنے سے مجھے جو مسرت ہو رہی ہے اس کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ پہلے شمارے کے لیے مضامین کا انتخاب میرے لیے ایک دشوار مرحلہ تھا لیکن ایک بار سلسلہ شروع ہوا تو پھر یہ کام آسان ہو گیا۔ اس ضمن میں آئینہ اور مرحوم شمیم احمد شمیم کے مداحوں نے بھی اپنی آراء سے میری مدد کی۔ پہلے شمارے کے شائع ہوتے ہی شخصیات کی فرمائش ہوئی اور اس کے فوراً بعد ہفتہ وار آئینہ کے تاریخی اداریوں کے بارے میں استفسار ہوا۔ ان اداریوں کی ترتیب کے دوران ہی کہیں کہیں اسمبلی اور پارلیمنٹ میں کی گئی تقاریر نظر سے گذریں تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگلا شمارہ شمیم صاحب کی تاریخ ساز تقریروں پر مشتمل ہوگا۔

بات دراصل یہ ہے کہ آئینہ کے فائلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی بھی تحریر ایسی نہیں لگتی جو موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے منفرد نہ ہو۔ اہمیت اور دلچسپی کے لحاظ سے تیسرے صفحے کے ابھی بہت سے اہم موضوع ہیں جن کو ترتیب دینے کی گنجائش ہے۔ اسمبلی میں ''نوک جھونک'' اور ''جھلکیاں'' کے علاوہ ''مشورے''، ''بے پر کی''، ''مشغلے''، جیسے عنوانات کے تحت مختصر مگر طنز و مزاح کی چاشنی سے بھرپور ادبی پارے اپنی مثال آپ ہیں۔ ادبی تخلیقات

جن میں کشمیری زبان، شاعری اور افسانہ نگاری پر ان کی تنقید اور تبصرہ شامل ہے کو کسی بھی حالت میں کشمیر کی ادبی تاریخ مرتب کرتے وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انشاء اللہ آپ کا خلوص اور تعاون یوں ہی ملتا رہا تو ان تمام موضوعات کو کتابی شکل دینے کا فریضہ بھی انجام دیا جائے گا۔

مرحوم شمیم احمد شمیم پانچ برس تک ریاستی اسمبلی اور چھ برس تک پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی شعلہ بیانی، بیباکی، بے خوفی اور نتائج کی پروا کیے بغیر دل کی بات زبان پر لا کر اپنے لیے ایک اہم، اونچا اور مخصوص مقام بنا لیا۔ پارلیمنٹ میں بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا اور اپنی حاضر جوابی، بذلہ سنجی، ظرافت اور شوخیِ گفتار کی بناء پر ایوان پر چھائے رہے اور ثابت کیا کہ وہ صرف تحریر ہی نہیں تقریر کے بھی بادشاہ ہیں۔ ان کے ہمعصروں کا کہنا ہے کہ پارلیمنٹ میں مرحوم کی تقریر کے دوران تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی تھی اور دوست تو دوست ان کے بدترین دشمن اور نقاد بھی ان کی جادو بیانی کے قائل تھے۔ مشہور صحافی خشونت سنگھ نے السٹیر ٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں زبان کا جادو جگانے پر مسٹر واجپائی کو ہندی کا، مسٹر پلو مودی کو انگریزی کا اور مرحوم شمیم احمد شمیم کو اُردو کا بہترین پارلیمانی مقرر قرار دیا تھا۔

آئینہ نما کا یہ شمارہ ان کی ریاستی اسمبلی اور پارلیمنٹ کی اہم تقریروں پر مشتمل ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں بظاہر بڑی سیاسی و سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ریاستی یا قومی سطح پر جب بھی کوئی سیاسی یا سماجی اتھل پتھل ہوتی میں اپنے آپ سے سوال کرتی کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ان کا ردِ عمل کیا ہوتا؟ مجھے یہ کہتے ہوئے ایک عجیب سی خوشی ہو رہی ہے کہ اس شمارے کی ترتیب کے دوران مجھے کم و بیش تمام سوالوں کا جواب مل گیا ہے۔ ان کی تقریروں کے

مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ تمام ''انقلابی'' تبدیلیوں کے باوجود بحیثیت مجموعی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ داخلی اور خارجی مسائل کی نوعیت وہی ہے جو آج سے ۳۵ برس قبل تھی۔ ریاست میں سیاسی غیر یقینی کی فضا، رشوت ستانی، کنبہ پروری، اقربا نوازی، عوامی مسائل کے بارے میں مجرمانہ غفلت شعاری، سب کچھ وہی ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ صورتِ حال اور بھی ابتر ہوگئی ہے۔ ہر محکمہ میں کسمپرسی اور زبوں حالی کا عالم ہے۔ محکمہ صحت ارباب اقتدار کی عدم توجہی کا شکار ہے تو محکمہ ٹرانسپورٹ میں بد نظمی اور انتشار ہے۔ تعلیمی، تربیتی اور پیشہ ورانہ اداروں کے سربراہوں کی عدم موجودگی، خستہ حال سڑکیں، مہنگائی، بجلی کی کمی اور فیس میں اضافہ، یہ سارے مسائل آج بھی ہمارا منہ چڑا رہے ہیں۔

پارلیمنٹ میں ظاہر ہے کہ دائرہ قدرے وسیع تھا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے ایوان میں شمیم صاحب نے جمہوریت، سیکولرازم، بنیادی حقوق کی برابری کے تئیں ہندوستانی حکمرانوں کے دوغلے پن، دوہرے معیاروں اور کھوکھلے دعوؤں کا پردہ چاک کر کے ہندوستانی عوام کی بالعموم اور کشمیری عوام کی بالخصوص بھرپور ترجمانی کا حق ادا کیا۔ ''ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ'' کے عنوان سے انھوں نے ۳۵ برس قبل مسلمانوں کی حالتِ زار کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ آج بھی صحیح ہے۔ ملک میں ان کی وفاداری آج بھی مشکوک ہے اور قومی دھارے میں شامل ہونے کے تمام راستے مسدود ہیں۔ گجرات میں فرقہ پرستی کا ناسور ایک پرانی بیماری ہے۔ بی جے پی کی قیادت میں یہ ناسور اور گہرا ہوگیا ہے اور نریندر مودی کی سربراہی میں ہوئے ۲۰۰۲ء میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات پوری دنیا میں ہندوستان کے لیے ذلت اور رسوائی کا باعث بنے ہیں۔

یوں تو ان کی ہر تقریر بڑی جاندار، دلچسپ اور دلائل سے بھر پور ہوتی لیکن ایمرجنسی کے نفاذ، بنگلہ دیش کے قیام، آئین میں ترمیم اور دیش بھگتی کی آڑ میں شہری آزادیوں کو سلب کرنے اور تحریر و تقریر پر پابندی، پر ان کی تقاریر ہندوستانی پارلیمنٹ کی تاریخ میں ایک روشن اضافہ ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ اہم تاریخی دستاویز ہیں اور ہندوستانی تاریخ کی آئینہ دار بھی۔ تاریخ اور سیاست کے طالب علموں کے لیے یہ یقیناً مددگار ثابت ہونگی۔

اس شمارے میں ایک بات اضافی ہے۔ پارلیمنٹ میں اگر چہ ان کی بیشتر تقریریں اُردو میں ہیں لیکن کبھی کبھی انہوں نے معاملے کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر انگریزی زبان کا سہارا لیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس شمارے میں ان کی بعض اہم تاریخی اور معرکتہ لآرا تقریریں من وعن شامل ہیں۔ اس سے شاید کسی حد تک ان لوگوں کی تسلی ہو جو بڑی سنجیدگی سے آئینہ نما کے تمام شماروں کا انگریزی میں ترجمے کے خواہشمند ہیں۔

ایک بات اور...... چونکہ یہ شمارہ شمیم صاحب کی تقریروں پر مشتمل ہے اور تحریر اور تقریر میں تھوڑا فرق محسوس ہو تو یہ اس لیے کہ تقریروں کو ہم نے تحریر کے ضابطے میں نہیں لایا اور بغیر ایڈٹ کیے ''من وعن'' شامل کیا ہے۔

حسب معمول اس شمارے کی ترتیب کے لیے مختلف حلقوں نے میری مدد کی ہے اور ان میں ان تمام لوگوں کی خصوصاً زمان صاحب کی مشکور ہوں جنہوں نے نہ صرف وقتاً فوقتاً میری مدد کی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔

آپ کی رائے کی منتظر
قرۃ العین

◆◆◆

یہ پیغام مسز اندرا گاندھی کی جانب سے
مرحوم شمیم احمد شمیم کی پہلی برسی پر موصول ہوا تھا

PRIME MINISTER

MESSAGE

Shri Shamim Ahmed Shamim was an editor and Parliamentarian of unusual boldness and dedication. On more than one occasion he scorned risk in pursuit of public duty. His contributions in Parliament were eloquent and noted for their impassioned secularism and patriotism. The seriousness with which Shri Shamim approached his responsibilities enabled him to grow in stature. The manner in which he bore the pain of his illness spoke for the quality of the man. A life of promise was cut short. I pay tribute to a fine son of India.

Indira Gandhi

(Indira Gandhi)

New Delhi
29th April, 1981

27/ مارچ 1967ء کو شمیم احمد شمیمؔ نے اپنی پارلیمانی زندگی کا آغاز اس تقریر سے کیا:

جناب والا!

گورنر صاحب کے انتہائی مختصر خطبے پر میں بڑی مفصل تقریر کرنا چاہتا ہوں لیکن ؎

''سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم'' کے مصداق آپ نے مجھے صرف دس منٹ عطا کیے ہیں۔ اس لیے اب سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کروں گا۔ جناب گورنر نے اپنے خطبے میں ہماری حقیر معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حد تک میں ان سے متفق ہوں کہ ملک بھر میں آزادانہ انتخابات ہوئے اور رائے دہندگان نے اپنی رائے کا اظہار آزادانہ طور پر کیا لیکن جب وہ اپنے اس بیان کا اطلاق ملک کے اس حصے پر بھی کرنا چاہتے ہیں جسے کشمیر کہتے ہیں تو ان سے اتفاق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ انہوں نے کشمیر اور باقی ملک کے انتخابات کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے اور یہاں اس ایوان میں مجھ سے پہلے کچھ سرکاری گواہ پیش ہوئے ہیں جنہوں نے انتخابات کے آزادانہ اور منصفانہ ہونے کی شہادت پیش کی ہے۔ لیکن میں سمجھتا

ہوں کہ اس مقدمے کا ایک معتبر گواہ یہاں موجود ہے اور اس گواہ کو دنیا شمیم احمد شمیم کے نام سے جانتی ہے۔ انتخابات کیسے ہوئے ، یہ مجھ سے پوچھئے کیونکہ میں انتخابات لڑ کے آیا ہوں ۔ میرا سارا وجود ابھی زخمی ہے اور جس حلقۂ انتخاب سے میں منتخب ہوا ہوں ، اس کے زخموں سے ابھی تک خون بہہ رہا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے جمہوریت اور انصاف کے علم برداروں کی ''جمہوریت'' اور ''انصاف'' کا تماشہ دیکھا ہے۔

جناب گورنر نے سوشل جسٹس اور سیکولر اِزم کا بھی اپنے خطبے میں ذکر کیا ہے اور اس ذکر سے مجھے کچھ باتیں یاد آگئی ہیں لیکن میں معاملہ کو زیادہ طوالت نہیں دینا چاہتا اور نہ ہی اس وقت اپنی داستان دہرانا چاہتا ہوں ، کیونکہ یہ داستان اتنی طویل ہے کہ اسے سنانے کے لیے ایک دن کیا ، ایک سال بھی کافی نہ ہوگا لیکن میں جناب والا کی وساطت سے اس ایوان کے لیڈر صادق صاحب سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ان کی قیادت میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے متعلق میری کیا رائے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیس سال کے بعد انہیں ایک تاریخی موقعہ ملا تھا ، ایک اہم منصب عطا ہوا تھا کہ وہ ہندوستان کی جمہوری Image کو صحیح طور پر یہاں کے عوام کے سامنے پیش کر سکتے تھے لیکن افسوس ہے کہ وہ یہ تاریخی فریضہ انجام دینے میں ناکام رہے۔ عرصہ بیس سال سے اس ریاست میں ظلم وستم اور اندھیرے کا راج تھا۔ (صادق صاحب کی طرف مخاطب ہو کر) اور آپ کو یہ اندھیرا دور کرنے کا موقعہ ملا تھا لیکن میں کہوں گا کہ آپ بڑے ہی بدنصیب ہیں ، بڑے ہی بدقسمت ہیں کہ اس تاریخی موقعہ کا فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ میں جھوٹ نہیں بولتا ، مجھے جھوٹ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا ۔ نہ ہی میں کسی ذاتی مفاد کے لیے یہ باتیں کہہ رہا

ہوں۔ میں تو اس ملک کے لیے رو رہا ہوں جس نے ہمارے لیے کروڑوں روپیہ صرف کیا، ہماری حفاظت کے لیے اپنے ہزاروں نوجوان صرف اس لیے قربان کیے کہ اس ریاست میں بھی جمہوریت کا بول بالا ہو۔ لیکن آپ نے کیا کیا کِیا؟ اس ملک کی جمہوری شکل کو مسخ کر کے ساری دُنیا میں بدنام کر دیا۔ ہندوستانی جمہوریت کی عظمت کی تمام دنیا میں تعریف ہوتی ہے اور جب بھی جمہوریت کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ لیکن آپ نے اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر اپنے ہاتھوں سے کالک مل دی ہے۔ مجھے صادق صاحب کی ذات سے کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان کے نہ چاہنے کے باوجود یہاں پر بدعنوانیاں ہوئی ہیں اور دھاندلیاں ہوئی ہیں۔ سرکاری ملازمین کو انتخابات کے لیے استعمال کرنے کا جرم تو اب ایسا جرم ہے جو ریاست میں پچھلے بیس برس کے دوران اتنی بار ہوا ہے کہ اس کا اب کسی کو گلہ ہی نہیں رہا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے دورِ اقتدار میں جوڈیشری کو بھی انتخابات جیتنے کے لیے آلہ کار بنایا گیا۔

کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ جوڈیشل افسراں نے کئی جگہ شدید قسم کی زیادتیاں کی ہیں؟ میرے حلقۂ انتخاب میں ایک جج صاحب چوری سے ووٹ ڈالتے ہوئے پائے گئے۔

شری حسام الدین:

میں گزارش کروں گا کہ شمیم صاحب کا یہ کہنا کہ انتخابات Fair نہیں ہوئے ہیں، درست نہیں ہے اور اگر ان کا کہنا درست ہوتا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس ایوان میں نہ آسکتے ...... (تالیاں)

قائد ایوان کی دیانت دارانہ رہنمائی میں یہاں پر آزادانہ انتخابات ہوئے۔ میری عرض ہے کہ ہر جگہ Democratic ماحول میں ہی Fair الیکشن ہوئے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو شمیم صاحب بھی یہاں نہ پہنچ سکتے۔

شری شمیم احمد شمیم:

میں یہاں کیسے پہنچا؟ یہ آپ اپنے آقاؤں سے پوچھئے۔ میں ان کے سینوں پر برچھیاں چلا کے یہاں آیا ہوں۔ میں ان کی چوریوں کو طشت از بام کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کا منہ توڑ جواب دینے کے بعد ہی یہاں آیا ہوں۔ میں ظلم اور بے انصافی کو شکست دے کر یہاں آیا ہوں۔ میں آپ کی طرح کسی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر نہیں آیا ہوں۔ آپ کی طرح ہوم گارڈز اور قومی خزانے کے سہارے نہیں آیا ہوں۔

مفتی محمد سعید (شمیم احمد شمیم سے مخاطب ہو کر)

You Should tell the name of the member whom you are refering.

شری شمیم احمد شمیم

I am refering to you and other members of your Party.

مفتی محمد سعید

How do you dare to say so?

شری شمیم احمد شمیم: میں عرض کر رہا ہوں کہ ایک جج صاحب کو چوری سے ووٹ ڈالتے ہوئے دیکھا گیا۔

جناب ڈپٹی سپیکر:

آنریبل ممبر کو ایوان کے قواعد و ضوابط کا احترام کرنا چاہئے اور

ہمیں جمہوری اور پارلیمانی طریقے سے ہی یہاں پر کاروائی کرنی چاہئے۔ اگر ہاؤس کے ذی عزت ممبران خود ہی ایوان کے قواعد کا پاس نہ کریں تو یہ ٹھیک نہ ہوگا۔ اس لیے میری عرض ہے کہ آپ جو کچھ یہاں پر کہیں، وہ سب رُولز کے مطابق ہی کہیں اور کسی ممبر کے خلاف کچھ نہ کہیں!

شمیم احمد شمیم: یہ ڈرامہ جو ہم آج یہاں دیکھ رہے ہیں، یہ ڈرامہ اسی سٹیج پر کئی بار سٹیج ہو چکا ہے۔ ایک بار یہ ڈرامہ شیخ صاحب کی ہدایت کاری میں بھی ہوا تھا۔ انتخابات ہوئے تھے اور انہوں نے اکثریت حاصل کر کے اسمبلی قائم کی تھی۔ اس کے بعد بخشی صاحب نے بھی یہ ڈرامہ کیا تھا اور اس طرح یہ ایوان بنا تھا۔

(صادق صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے) اور آج یہ ڈرامہ آپ کی ہدایت کاری میں سٹیج ہو رہا ہے اور آپ نے یہ کام خود کیا اور اب کی بار جو بد عنوانیاں ہوئی ہیں ان کو کون نہیں جانتا۔ جب بخشی صاحب آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے وہی کیا جو شیخ صاحب کرتے تھے اور آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہم نے بھی وہی کیا جو شیخ صاحب کرتے تھے۔ .... یہ تو آپ کا آپسی جھگڑا ہے۔ مجھے یہ بتایئے کہ میں جو نئی نسل کی آواز ہوں، میں نے کون سا جُرم کیا اور جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس کا کیا جواز ہے؟ تمام دُنیا یہی کہتی ہے کہ آپ نے ہندوستان کی شہرت پر دھبّہ لگایا ہے۔

جناب گورنر نے ایک اہم بات کی یاد دلائی ہے انہوں نے ڈیموکریسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جس ریاست میں ابھی تک سینکڑوں اشخاص ڈی۔ آئی۔ آر کے تحت بند ہوں وہاں کون سی ڈیموکریسی ہے؟ نائیک صاحب نے شیخ صاحب، مسعودی صاحب اور بیگ

صاحب کا ذکر کیا ہے یہ تو سب بڑی سیاسی شخصیتیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہماری ریاست میں ۱۶ ربرس سے لے کر ۲۴ ربرس کی عمر کے درجنوں بچے دو دو سال سے صرف اس لیے بند ہیں کہ ان میں سے کسی نے اپنی جوانی کی ترنگ میں کبھی کوئی نعرہ دیا، یا کبھی کوئی تقریر کی۔ میں ہندوستان کے آئین کے تقدّس اور اس کی عظمت پر یقین رکھتا ہوں اور اس کا واسطہ دے کر صادق صاحب سے گذارش کروں گا کہ آپ اپنے زندانوں کے دروازے کھول دیں، تاکہ ملک کا ہر شہری اپنے حقوق کا استعمال کر سکے۔ مجھے شیخ صاحب اور اُن کے رفقاء کی سیاست سے اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود میں ان کی رہائی کا پُر زور مطالبہ کرتا ہوں، اس لیے کہ ہند کے آئین کے تحت ان لوگوں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو ہمیں ہیں اور آئین ان حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ آپ کو لوگوں کے بارے میں شکایات ہیں کہ یہ پاکستانی ہیں یا تخریبی عناصر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ قصور تو حکمرانوں کا ہے، ہم سب کا ہے، جو اِن لوگوں کے ذہن آج تک نہیں بدل سکے ، جنہیں لوگوں کے ذہن بدلنے میں ناکامیابی ہوئی ہے۔ کمزوریاں حکمرانوں کی ہیں۔ عوام کا ذہن ہوم گارڈ اور پولیس کے سہارے نہیں بدلتا۔ آپ، میں اور ہم سب لوگ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں کہ بیس سال کے وقفے میں بھی ہم یہاں کے عوام کے شعور اور ذہن کی تربیت نہ کر پائے اور پھر اُلٹا الزام ہم یہاں کے لوگوں کے سر دیتے ہیں۔

گورنر صاحب نے اپنے خطبے میں ریاست کو درپیش اہم سیاسی مسائل کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ریاست کو صرف ایک سیاسی مسئلہ درپیش ہے اور وہ یہ کہ ہم کس طرح اس ریاست کے لوگوں کو یقین دِلا دیں کہ

ہندوستان کے ساتھ رہ کر ہماری ترقی اور خوشحالی کی منزل طے ہو سکتی ہے۔ ہم پچھلے بیس سال کے دوران ایسا کرنے میں ناکام رہے ہیں اور اب ہمارے سامنے صرف یہی ایک مسئلہ ہے۔ اس کی فکر کیجیے کہ آنے والا مورخ آپ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ کیونکہ تاریخ کسی کا لحاظ نہیں کرتی ہے۔ مورخ کسی سے ڈرتا نہیں۔ اسے ہوم گارڈز اور اقتدار کا خوف نہیں ہوتا۔ وہ بڑا بے انصاف اور بے مروّت ہوتا ہے۔ اس لیے اقتدار کی ہوس میں آپ یہ نہیں بھولیے کہ چند سال بعد آپ لوگ یہاں نہیں ہوں گے! لیکن تاریخ کے سینے میں وہ فیصلہ محفوظ ہوگا جو وہ آپ کے بارے میں دے گی۔ یہ دُرست ہے کہ جموں وکشمیر قانون ساز اسمبلی کے لیے کانگریس نے اکثریت حاصل کرلی ہے لیکن حکومت کو چاہیئے کہ اچھے کام کر کے اس حاصل کی ہوئی اکثریت کو Justify کرنے کی کوشش کرے اور خیال رہے کہ آپ کو اپنے اعمال کی روشنی میں جانچا جائے گا، اپنی اکثریت کی بنیاد پر نہیں (تالیاں)۔

جہاں تک صادق صاحب کی ذات کا تعلق ہے مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں ہے، بلکہ اُن سے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جمہوریت کی جو روشنی پھیلانے کے لیے وہ ایک بار پھر اقتدار میں آئے ہیں کہیں اُن کی لاپروائی سے وہ روشنی ہمیشہ کے لیے بُجھ نہ جائے۔ اب جب کہ صادق صاحب نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے تو اُن کے لیے یہ لازم بن جاتا ہے کہ لوگوں کے مفاد کو مقدم رکھ کر ایڈمنسٹریشن کو پاک وصاف کریں تاکہ ملک کے بہت سے مسائل حل ہو سکیں۔ لیکن صرف باتوں سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ کچھ کر کے نہ دکھائیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک میں خاص کر ہماری ریاست میں بہت زیادہ بے کاری کا

مسئلہ ہے۔ ایک طرف بے کاری ہے اور دوسری طرف رشوت ستانی! حال ہی میں نویں جماعت پاس ایک لڑکے کو صرف اس لیے اُستاد تعینات کیا گیا ہے کہ اس نے کانگریسی اُمیدوار کے حق میں کام کیا تھا۔ لیکن کل میں نے ڈاک بنگلے میں ایک دسویں پاس لڑکے کو مزدوری کرتے ہوئے دیکھا، اس لیے کہ اس بچارے کے پاس کوئی وسیلہ نہیں ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کرے۔ افسوس ہے کہ آج بھی اس ریاست میں اس قسم کی ناانصافیاں ہوتی رہتی ہیں اور ہم لوگ ابھی تک کچھ نہیں کر پائے ہیں۔ ڈاک بنگلے کا یہ مزدور لڑکا آپ کی ناانصافی، بے ضابطگی اور بدعنوانی کا کھلا ہوا اشتہار ہے۔ یہ آپ کے پورے نظام پر ایک گہرا طنز ہے! اور یاد رکھیئے کہ جب تک اس قسم کی بے انصافیاں ہوتی رہیں گی ہندوستانی جمہوریت اور ہندوستانی آئین کے تقدس پر کشمیری عوام کا اعتقاد بحال ہونا ناممکن ہے!

صادق صاحب! میں شوپیان کی اس معمر خاتون کی فریاد لے کر اس ایوان میں آیا ہوں جس کے ہاتھوں آپ کے ایک پٹواری نے ووٹ کی پرچی چھین کر اس پر کانگریسی اُمیدوار کے حق میں مہر ثبت کر دی۔ وہ عورت پوچھتی ہے کہ میں تو ہندوستانی جمہوریت پر اعتماد ظاہر کرنے کے لیے آئی تھی۔ میں تو اُس اُمیدوار کے حق میں ووٹ دینے آئی تھی جو ہندوستان کے آئین اور اس کی سرداری پر یقین رکھتا ہے۔ جو نہ پاکستانی تھا، نہ چینی، پھر میرے ساتھ بے انصافی کیوں ہوئی ہے؟ آپ کو، آپ کے ساتھیوں کو اور اس پورے نظام کو اس سوال کا جواب دینا ہوگا۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ آپ کے سرکاری اہلکاروں نے اس طرح آپ کی کانگریس کا ساتھ دیا ہے کہ اس سے دراصل محاذ رائے شماری کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ محاذ رائے شماری کے بائیکاٹ کی

اپیل کے باوجود شوپیان میں ۲۷/ ہزار میں سے تقریباً ۲۵/ ہزار ووٹر ووٹ دینے پر آمادہ تھے مگر آپ کے افسروں نے رائے دہندگان کو ووٹ ڈالنے ہی نہیں دیا۔ اس طرح درجنوں پولنگ بوتھوں سے ہزاروں لوگ اپنے حق کا استعمال کیے بغیر لوٹ گئے۔

آپ نے جوں توں کر اپنے لیے اکثریت کا بندوبست کر دیا ہے اور ایک بار پھر حکومت بنالی ہے۔ آپ کو یہ کامیابی مُبارک ہو۔ لیکن اس بات کا خیال رکھیئے کہ اقتدار بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ کچھ مقاصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آپ کی ذات سے لوگوں کو، اور مجھے بھی کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اُمیدوں کی شمع کی لو اگر مدھم ہوگئی ہے مگر ابھی بجھی نہیں ہے۔ اس لیے میں بڑے خلوص اور بڑی دردمندی کے ساتھ آپ سے گذارش کروں گا کہ ذاتی اور جماعتی مصلحتوں سے بلند ہو کر اس بدقسمت ملک کی کھوئی ہوئی شہرت کو بحال کرنے کے لیے کچھ کیجیے۔ مجھے معاف کیجیے کہ میری تقریر کا لہجہ ناگوار اور تلخ ہے لیکن اگر آپ نے ایک سال تک بھی ان توقعات کو کسی حد تک پورا کیا جو میں نے اور عوام نے آپ سے وابستہ کی ہیں تو ایک سال کے بعد آپ مجھے اس قدر سخت (Aggressive) نہیں پائیں گے۔ اپنے سامنے اس حقیقت کو رکھیئے کہ آنے والا مورخ آپ کے بارے میں کیا کہتا ہے..!

بجبٹ :- محض ایک ڈھونگ

۲۸ / مارچ:

جناب والا ! سب سے پہلے مجھے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کرنے دیجئے کہ حساب کتاب کے بارے میں، میں اتنا ہی کمزور واقع ہوا ہوں، جتنا ہماری ریاست کے وزیر خزانہ شری ڈی ۔پی ۔ در، لیکن چونکہ ہماری ریاست کی روایت یہ ہے کہ جو آدمی جس محکمے یا موضوع کے متعلق کچھ نہ جانتا ہوُ سے اس محکمے کا سربراہ بنا دیا جاتا ہے اِسلئے ڈی پی صاحب کے وزیر خزانہ ہونے کا جواز بھی یہی ہے اور ضمنی بجٹ پر میری تقریر کا بھی!

جہاں تک ایوان کے سامنے پیش کئے گئے ضمنی اخراجات اور ووٹ آن اکونٹ (Vote of account) کے گوشوارے کا تعلق ہے۔ان کو ایک نظر سے دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہماری ساری معیشت کا ڈھانچہ بالکل مصنوعی ہے۔آمدن اور اخراجات میں زبردستی ایک ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہماری ریاست ایک غریب ریاست ہے اور بجائے اسکے کہ آمدنی کے ذرائع بڑھانے کی کوشش کی جاتی ،ایک نو دولیتے کی طرح ہر اس چیز کی نقل کی جارہی ہے جس سے ہمارے بادشاہوں کی آن بان اور شان وشوکت میں اضافہ ہو۔ یہ اندازہ کرنے کے لئے اقتصادیات کا طالب علم ہونا ضروری نہیں ہے، کہ ساری اکانومی میں تصنع اور دکھاوے سے

کام لیا گیا ہے۔ گذشتہ بیس سال کے دوران بہت کام ہوئے لیکن ذرائع آمدن کو بڑھانے کے لئے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں اکانومی کا ذکر کیا ہے لیکن آج ہی ایوان کی میز پر جو آڈٹ رپورٹ رکھی گئی ہے اس کو سرسری طور دیکھنے سے بھی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سارے دعوے غلط ہیں۔ روپیہ بڑی بے دردی اور لاپرواہی کے ساتھ خرچ کیا جارہا ہے۔ حکومت کے دو محکموں کے درمیان بھی کوئی co-ordination نہیں ہے۔ آڈٹ رپورٹ سے ظاہر ہے کہ ایک جگہ ہزاروں روپیہ صرف کر کے ایک کنواں تعمیر کیا گیا۔ عین اس وقت جبکہ یہ کنواں اپنی تعمیر کے آخری مراحل میں تھا، محکمہ واٹر ورکس کی طرف سے نلکے بچھانے کا کام مکمل ہو گیا اور پھر کنوئیں کے کام کو اسی نامکمل حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ اسطرح ہزاروں مثالیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دو محکموں کے درمیان Co-Ordination کی عدم موجودگی سے لاکھوں روپیہ برباد ہو گیا۔

اسی طرح ایڈمنسٹریشن کو روز بروز TOP-HEAVY بنایا جا رہا ہے۔ شاید آبادی کے تناسب سے کہیں اتنے ڈی، ایس، پی۔ ایس، پی اے، ٹی، آئی نہ ہوں گے، جتنے اس خوش نصیب ریاست اور یہاں کے بدقسمت عوام کے حصے میں آئے ہیں۔ ریاست کو خوش نصیب میں نے اس لیے کہا ہے کہ یہ ہمارے حکمرانوں کی ریاست ہے اور ہر سرکاری غلام کے اضافے کے ساتھ ان کی شان وشوکت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن اس ساری آرائش کا بوجھ بالآخر غریب عوام پر پڑتا ہے جنہیں اپنے خون پسینے سے یہ قرضہ چکانا پڑتا ہے۔ یہی حالت محکمہ تعلیم محکمہ جنگلات اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں بھی ہے۔ ہر جگہ افسروں کی اک پوری فوج منظم ہے جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے!

لیکن ہر کوئی مناسب یا معقول کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

آج سرکار ہم سے ان کروڑوں روپیوں کی منظوری مانگتی ہے۔ ہم چاہیں بھی تو ان رقومات کی منظوری روک نہیں سکتے۔ اپنی بے پناہ اکثریت کے بل بوتے پر سرکار کو ان رقوم کی منظوری مل ہی جائے گی لیکن میں سرکاری بنچوں پر بیٹھے ہوئے دوستوں سے گذارش کروں گا کہ یہ روپیہ خرچ کرنے سے پہلے ایک بار یہ ضرور سوچ لیجئے کہ یہ کس کا لہو ہے اور اسے کس طرح خرچ کیا جانا چاہئے۔ اس کو خرچ کرنے سے اس غریب کا کوئی بھلا ہوگا یا نہیں جس کے نام پر یہ خرچ کیا جارہا ہے اور جسے بالآخر اسے ادا کرنا ہے۔ انتخابات کے دوران مجھے دو چیزوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ایک کشمیر کی ''جمہوریت'' جو بڑی ''حسین''، ''بڑی دلکش'' اور ''شباب آور'' ہے۔ میں نے اس جمہوریت کو صرف دیکھا ہی نہیں اس کا مزا بھی چکھا ہے اور دوسری بات یہ کہ بیس سال پہلے ملک میں آزادی کی جو نیلم پری آئی تھی، شہر والوں نے اس کی ایک جھلک تو دیکھ ہی لی ہوگی لیکن دیہاتی اس فیض سے بھی محروم رہے۔ بڑا چرچا کیا گیا ہے کہ کروڑوں نہیں اربوں روپیہ صرف ہوا ہے لیکن میں نے اپنے حلقۂ انتخاب کے ایک ایک گاؤں کا دورہ کیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ ریاست کے ان دیہات میں آزادی کا پرتو بھی نہیں پڑا ہے۔ یہاں کی سڑکیں ویران ہیں۔ یہاں کے کھیت سوگوار ہیں اور یہاں بسنے والوں کے چہرے پژمردہ اور آنکھیں بے نور ہیں۔ آزادی کے بعد سے صرف ایک فرق پڑا ہے وہ یہ کہ پہلے گاؤں میں ذیلداروں اور نمبرداروں کا راج ہوتا تھا لیکن اب کھڈ پنچوں کا راج ہے اور یہ کھڈ پنچ اکثر ہر حکمران جماعت کے ساتھ وابستہ ہو کر بیچارے غریب دیہاتیوں کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ آج

بیس سال بعد بھی شوپیان کے اکثر دیہات میں لوگوں کو پینے کا پانی مہیا نہیں ہے۔ ہم بڑے بڑے ترقیاتی پروجیکٹوں کا ذکر کرتے ہیں ہم نے ریڈیو سٹیشن قائم کیے اور اب ٹیلی ویژن لانے کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن انتہائی شرم کا مقام ہے کہ ہمارے دیہات میں ابھی لوگوں کو پینے کے لیے پانی تک مہیا نہیں، شوپیان سے صرف ڈیڑھ میل دور کریوہ مانلو میں، میں نے عورتوں کو اپنے نازک کندھوں پر پانی کے گھڑے اُٹھا کر پہاڑ پر چڑھتے دیکھا۔ اس پہاڑ پر جہاں چڑھتے چڑھتے میری سانس پھول گئی۔ میں وزارت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے شاہزادوں سے گذارش کروں گا کہ ہر صبح جب اپنے خوبصورت غسل خانوں میں قدم رکھ کر نلکہ کھولا کریں تو ان بدقسمت لوگوں کو بھی یاد کیا کریں۔ میں جہاں بھی گیا مجھ سے کسی نے نہ پاکستان مانگا، نہ شیخ صاحب کی جدائی کا ذکر کیا اور نہ ہی بخشی صاحب کی یاد میں آنسو بہائے۔ مجھ سے صرف لوگوں نے یہ شکایت کی کہ وہ غربت، افلاس اور تنگدستی کے مارے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سکولوں کا مطالبہ کیا اور پینے کا پانی مانگا۔ ہم لوگ صرف پانچ سال کے بعد انہیں اپنی صورت دکھاتے ہیں اور اب تو ظالموں نے بلا مقابلہ کامیاب ہونے کی ایک نئی طرز ایجاد کی ہے جس کی رو سے پانچ سال بعد بھی اب لوگوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، جہاں جہاں انتخابات ہوئے وہاں کانگریسی اُمیدواروں نے کم از کم لوگوں سے وعدے تو کیے، لیکن جہاں سے لوگ بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے۔ وہاں تو کسی نے لوگوں سے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا۔

جناب والا! میں وزیر خزانہ اور اس ایوان کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جوڈیشری کا معیار بلند سے بلند تر ہو جانا

چاہئے اگر چہ میں ایک جج صاحب کا مارا ہوا ہوں ۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ جوڈیشری کا معیار تب تک بلند نہیں ہوسکتا، جب تک کہ ججوں کی تنخواہیں نہ بڑھائی جائیں اور یہ ضروری ہے کہ قابل اور باصلاحیت نوجوانوں کو اس پیشے کی طرف راغب کرنے کے لیے اچھی تنخواہیں دی جائیں اور ساتھ ہی ججوں کو آزادی اور اثر ورسوخ سے بالاتر ہو کر کام کرنے کا موقع ملے گا۔

دوسرا اہم مسئلہ تعلیم کا ہے۔ ہماری ریاست میں اس اہم ترین شعبے کو سب سے کم اہمیت حاصل ہے اسے صرف نوکریاں مہیا کرنے اور نالائق آدمیوں کو جمع کرنے کا ایک گودام تصوّر کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر یونیورسٹی کو ہی لیجئے۔ یہ ہماری زندگی کا سب سے اہم اور فعال ادارہ ہے لیکن اس نوجوان یونیورسٹی پر ہم نے ایک مردِ ضعیف کو سوار کیا ہے اور اس کا وائس چانسلر ایک ایسے صاحب کو مقرر کیا ہے جو زندگی کے ۸۰ برس گزار کر اب موت کے انتظار میں یہاں بیٹھا ہے۔ ہم نے زمین کا سینہ چیر کر کوئلہ نکالا، ہم نے صحراؤں میں سے پٹرول نکالا، لیکن ہمیں اپنی یونیورسٹی کے لیے کہیں سے کوئی معقول وائس چانسلر نہیں ملتا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم یونیورسٹی کو کیا اہمیت دیتے ہیں۔

محکمۂ تعلیم کی طرح اب جوڈیشری میں بھی سفارشوں پر بڑا زور ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ الیکشن کے دوران ایک جج صاحب کو تبدیل کرنے کے لیے ایک بہت بڑے وزیر نے ہائیکوٹ پر دباؤ ڈالا۔ بہر کیف، جو کچھ ماضی میں ہوا، اسے نظر انداز کر دیجئے۔ چرچل نے کہا ہے کہ اگر ہم ماضی اور حال کے بکھیڑوں میں الجھے رہے تو مستقبل ہم سے دور بھاگے گا لیکن ایک بات کی گذارش ضرور کروں گا، وہ یہ کہ سروسز کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔

ہماری موجودہ سیاست میں سب سے زیادہ غلاظت سرکاری ملازموں کی ہی پھیلائی ہوئی ہے اور اگرچہ اس کی بنیادی ذمہ داری یہاں کے سیاست دانوں پر ہے لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ سیاست دانوں کی مرضی کے خلاف بھی اکثر سرکاری ملازم اپنی بے ایمانی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ مثلاً شوپیان میں انتخابات کے دوران پٹواریوں، کلرکوں اور بی، ڈی او نے جو دھاندلیاں کیں، مجھے یقین ہے کہ وہ صادق صاحب کے منشاء کے خلاف تھیں۔ بہر کیف ضرورت اس بات کی ہے کہ صادق صاحب اس طرف توجہ دیں۔

آخر میں معزز ممبران کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آج صبح میں نے اپنی کل والی تقریر کی رپورٹ دیکھی ہے اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میرے نام سے جو تقریر رپورٹ کی گئی ہے وہ میری نہیں تھی۔ اس لیے ممبر صاحبان مطمئن رہیں کہ ان کی کی گئی تقریروں کا اسمبلی کی رپورٹنگ میں بالکل الٹ درج ہوتا ہے۔

بے روزگاری کا مسئلہ

۲۹ / مارچ:

جناب والا ! مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ آپ کے اور میرے درمیان ایک مستقل کشمکش کا آغاز ہو گیا ہے۔ ایک آزاد ممبر ہونے کی حیثیت سے آپ نے مجھے صرف دس منٹ کا وقت دیا ہے اور میں اس الجھن میں ہوں کہ آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میرے حلقۂ انتخاب کے مسائل کتنے ہیں اور وہ کس قدر پسماندہ ہے اور ان کا ذکر کرنے کے لیے صرف دس منٹ کا وقت کافی نہیں ہے۔

شری ڈی۔ پی۔ در: آپ میرے وقت میں سے پانچ منٹ لے سکتے ہیں۔

شمیم احمد شمیم : شکریہ اس عنایت کا لیکن آپ چند قطروں سے میری پیاس بجھانا چاہتے ہیں اور میں سمندر چاہتا ہوں۔

سوگامی صاحب: قواعد کی رو سے آپ کو صرف..........

شمیم صاحب: سوگامی صاحب میں آپ سے بات نہیں کر رہا ہوں۔

سوگامی صاحب: دیکھئے مجھ سے الجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔

شمیم: میں کوشش نہیں کر رہا ہوں بلکہ براہ راست الجھ رہا ہوں۔

سوگامی صاحب: پھر اگر میں کوئی گستاخی کروں تو..........

شمیم: کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند۔

تو جناب والا میں عرض کر رہا تھا کہ میرا حلقہ انتخاب بے حد پسماندہ ہے اور وہاں کے رائے دہندگان نے بڑی آرزوؤں اور بڑی تمناؤں کے ساتھ مجھے اس ایوان میں بھیجا ہے اور میں ان کی آہوں کو اس ایوان تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

ڈی۔ پی۔ در: آپ آہوں اور آنسوں کا ذکر کیوں کرنے لگے موضوع پر بولیے۔

شمیم احمد شمیم: جس ریاست کے مقدر میں ڈی۔ پی۔ صاحب جیسے فنانس منسٹر ہوں وہاں آہوں اور آنسوں کا ذکر نہ ہو تو اور کیا ہوگا۔

شری ڈی۔ پی۔ در: آپ پہلے ہی چار پانچ دنوں میں رونے لگے تو پھر آئندہ کیا ہوگا۔

شمیم احمد شمیم: آپ کی ہی صورت دیکھ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ جب یہ بدل جائے گی تو ہم بھی جی بھر کے ہنسیں گے۔

میرے نزدیک سب سے اہم مسئلہ بے کاری کا مسئلہ ہے ہم نے اس مسئلہ کو (سائنسی) (Scientific) بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ خاص طور پر تعلیم یافتہ بے کاروں کا مسئلہ تشویشناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے لیکن ابھی تک ہم اس کو ایک ملک گیر مسئلے کی بنیادوں پر حل کرنے کے بجائے انفرادی طور حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نو جوانوں کو نوکریاں دینے کو ہم نے ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا ہے۔ سیاسی رشوت اور ذاتی رسوخ کی بناء پر بہتر تعلیم یافتہ افراد کو نوکری کے سلسلہ میں نظر انداز کیا جا تا رہا ہے اور روزگار ان کو مہیا کیا گیا جو کسی طور حاکموں کے شناسا ہیں یا جن کے پاس کوئی زوردار سفارش تھی۔ یہ مسئلہ صرف ہماری ریاست کو ہی درپیش نہیں بلکہ ملک کی دوسری

ریاستوں میں بھی یہ مسئلہ عام ہے۔مگر ہر جگہ Scientific طریقہ سے اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہاں پر ابھی تک جو ہوا وہ الیکشن کے پس منظر میں ہوا اور اپنے امیدواروں کو جتانے کے لیے آپ لوگوں نے نوکریاں دے دے کر ووٹروں کو خریدنے کی کوشش کی۔ جناب ڈی۔پی۔صاحب نے فرمایا کہ روایت یہاں پہلے سے چلی آرہی ہے اور بقول ان کے وہ ان روایات کا احترام کریں گے۔ بُری روایات کا احترام کرنے کے بجائے ان روایات سے بغاوت کر کے کچھ اچھی روایات قائم کیجیے۔ محکمۂ تعلیم میں استادوں کی بھرتی کو بے روزگاری دور کرنے کا ایک موثر ذریعہ سمجھا گیا ہے اور یہ سلسلہ یہاں پر ۱۹۵۳ء سے چلا آرہا ہے اور اس محکمہ کو سرکاری ملازمت کا گودام تصور کیا جاتا ہے۔ ماچس کی ڈبیوں پر استادوں کے آرڈر لکھے جاتے رہے ہیں اور جب بھی کسی کو نوکری دینے کا مسئلہ درپیش ہوا تو اُسے استاد کے منصبِ جلیل پر فائز کیا گیا اور اس طرح استادوں کی ایک پوری فوج منظّم ہوگئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کا معیار گرتا گیا۔ الیکشن کے دوران ٹیچرس کی بے شمار Oppointments کی گئیں اور حسب دستور جن کی Qualification زیادہ تھی ان کو نظر انداز کیا گیا اور جو Qualified نہ تھے ان کو کتنے ہی اہل امیدواروں پر ترجیح دی گئی۔ ایسا کیوں ہے اسی لیے کہ اثر و رسوخ کی مہر لگ جانے سے آپ کے لیے ایک نااہل اہل ہو جاتا ہے اور ایک اہل نااہل، بہر حال جو ہوا سو ہوا آئندہ آپ Scientific طریقہ پر اس مسئلہ کو حل کریں جس میں بے انصافی اور ذاتی رسوخ کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ آپ کو ساری معیشت کا جائزہ لینا ہوگا آپ کی معیشت un-productive ہے اور آپ آمدنی اور اخراجات کے مصنوعی گوشوارے

تیار کر کے دنیا کو یہ باور دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری فی کس آمدن میں اضافہ ہوا ہے یا یہ کہ آپ ریاست کو خوشحالی اور ترقی کی طرف لے جا رہے ہیں لیکن مجھے اپنے حلقۂ انتخاب کا دورہ کرتے ہوئے اس بات کا شدید احساس ہوا ہے کہ ترقی اور خوشحالی کے یہ سارے دعوے کھوکھلے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ۔ (اس مرحلے پر ڈی ۔ پی صاحب شمیم صاحب کے کان میں کچھ کہنے لگے ۔)

جناب والا ! ڈی ۔ پی صاحب کو اپنی پرانی عادتیں یاد آ رہی ہیں ان ہی کا اشتہار دے رہے تھے اس لیے میری (قہقہہ) خوبصورتی کی تعریف کر رہے تھے ۔

ایوان کے تقریباً سارے ممبر اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اپنے حلقۂ انتخاب میں انہیں سب سے پہلے جس مسئلے کا سامنا کرنا ہے وہ ان سینکڑوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار مہیا کرنے کا مسئلہ ہے جو پچھلے کئی سال سے روزگار کی آس لگائے بیٹھے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہوم منسٹر صاحب ہر ممبر کے کمرے کی تلاشی کا انتظام کرائیں تو ہر ممبر کے کمرے میں ، ان کے بستر ے میں ، ان کے غسل خانے میں اور ان کی جیبوں میں سے صرف نوکری کی درخواستیں نکل آئیں گی ۔ ہر تعلیم یافتہ نوجوان نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے ۔ میرے خیال میں اس مسئلے کو Haphazard طریقے سے حل کرنے کی ہر کوشش اس کو سنگین اور پیچیدہ بنا دے گی ۔ میرے حلقۂ انتخاب میں اس مسئلے کا فوری حل یہ ہوسکتا ہے کہ وہاں ایک ڈگری کالج قائم کر دیا جائے تا کہ وہ ہائر سیکنڈری پاس نوجوان جو صرف اس وجہ سے آئندہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے اور اب نوکری کی تلاش کر رہے ہیں کہ اُن کے والدین اننت ناگ اور سری نگر میں ان کے تعلیمی مصارف برداشت نہیں کر سکتے مزید

تعلیم حاصل کرسکیں اور علاقہ شوپیان اتنا بڑا علاقہ ہے لیکن وہاں ابھی تک صرف ایک ہائرسیکنڈری سکول ہے اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد بچے کچھ نہیں کر پاتے ۔لوگوں کی اقتصادی حالت اتنی زبوں ہے کہ ان کے لیے اپنے بچوں کو اننت ناگ یا سری نگر بھیجنا ممکن نہیں بعض دوست کہیں گے کہ اس کے بعد بھی بے کاری کا مسئلہ حل نہیں ہوگا ۔لیکن میرے نزدیک تعلیم یافتہ بے کاری گوارا ہوسکتی ہے جاہل اوران پڑھ بے کاروں کا کوئی مصرف نہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ تعلیم یافتہ بے کاراس ملک میں انقلاب کا ہراول دستہ بن سکتے ہیں ۔دوسری اہم بات کی طرف جناب والا کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ لڑکیوں کے لیے دیہاتوں میں بہت کم سکول ہیں اور سکولوں کے لیے موزوں عمارات بھی مفقود ہیں ۔آپ ہر جگہ سکولوں کو ناگفتہ بہ حالت میں پائیں گے

گزشتہ سال سرینگر میں ایک حادثہ ہوا۔ مائسمہ کے گرلز سکول کی دیوار گری جہاں کئی استانیاں اور بچے زخمی ہوگئے ۔اس حادثہ کو بہت عرصہ گزر گیا لیکن افسوس ابھی تک بھی سکول بلڈنگ کو نہیں بدلا گیا ۔ یہاں مہمانوں کے لیے عالیشان مہمان خانے تعمیر کیے گئے ہیں، ڈاک بنگلے بنائے گئے ہیں اور ایسی جگھوں پر بنائے گئے ہیں جہاں چوکیدار کے سوا کوئی نہیں جاتا ۔مگر ان بچوں کے مستقبل کو نظر انداز کیا جارہا ہے جو کل دیش کے علمبردار ہوں گے ۔ ہر شعبے میں ترقی کی رفتار one sided ہے جب ہم عمارات بناتے ہیں تو پھر صرف اسی میں لگ جاتے ہیں ۔ جب سڑکیں بنانے پر آتے ہیں تو پھر صرف سڑکیں بنانا شروع ہوتی ہیں ۔ہم صحت عامہ کی طرف بھی توجہ نہیں دے پاتے، ہمارے دورافتادہ دیہات میں اکثر لوگ بے قضا مرجاتے ہیں وہاں کسی ڈاکٹر

کا کوئی انتظام نہیں۔

جہاں تک Drinking Water کا تعلق ہے اس سلسلے میں عوام کو بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ یا وہ جگہ جہاں الیکشن کے دوران ڈی پی صاحب کے مبارک قدم پڑے ہیں۔ انہوں نے جموں میں کنڈی علاقہ میں پانی کی دقت کا ذکر کیا ہے مگر بد قسمت ہیں وہ لوگ یا وہ علاقہ جہاں انہیں الیکشن کے دوران دورہ کرنے کا اتفاق نہ ہوا اور ڈی پی صاحب چونکہ الیکشن لڑ کے بغیر ہی منتخب ہوئے اس لیے انہیں شوپیان کا دورہ کرنے کا موقعہ نہ ملا جہاں وہ عوام کے Drinking Water کے سلسلہ میں تکالیف اور مصائب کو محسوس کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں پر معلوم وجوہات کی بناء پر ان کی تعمیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی۔ کریوہ مالو کی نہر تعمیر کرنے کے لیے سروے بھی کی گئی تھی اور اس پر ابتدائی کام بھی شروع ہوا تھا مگر ان ہی دنوں مداخلت کار تشریف لائے اور وہ کام رُک گیا۔

جناب ڈپٹی سپیکر: آپ کا وقت ختم ہو رہا ہے لہٰذا conclude کرنے کی کوشش کریں۔

شمیم احمد شمیم: جناب والا ابھی ڈی پی صاحب کے ۵ منٹ ختم نہیں ہوئے ہیں۔

محترم کول صاحب نے ابھی ٹورزم کا ذکر کیا ہے۔ پچھلے پندرہ سولہ سال سے محکمۂ ٹوریزم صرف اس بات کا کریڈٹ لے رہا ہے کہ کشمیر آنے والے سیاحوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے میں نہیں جانتا کہ کشمیر آنے والے سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا کریڈٹ اس محکمے کو کیوں دیا جائے۔ کشمیر دنیا بھر میں خوبصورت جگہ ہے اس کی خوبصورتی کا شہرہ اس سے پہلے تھا جب محکمہ ٹوریزم

وجود میں آیا تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے اگر لوگ ایسی خوبصورت جگہ کو دیکھنے آتے ہیں تو اس میں محکمہ سیاحت کا کیا کمال ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں آنے والے کیا ہمارے انتظامات سے مطمئن ہیں یا نہیں۔ سیاحوں کے لیے کشمیر میں داخل ہونے سے پہلے جموں پہلے پڑاو کی حیثیت رکھتا ہے اور جموں کا ڈاک بنگلہ جو محکمہ سیاحت کی نگرانی میں چل رہا ہے بدانتظامی اور بدنظمی کا ایک شاہکار ہے۔

ایک اور بات جس کی طرف ایوان کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ کل ڈی پی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حکومت نے ایک بھی سرکاری پیسہ الیکشن پر خرچ کیا ہے تو وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ڈی۔ پی صاحب مستعفی ہوں اور وہ پھر مستعفی کہاں سے ہونگے وہ تو ابھی تک منتخب بھی نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن ایک بات ساری دنیا کو معلوم ہے اور وہ یہ کہ کانگریس نے انتخاب پر بے پناہ روپیہ صرف کیا ہے۔ دنیا یہ جاننا چاہے گی کہ یہ روپیہ کہاں سے آیا۔ اخبارات اور پارلیمنٹ میں سی آئی اے کی سرگرمیوں کا ذکر آیا ہے اشاروں اور کنایوں میں کچھ لوگوں کے نام لیے جا رہے ہیں، طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ امریکی سفارت خانے کے سیکرٹری مسٹر شیغرس سری نگر بھی گئے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ جموں میں وہ سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرے تھے۔ اس سے بعض شبہات کو تقویت ملی ہے۔ پھر چونکہ نیشنل کانفرنس کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف سے انتخابات پر بہت سارو پیہ صرف ہوا اور کانگریس پر بھی یہی الزام ہے۔ میں مطالبہ کروں گا کہ اس معاملے کی تحقیقات کی جائے کیونکہ میرے نزدیک "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" پردہ اٹھا دیا جائے تاکہ صورت حال سب پر عیاں ہو۔

اعداد و شمار کی ہیرا پھیری

جناب ڈپٹی سپیکر صاحب ! میں غازی صاحب کا مشکور ہوں ، کہ انہوں نے بجٹ کو اعداد و شمار کی روشنی میں پرکھ کر میرا کام ہلکا کر دیا ہے۔ بجٹ کے لغوی معنی ہیں ، آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ، لیکن وزیر خزانہ شری گردھاری لعل ڈوگرہ نے اس ایوان کے سامنے جو بجٹ پیش کیا ہے ، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجٹ ہیرا پھیری کا دوسرا نام ہے اور اسی لیے میں نے اپنے اخبار میں ڈوگرہ صاحب کو وزیر برائے ہیرا پھیری قرار دیا تھا۔ اس ہیرا پھیری کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہوگا کہ انہوں نے جوڑ توڑ کر کے اس ریاست کے بجٹ میں صرف ۵۷ / لاکھ کا خسارہ دکھایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کل خسارہ تیس کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے۔ انہوں نے مرکز سے ملنے والے قرضہ جات کو بھی آمدنی دکھا کر ریاست کی ترقی کے بلند بانگ دعویٰ کیے ہیں۔ میں مختصر طور اس فریب کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہماری اپنی آمدن ۳۲.۵۶ کروڑ ہے۔ مرکز سے گرانٹ ان ایڈ اور اکسائز ڈیوٹی میں حصے کے طور پر ۳۴.۶۷ کروڑ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا سارا پلان بجٹ ۳۱ کروڑ مرکز کی دین ہے۔ یعنی ہماری سالانہ "

آمدن'' کا ۷۰ فیصد حصہ مرکزی سرکار کی عنایت ہے اور اس میں صرف ۳۰ فیصد حصہ ہمارا اپنا ہے۔ اس آمدن میں سے ہم ۴۳.۸ کروڑ روپے ایڈمنسٹریٹو سروس پر خرچ کرتے ہیں جب کہ عام طور پر دوسری ریاستوں میں ایڈمنسٹریٹو پر پانچ فیصد سے زیادہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ غالباً اس لیے کہ ہمیں دفعہ ۳۷۰ کے تحت خصوصی پوزیشن حاصل ہے اور ہم نے اپنے انتظامیہ کو اتنا شاہ خرچ اور بھاری بھرکم بنا دیا ہے کہ ۱۵ فیصد کی یہ رقم بھی سرکار کی نظروں میں بہت کم ہے۔ باقی کے ۸۵ فیصد میں سے بھی ہم تقریباً نصف رقم Establish ment پر خرچ کرتے ہیں جس میں وہ تمام عیاشیاں اور فضول خرچیاں شامل ہیں، کہ جو حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح چالیس فیصد سے بھی کم رقم ہم ترقیاتی کاموں اور تعمیری شعبوں پر خرچ کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایڈمنسٹریشن پر خرچ کیے جانے والے ہر دو روپے کے مقابلے میں ہم ترقیاتی کاموں پر صرف ایک روپیہ صرف کرتے ہیں۔

جہاں تک جنگلات کا تعلق ہے اسے ہمارے حکمران اکثر سبز سونا کہہ کر اس کی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جنگلات سے ہماری کل آمدن ۵.۵ کروڑ روپے کے قریب ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے ہمیں صرف ایک کروڑ سالانہ کی آمدن ہے اور اس کے مقابلے میں جنگلات کے بقایا جات کی رقم چار کروڑ سے آٹھ اور اب تیرہ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں حکومت کی طرف سے ان بقایا جات کو وصول کرنے کے لیے وعدے دیے گئے ہیں۔ لیکن میں وزیر خزانہ کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ بقایا جات آئندہ دس برس میں تو

کیا، شاید کبھی وصول نہ ہو سکیں۔

اب پولیس کا محکمہ لیجیے۔ ۶۹۔ ۱۹۶۸ میں اس محکمے پر ۶۷. ۳ کروڑ کا خرچہ دکھایا گیا ہے اور اس سال اس پر پانچ کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے۔ بخشی صاحب کے نادر شاہی دور میں سی، آئی، ڈی کے محکمے پر ۳۰/لاکھ روپے خرچ کیے جاتے تھے لیکن صادق صاحب کے جمہوری دور میں اب اس پر ۴۸ لاکھ روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ "متفرقہ اور غیر متوقع اخراجات" کے عنوان سے آٹھ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے اور غازی صاحب نے پوچھا ہے کہ اتنی بھاری رقم کہاں جاتی ہے۔ اس ریاست میں کانگریس نام کی ایک "بہت بڑی" تنظیم کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سربراہوں نے کبھی عوام کی پروانہیں کی ہے اور انہوں نے اس کو عوام کے بل بوتے پر چلانے کے بجائے سرکاری مشینری اور رقومات کی مدد سے چلانے کی روایت قائم ہے۔ کچھ عرصہ قبل کانگریس ہی کے ایک ذمہ دار ممبر نے یہ انکشاف کیا تھا کہ سید میر قاسم کے دورِ صدارت میں کانگریس پر ماہانہ ایک لاکھ روپیہ کہاں سے آتا تھا۔ اب جب کہ ریاستی کانگریس پہلے سے بھی زیادہ کچھ "تیز" اور "سرگرم" ہوگئی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کو چلانے کے لیے کچھ زیادہ ہی رقم کی ضرورت ہوگی، متفرقہ اور غیر متوقع اخراجات یقیناً اسی تنظیم کو چلانے کے لیے صرف ہوتے ہوں گے اور اس لیے اس عنوان کے تحت آٹھ کروڑ روپے کی رقم مخصوص ہے!

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ سی، آئی، ڈی کے محکمے پر ۴۸/لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرنے والی سرکار نے صنعتی ترقی کے لیے صرف ۴۳ لاکھ کی رقم

مخصوص کی ہے۔ حالانکہ بخشی صاحب کے دور میں صنعتی ترقی کے ۱۲۹ لاکھ روپے کی رقم مخصوص تھی۔ اب خوراک کی طرف آیئے۔ چند سال قبل ایک بازیگر نے ''کریش پروگرام'' کا شوشہ چھوڑا تھا۔ کسانوں کو زبردستی بھاری مقدار میں کھاد لینے کے لیے مجبور کیا گیا اور دیہات میں پولیس کی مدد سے کسانوں میں کھاد تقسیم کی گئی اور جس کسی نے کھاد لینے سے انکار کر دیا تو اسے لاٹھیوں کے ذریعے کھاد قبول کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ جس زمین کو صرف ایک من کھاد کی ضرورت تھی اس میں آٹھ من کھاد ڈالی گئی۔ موسم خوشگوار رہا، آب و ہوا سازگار تھی، اس لیے سال میں فصل بھی اچھی پیدا ہوئی اور اس بازیگر نے دعویٰ کیا کہ ریاست کا خوراک کا مسئلہ ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی سال آپ نے دیکھا کہ کھاد کے استعمال میں بھی آپ کو کمی کرنا پڑی اور خوراک کی پیداوار بھی گھٹتی گئی اور اب ہر سال خوراک کی درآمد بھی بڑھتی جارہی ہے اور آپ کا کریش پروگرام بھی ایک ڈھکوسلہ ثابت ہو گیا۔ ہاں ابھی حال ہی میں ڈی۔ آئی۔ جی کشمیر نے یہ انکشاف کیا ہے، کہ وادی کشمیر میں تقریباً پانچ سو سے زائد ایکٹر زرعی زمین میں بھنگ کی کاشت ہوتی ہے۔ غالباً یہ سب کچھ کریش پروگرام کے تحت ہوتا ہوگا تاکہ اس قوم کو چرس پلا پلا کر گہری نیند سلا دیا جائے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ہماری ریاست ایک پسماندہ ریاست ہے اور یہاں کی اکثر آبادی غریب اور مفلس ہے، کہ جو مزید ٹیکسوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے، کہ حکومت جو ٹیکس بالواسطہ یا براہ راست عوام سے وصول کرتی ہے اس کا اکثر حصہ سرکاری خزانے کے بجائے کچھ افسروں اور اہلکاروں کی جیبوں میں چلا

جاتا ہے۔ بجلی کا محکمہ ہو، یا تفریحی ٹیکس، ہر محکمے سے ہر ماہ ہزاروں نہیں لاکھوں روپے کی ہیرا پھیری ہوتی ہے۔ اگر ہم موجودہ ٹیکسوں کی وصولی میں ہونے والی Leakage ہی کو روک سکیں، تو ہماری آمدن میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ سری نگر کی ٹریڈرس ایسوسی ایشن نے حکومت کو یہ پیشکش بھی کی ہے کہ اگر انہیں ٹیکس وصول کرنے کا اختیار دیا جائے تو مختلف ٹیکسوں سے وصول ہونے والی آمدن میں ایک نہیں، دو نہیں، چار گنا اضافہ ہوسکتا ہے۔ حکومت کو اس پیشکش پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ میں نے پرسوں اپنی تقریر میں جب یہ بات کہی تھی کہ سال ۶۶۔۱۹۶۵ء کے دوران شہر میں صرف دو سو کانگڑیوں کی درآمد دکھائی گئی ہے، حالانکہ کانگڑی ایک ایسی چیز ہے کہ جو ہر سال شہر میں ہزاروں کیا، لاکھوں کی تعداد میں در آمد کی جاتی ہیں۔ اس وقت وزیر خزانہ نے کہا تھا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ ٹائپ کی غلطی ہوگی۔ دراصل یہ تعداد بائیس ہزار ہوگی۔ آج میں وہ مصدقہ گوشوارہ ساتھ لایا ہوں۔ اور اس میں دو سو کانگڑیوں کے سامنے محصول کے طور پر وصول شدہ رقم صرف ایک روپیہ اور بیس پیسے درج ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں بھی ٹائپ کی غلطی نہیں ہوسکتی۔ اچھا کانگڑیوں کی بات رہنے دیجئے ہمارے وزیروں کو ان کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ اکثر ہیٹر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن وہ گوشت یقیناً کھاتے ہوں گے اور میں ان کی خدمت میں اس گوشت کا تخمینہ پیش کرتا ہوں۔ سال ۶۶۔۱۹۶۵ء کے دوران کسٹم کی کتابوں میں سرینگر میں درآمد ہونے والی بھیڑ بکریوں کی کل تعداد ۶۵۴۵۶ ہزار دکھائی گئی ہے اور اس سے صرف بتیس ہزار سات سو اکاون روپے کی آمدن ہوئی ہے۔ سال ۶۷۔۱۹۶۶ء میں بھیڑ بکریوں کی کل

تعداد اٹھاسی ہزار پانچ سو سولہ ہے اور اس سے چوالیس ہزار دو سو اٹھاونے روپے کسٹم ڈیپارٹمنٹ کو وصول ہوئے ہیں۔ اب اس بات کو ذہن میں رکھیئے کہ سرینگر میں گوشت بیچنے کی ۵۳۰ دکانیں ایسی ہیں جن کے پاس گوشت بیچنے کا باقاعدہ لائنس ہے۔ ہر دکان پر اگر کم سے کم ایک روز میں صرف ایک بھیڑ یا بکری ذبح کی جائے تو ہر سال شہر میں ایک لاکھ ۹۰ ہزار بھیڑ بکریاں درآمد ہونا چاہئیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ تعداد ابھی ایک لاکھ تک بھی نہیں پہنچ پائی۔ ظاہر ہے کہ بڑے وسیع پیمانے پر گول مال ہو رہا ہے۔ سال ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک کسٹم کی کتابوں کے مطابق صرف ۲۵۱۳۵۱ اور ۸۶۱۲۲ اینٹیں اور ٹائیلز درآمد ہوئی ہیں۔ حالانکہ شہر میں پچھلے چار سالوں میں عمارات کی تعمیر میں ۲۵ لاکھ سے کم اینٹیں اور ٹائیلز درآمد نہ ہوئی ہوں گی۔ میں نے صرف ایک محکمے کے ایک شعبے کا جائزہ پیش کیا ہے اور حکومت کی کارکردگی کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹ گیا ہے۔ یہ تو رہی اعداد و شمار کی بات اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اس فن میں ماہر نہیں ہوں۔ اب اس سیاسی صورت حال کی طرف آیئے کہ جس کو انتظامیہ کے اس ڈھیلے پن نے بُری طرح متاثر کیا ہے۔

صادق صاحب سے جب اس بات کی شکایت کی جاتی ہے کہ انتظامیہ میں رشوت ستانی اور بدعنوانیاں بڑھتی جا رہی ہیں، یا یہ کہ حکومت نے عوام سے کیے گئے وعدے پورے نہیں کیے ہیں، تو وہ اپنی لبرلائزیشن پالیسی کی مدافعت کر کے اصل مسئلے سے ہماری توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا شمار تو ان لوگوں میں ہے کہ جنہوں نے نہ صرف ان کی نرم روی کی پالیسی کو سراہا ہے، بلکہ ہم اس پالیسی کے ہر مخالف کا گلا کاٹنے کے لیے تلوار

ہاتھ میں لیے نظر آتے ہیں۔ لیکن میں صادق صاحب سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے ہر سوال کا جواب صرف لبرلائزیشن کا نعرہ بڑھتی ہوئی کورپشن، انتظامیہ کی خود مختاری اور اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ بازی کا جواز نہیں ہوسکتا۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں کہ آپ نے کس طرح جن سنگھ کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہیں اور اس قابل اعتراض جماعت کے ساتھ آپ نے کس طرح ناجائز تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے!

آپ نے جن سنگھ کو خوش کرنے کے لیے مہاتما گاندھی صد سالہ سالگرہ کمیٹی کا چیرمین جن سنگھ کے لیڈر پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ کو بنایا اور آپ جانتے ہیں کہ جن سنگھ کا گاندھی جی کے تئیں کیا رویہ تھا اور گاندھی جی سے ان کے ''تعلقات'' کیسے تھے۔ میں کھُل کر بات نہیں کرونگا۔ لیکن آپ کو صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ گاندھی جی کے قتل کے بعد راشٹریہ سیوک سنگھ کو قابلِ اعتراض جماعت قرار دیا گیا تھا اور جن سنگھ اسی جماعت کی اولاد ہے۔ آپ کی لیڈر شریمتی اندرا گاندھی نے بچارے نجلنگاپا کا صرف اس لیے ناک میں دم کردیا، کہ انہوں نے صدراتی انتخاب کے سلسلے میں جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے لیڈروں سے بات چیت کی تھی اور ادھر صادق صاحب، پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ سے معاشقہ لڑا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ڈوگرہ صاحب بے حد شریف اور نیک آدمی ہیں۔ وہ نہایت ہی بے ضرر اور معقول آدمی ہیں۔ لیکن ہمیں ان کی ذات کو جن سنگھ جان کر دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ ان کی ذات سے جو جماعت اور فلسفہ وابستہ ہے وہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے اور ہمیں اس خطرے کا صحیح احساس ہونا چاہیئے۔ جن سنگھ نے بھی اپنی جماعت کے خوفناک ارادوں پر پردہ ڈالنے کے لیے

پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ کو ہی آگے کر دیا ہے تاکہ ان کی شرافت کے پردے میں اس جماعت کا زہر چھپ جائے!

میں جب افسر شاہی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی بات کرتا ہوں تو صادق صاحب افسروں کو Defend کرنا شروع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایڈمنسٹریشن کو Institutionalize کرنا ضروری ہے۔ کون کافر ہے جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایڈمنسٹریشن کو Institutionaliz کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ افسر من مانی کاروائیاں کریں اور آپ بے بسی کے ساتھ دیکھتے جائیں۔ ہم جب بیورو کریسی کی بات کرتے ہیں تو ہم چیف سکریٹری اور دوسرے افسروں کے خلاف بات نہیں کرتے ہم صادق صاحب پر تنقید کرتے ہیں اور صادق صاحب بڑی چالاکی کے ساتھ اپنی جانب سے توجہ ہٹا کر چیف سیکرٹری اور دوسرے افسروں کی وکالت شروع کر دیتے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہمارا ایڈمنسٹریشن اتنا خود مختار اور خود سر ہو گیا ہے کہ وہ چیف منسٹر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ان کے احکامات کی پروا نہیں کرتا اور وہی کرتا ہے جو اس کی مرضی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیف منسٹر کی کمزوری ہے، ایڈمنسٹریشن کی نہیں، میرے پاس درجنوں ایسی مثالیں ہیں جن کی رُو سے میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ افسروں نے چیف منسٹر کے احکامات کی پروا نہیں کی۔ صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

تین سال قبل چیف منسٹر نے حلقۂ شوپیان کے متعلق سترہ احکامات پاس کیے تھے۔ تین سال گزر گئے ہیں۔ ابھی تک ان میں سے ایک حکم کی بھی تعمیل نہیں ہوئی ہے۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ وہاں تحصیل ایجوکیشن آفس

کھولا جائے۔ لیکن تین سال سے کوئی افسر وزیر اعلیٰ کے اس حکم کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر میں یہ کہوں کہ صادق صاحب کی گرفت انتظامیہ پر نہیں رہی تو اس میں لبرلائزیشن کا پہلو کہاں سے نکلا؟ یہ تو محض عذرِ لنگ ہوا۔ اگر صادق صاحب خلاف قاعدہ کوئی بات نہیں کرتے تو یہ بڑی قابل تعریف بات ہے لیکن وہ بقائمی ہوش وحواس کوئی فیصلہ کریں تو پھر اس فیصلے کا احترام ہونا چاہئے۔ میری تنقید کا یہی مطلب ہے اور بس!

جناب والا! ایک اور بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا اور وہ یہ کہ کچھ عرصے سے صادق صاحب میں غصہ کرنے کی عادت پیدا ہوگئی ہے میں صادق صاحب کے ساتھیوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ صادق صاحب سے کہہ دیں کہ وہ سب کچھ کریں، غصہ نہ کریں غصے کا جواب غصہ ہوسکتا ہے اور غصے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا الجھ جائے گا۔ ہماری بات صرف سنا کیجئے اس پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان باتوں سے کوئی کام کی بات نکل آئے۔

◆◆◆

1970ء

پنجسالہ پلان

ایک بے رحمانہ مذاق

جناب والا! میں چوتھے پنجسالہ پلان کے اس زیر بحث مسودے کو ایک بہت بڑا فریب اور اس ساری بحث کو جو ہم پرسوں سے اس پر کر رہے ہیں ایک بے رحمانہ مذاق سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اس مسودے کے تیار کرنے میں ہمارے بہترین افسروں کی ساری صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں۔ لیکن مجھے معاف کیجئے کہ یہ ساری محنت اور یہ ساری صلاحیتیں ایک خوبصورت مگر پُر فریب دستاویز تیار کرنے پر صرف ہوئی ہیں اور ریاستی حکومت نے انتہائی بددیانتی کا ثبوت دیکر اس ایوان کو اور ریاستی عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ چوتھے پلان کے اس مسودے میں ۵۔۲۲ کروڑ کا out lay دکھایا گیا ہے اور اس طرح ایک غیر حقیقت پسندانہ، نا قابلِ عمل اور نا قابلِ رفتار خاکہ تیار کیا گیا ہے جو ایک خیالی جنت کی نشان دہی تو کرتا ہے لیکن جس کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ مسودے کے اس میمورنڈم میں ہی منصوبہ سازوں نے اس فریب کا پردہ چاک کیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ۲۲۵ کروڑ کے اس پلان کی جوں کی توں منظوری ناممکن

ہے، کیونکہ مرکزی حکومت اپنی مجبوریوں کے پیش نظر زیادہ رقم نہیں دے سکتی۔ ادھر ہماری ریاست اپنے ذرائع میں سے مشکل سے پانچ چھ کروڑ کی رقم دے سکتی ہے۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ مرکز سے نوے کروڑ روپے کی امداد حاصل ہوگی اور ریاست اپنے ذرائع میں سے پانچ چھ کروڑ روپے دے سکے گی۔ پچانوے کروڑ کے اصلی پلان کی جگہ ریاستی حکومت نے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہندوستانی عوام کو گمراہ کرنے کے لیے ۲۲۵ کروڑ روپے کا ایک مصنوعی خاکہ پیش کیا، جس کے متعلق وہ خود بھی جانتی ہے کہ اس سے آدھی رقم کے پلان کی منظوری بھی مشکل سے ہی حاصل ہوگی۔ مناسب تو یہ تھا کہ تمام تر مجبوریوں کو مدنظر رکھ کر ایک حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل پلان تیار کیا جاتا۔ مگر ریاستی حکومت کا مقصد چونکہ یہ ہے کہ وہ اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالے اور اپنی ناکامیوں کے لیے مرکزی سرکار کو ذمہ دار ٹھہرادے، اس لیے انہوں نے ایک ایسا بلیو پرنٹ تیار کر دیا جو مرکزی حکومت کو قبول نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ مرکزی حکومت ریاست کے چوتھے پلان کے لیے اتنی بھاری رقم کی منظوری کیونکر دے۔ پلاننگ کمیشن تو پچھلے تین سال کے دوران ہماری کار کردگی، کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لے کر ہی چوتھے پلان کے لیے مطلوبہ رقم مہیا کرے گا اور پچھلے پندرہ سال کے دوران ہماری کارکردگی پر اس سے بڑھ کر کیا تنقید ہوسکتی ہے کہ ایک ارب سے زائد روپے خرچ کرنے کے بعد بھی اب تک ریاست اپنے وسیلوں سے پانچ چھ کروڑ روپے کی رقم ادا کرنے کی بھی اہل نہیں ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ گزشتہ تین پلانوں کے دوران صرف کی گئی رقم کہاں گئی اور اس سے ریاست کی آمدنی میں کس درجہ

اضافہ ہوا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے لیے عالیشان بنگلے تعمیر کیے ہیں۔ بعض لوگوں نے بڑی بڑی زمینیں اور جائیدادیں خریدی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ارب سے زائد روپے کے صرفے کے بعد ریاست کی آمدنی میں کیا اضافہ ہوا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی اس ریاست میں پانی کی طرح بہانے کے باوجود معاشی استحکام پیدا نہیں ہوسکا جو ہمارے ان تین پلانوں کا مقصد تھا۔

اگر اس ملک میں صحیح جمہوریت ہوتی تو اُن تمام مجرموں کو شاہراہ عام پر پھانسی دی جاتی جو اتنی بھاری رقم کو ضائع کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ مگر کشمیر میں ایک غیر یقینی صورت حال کا فائدہ اٹھا کر اس ریاست کے بعض خوش بخت ہندوستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف ہیں اور چوتھے پلان کا مسودہ اسی عمل کا تسلسل ہے۔

سوال یہ ہے کہ پچھلے تین پلانوں کے دوران ہماری کارکردگی کیا ہے؟ ریاست کی کون سی انڈسٹری ایسی ہے، جس کے بارے میں اطمینان کا اظہار کیا جاسکتا ہے؟ خود اس میمورنڈم میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ پچھلے تین پلانوں کے دوران انڈسٹریل سیکٹر، پاور سیکٹر، اور ایگریکلچر سیکٹر میں کوئی ترقی نہیں ہوسکی ہے۔ اب یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ چوتھے پلان میں ان تمام کوتاہیوں کو دور کیا جائے گا۔ لیکن نوے کروڑ روپے کی رقم جو آپ کو مرکز سے ملنے کی توقع ہے وہ تو صرف پچھلے تین پلانوں کی ان زیر تعمیر منصوبوں کے لیے ہی کافی ہوسکے گی جو ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے ہیں۔ پھر اس بھاری بھر کم مسودے پر بحث کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا آپ اس ایوان کو ایک فرضی مسودے پر بحث کروا کر ہمارے ساتھ ایک بے رحمانہ مذاق نہیں کررہے ہیں؟

ہماری قسمت دیکھئے کہ جس صنعت کو بھی آپ کے منحوس ہاتھ چھو گئے وہ اس درجہ تباہ و برباد ہوگئی کہ آج اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ ریشم کی صنعت ہو یا میوے کی، جنگلات کی صنعت ہو یا ٹرانسپورٹ کی، کروڑوں روپیہ صرف کرنے کے بعد ان میں نقصان ہی نقصان ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ارب روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی ہم چوتھے پلان میں اپنے ذرائع سے ایک حقیر سی رقم بھی ادا نہیں کر سکتے۔ میں مانتا ہوں کہ الحاق کی قیمت وصول کرنے کے بہانے مرکزی حکومت ہمیں فراخدلانہ امداد دے گی۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے اور ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ریاست کو مرکز کی اس امداد کے اہل بنانے کے لیے آپ نے پچھلے تین پلانوں کے دوران کیا کیا ہے۔ کالا کوٹ پروجیکٹ پر پانچ کروڑ روپیہ سے زائد رقم صرف کرنے کے بعد ہمارے لیے آمدنی کا ذریعہ ہونا چاہئے تھی۔ وہ ہمارے لیے اخراجات اور بدنامی کا ذریعہ ہے۔ ہر سال کے آخر میں ریاستی حکومت یہ اعلان جاری کرتی ہے کہ اس سال ایک لاکھ یا ایک لاکھ تیس ہزار سیاح یہاں آئے ہیں۔ پوچھتا ہوں کہ سیاحوں کی اس بھاری تعداد کے یہاں آنے میں صادق صاحب یا ان کے وزیر سیاحت کا کیا کمال ہے؟

دنیا بھر میں سیاحت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور کشمیر کی خوبصورتی تو صادق صاحب کے وزیر اعلیٰ بننے سے بہت پہلے سے مشہور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہر سال لاکھ ڈیڑھ لاکھ سیاحوں کا استقبال کرنے اور ان کے قیام کو آرام دہ بنانے کے لیے ہم نے ابھی تک کیا کیا ہے؟

پٹھانکوٹ سے ہی سیاحوں کو دغا دینے، لوٹنے اور ان سے بے ایمانیاں کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سرینگر پہنچتے ہی تانگے والا، ٹیکسی والا

اور دکاندار اس کے ذہن پر یہ تاثر قائم کر دیتے ہیں کہ وہ ایک ایسے اجنبی دیس میں پہنچ گیا ہے، جہاں صرف جیب کترے رہتے ہیں۔ کیا ہم نے سیاحوں کے قیام کو خوشگوار بنانے کے لیے حکومت کی ساری مشینری کو کسی حد تک متحرک کر دیا ہے کہ سیاح یہاں اپنے آپ کو ہر لحاظ سے محفوظ تصوّر کرے؟ اس کا جواب ''یقیناً'' نہیں ہے اور نتیجہ یہ کہ ایک لاکھ بیس ہزار سیاح یہاں سے ہمارے نام گالیاں دیتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں۔

دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اگریکلچر سیکٹر میں ہم نے نمایاں ترقی کی ہے لیکن اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہم نے کچھ حادثات کا سہارا لے کر اس خوش فہمی کی بنیاد ڈالی ہے۔ پہلے پلان کے دوران ریاست کی آمدن کا ۶۰ فیصد حصہ ایگری کلچر سیکٹر سے ہوا۔ دوسرے پلان کے دوران اس سیکٹر سے ۴۰ فیصد کی آمدن ہوئی۔ لیکن تیسرے پلان کے دوران یہ آمدن بالکل گھٹ گئی اور ۱۹۶۵-۶۶ء میں یہ آمدنی ۱۹۶۰-۶۱ء کے مقابلے میں بھی کم تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غذائی پیداوار میں اتار چڑھاؤ آپ کی کارکردگی سے زیادہ موسمی حالات یا اتفاقات کی پیداوار ہے۔ ہم زرعی پیداوار میں اضافے کو آج بڑھا چڑھا کر پیش کر کے اپنی کامیابی کا ڈھول پیٹ رہے ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس میں موسم کی خوشگواری کا کتنا عمل دخل ہے۔ اس ریاست میں صنعتوں کو فروغ دینے کا کیا امکان ہے؟ میں اس بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے ذرائع نقل و حمل کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اس سے آپ بخوبی واقف ہیں، لیکن جو ریاست سال کے چار مہینے دنیا سے بالکل الگ ہو کر رہ جائے۔ وہاں کسی صنعت کے قیام اور فروغ کا مسئلہ بہت

مشکل بن جاتا ہے۔ ہمارے منصوبہ سازوں پر لازم تھا کہ وہ سب سے زیادہ توجہ ریاست اور بیرون ریاست کے درمیان ریل کا سلسلہ قائم کرنے پر دیتے کیونکہ جب تک یہ سلسلہ قائم نہیں ہوتا۔ یہاں بننے والی چیزوں کے مقابلے میں باہر کی چیزیں زیادہ ہوں گی اور اسطرح مقابلے کی دنیا میں ہمیں شکست کھانا پڑے گی۔ افسوس ہے کہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ جب تک سخت سردی اور برفباری والے پانچ مہینوں میں بھی یہاں کام کرنے کے مواقع اور سہولیات پیدا نہ ہوں تب تک کشمیر کی معیشت میں کسی قسم کا انقلاب آنے کی صورت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ چوتھے پلان کے مسودے میں یہ ماحول پیدا کرنے کے لئے بجلی کی پیداوار میں غیر معمولی اضافے کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے، لیکن اس کی بنیاد سلال پروجیکٹ جیسے عظیم منصوبے پر رکھی گئی ہے۔ جس پر ساٹھ کروڑ روپے کی رقم لگنے کا اندازہ ہے اور ریاستی حکومت جانتی ہے کہ چوتھے پلان کے دوران اس منصوبے کے لئے رقم مہیا نہیں ہوسکتی۔ ہمارے سامنے چوتھے پلان کی شکل میں جو مسودہ ہے وہ تو دل خوش کرنے اور آنکھوں کی پیاس بجھانے کے لئے ہے۔ اس کا بھلا حقیقت سے کیا تعلق ہے؟

جنگلات ہماری آمدنی کا ایک بہت قدیم اور موثر ذریعہ ہیں، لیکن جب سے ان پر اس منحوس حکومت کا سایہ پڑا ہے، یہ سونے کی کان مٹی کا تودہ ہوکر رہ گئی ہے۔ صادق صاحب اور ان کی حکومت ابھی تک یہی طے نہیں کر پائی ہے کہ جنگلات کے ٹھیکے داروں کے پاس کل کتنی رقم بقایا ہے۔ وزیر جنگلات سفیر روس شری درگا پرشاد در کہتے ہیں کہ ۱۲ کروڑ روپے کی رقم ہے۔ خواجہ غلام محمد صادق کا خیال ہے کہ کل پانچ چھ کروڑ روپے کی رقم

بقایا ہے۔ غلام رسول کار کا دعویٰ ہے کہ کل ملا کر آٹھ نو کروڑ روپے کی رقم ٹھیکے داروں کے نام باقی ہے۔ جنگلات کے ٹھیکے داروں کا بیان ہے کہ ڈیڑھ کروڑ روپے سے زائد روپیہ حکومت کے پاس ہے یعنی ابھی تک حکومت یہ طے نہیں کر پائی ہے کہ ٹھیکے داروں کے پاس کل کتنی رقم بقایا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ریشم کی صنعت بھی آج آمدنی کا ذریعہ بنانے کی بجائے گھاٹے کا سودا ثابت ہو رہی ہے۔ چوتھے پلان پر میں اس صنعت پر مزید کئی کروڑ روپیہ صرف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے، لیکن کیا یہ مناسب نہیں ہوتا کہ مزید پھیلاؤ کی بجائے اس بات کا جائزہ لیا جاتا، کہ سونے کی یہ کان، مٹی کا تودہ کیوں کر بن گئی؟ محکمہ جنگلات قومی دولت کو کس بے انصافی اور بے دردی کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس سرکلر سے ہوگا، جو ڈاج گاڑیوں کے سلسلے میں محکمے کے ایک افسر نے جاری کیا ہے۔ اس سرکلر میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ۲۵ گاڑیاں ایک عرصے سے بے کار پڑی ہیں اور ان کی مرمت پر بہت زیادہ رقم صرف ہوگی۔ اس لئے ان کی مرمت کرنے کے بجائے ان سے وابستہ ڈرائیوروں کو برطرف کیا جائے اور یہ وہی گاڑیاں ہیں جو ماہرین کی تنبیہ کے باوجود صرف اس لئے خریدی گئی تھیں کہ حکمران جماعت کے ایک سرکردہ لیڈر کو فائدہ پہنچانا مقصود تھا۔

تعلیم کے سلسلے میں ہماری پالیسی بالکل بے مقصد اور غیر حقیقت پسندانہ رہی۔ ہم دھڑا دھڑ سکول کھولے جا رہے ہیں، لیکن اس بات کو نہیں دیکھتے کہ ان سکولوں کے لئے تربیت یافتہ استاد مہیا ہیں یا نہیں! ہم یہ بھی نہیں دیکھتے کہ سکولوں کی عمارات اس قابل ہیں کہ ان میں بچوں کو مناسب تعلیم دی جا سکے۔ نتیجہ یہ کہ ہماری تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ ہم نے معیار کو

مقدار پر قربان کر دیا ہے۔ ہم سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر جا بجا سکول کھولے جا رہے ہیں، لیکن سکولوں کے لئے جو لوازمات میسر ہونے چاہئیں، ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ مناسب یہ تھا کہ ہم مزید پھیلاؤ کی بجائے کچھ دیر کے لئے دم لیتے اور ان سکولوں اور کالجوں کی حالت بہتر بناتے، جو اس سے پہلے ہی قائم ہیں مگر اس حالت میں کہ ان کا بند ہو جانا ہی بہتر تھا۔

ریاست میں کواپریٹو کی تحریک بڑے زور و شور کے ساتھ شروع ہوئی تھی لیکن جلد ہی اس پر بھی منحوس حکومت کا منحوس سایہ پڑ گیا اور آج یہ محکمہ بد دیانت، بدقماش، بد معاش اور نا اہل کانگریسی ممبروں کی چراگاہ بن کر رہ گیا ہے۔

غلام نبی سوگامی: آنریبل ممبر نے کانگریسی ممبران کے لیے بد دیانت، بدمعاش اور بدقماش کے الفاظ استعمال کئے ہیں، یہ غیر پارلیمانی ہیں۔

آنریبل سپیکر: میں نہیں جانتا کہ شمیم صاحب نے یہ کس Context میں استعمال کئے ہیں۔ میں کاروائی دیکھنے کے بعد اس کے متعلق فیصلہ کروں گا۔

شمیم احمد شمیم: جناب والا میں نے یہ الفاظ اس ایوان کے ان کانگریسی ممبران کے لئے استعمال میں نہیں کئے ہیں۔ جو منتخب ہو کر یہاں آئے ہیں بلکہ ان کے حق میں جو خوش قسمتی سے یہاں نہیں ہیں۔ میرا روئے سخن عام کانگریسی ممبروں، یعنی کارکنوں سے ہے۔

میر غلام محمد: جناب والا! شمیم صاحب ایک سیاسی جماعت کے ممبروں کو بد دیانت، بدقماش اور بد معاش کہہ رہے ہیں اور یہ یقیناً پارلیمانی زبان

نہیں ہے۔

آنریبل سپیکر: ہر ممبر کا اپنا ایک لہجہ اور ایک مخصوص طرز بیان ہوتا ہے اور اس کی تقریر کو اسی پس منظر میں سننا چاہیے۔ شمیم صاحب الفاظ سخت استعمال کرتے ہیں اور آپ کو اس سلسلے میں زیادہ حساس نہیں بننا چاہیے۔

شمیم احمد شمیم: جناب والا! مجھے یہ بنیادی حق حاصل ہے کہ میں افراد کو ان کے کردار اور اعمال کی روشنی میں جانچوں، اور اس کی پروا کئے بغیر کہ وہ کس سیاسی تنظیم سے وابستہ ہیں، ان کے بارے میں وہ کچھ کہوں، جو کچھ میں محسوس کروں۔ میں کواپرٹیو محکمے کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ جس تنظیم کو عوامی سہولیات اور قومی آمدن میں اضافے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہونا چاہیے تھا۔ اس میں ایسے ایسے بدقماش لوگ بھرتی کئے گئے ہیں کہ جن کو زندگی کے کسی دوسرے شعبے میں ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حکمران جماعت اپنے نااہل اور بدکردار کارکنوں کے لئے اس محکمے کو چراگاہ کے طور پر استعمال کر رہی ہے اور نتیجہ یہ کہ محکمے کی کوتاہیوں اور دھاندلیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے چوتھے پلان میں ایک بھاری رقم مخصوص رکھی گئی ہے۔

زیر بحث مسودے میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ بیرون ریاست کے سرمایہ کار ریاست میں سرمایہ لگانے سے اسلئے ہچکچاتے ہیں کہ ان میں عدم تحفظ کا احساس ہے اور مرکزی حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس insecuirty کے احساس کو ختم کرنے کے اقدامات کرے۔ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے، اسی غیر محفوظیت کے احساس کا دوسرا نام مسئلہ کشمیر ہے، جس کو حل کرنے کے لئے آج سے صرف دو ہفتے قبل اس ریاست میں سٹیٹ پیپلز کنونشن کے نام سے ایک اجتماع منعقد ہوا تھا۔ اس

وقت صادق صاحب نے شیخ صاحب کے دعوت نامے کے جواب میں ہندوستانی حکومت کو خوش کرنے کے لئے یہ کہا تھا کہ مسئلہ کشمیر کے نام کے کسی مسئلے کا وجود ہی نہیں لیکن آج اس مسودہ پلان میں انہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ موجود ہے اور اسے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جب تک اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے، ہندوستانی سرمایہ کار اس ریاست میں اپنا سرمایہ لگانے پر آمادہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ صادق صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انکا یہ اعتراف ایک ٹھوس اور گہری حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ عدم تحفظ کا احساس اسلئے ہے کہ اس ریاست کے عوام موجودہ صورتحال سے غیر مطمئن ہیں اور جب تک ریاستی عوام کو مطمئن نہ کیا جائے، غیر محفوظیت کا یہ احساس باقی رہے گا۔ جب تک کشمیری عوام کے سب سے محبوب اور مقبول لیڈر شیخ محمد عبداللہ کو مطمئن نہیں کیا جاتا، یہ احساس باقی رہے گا اور جب تک یہ احساس باقی رہے گا۔ کشمیر کا مسئلہ زندہ رہے گا۔

شری گردھاری لعل ڈوگرہ:

یہ احساس تو آسام میں بھی ہے۔

شمیم احمد شمیم: اور میں کہتا ہوں کہ آسام میں بھی یہ احساس دور کیا جانا چاہیے۔ عدم تحفظ کا احساس اگر ناگالینڈ میں بھی ہے تو وہاں بھی یہ دور کیا جانا چاہیے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ بعض دوسری ریاستوں میں بھی کچھ اندیشے موجود ہیں، اسلئے کشمیر میں ان اندیشوں کو دور کرنے کی طرف توجہ نہ دینا چاہیے۔ جہاں جہاں اندیشے ہوں، وہاں دور کیجیے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔

میرے دوست سری کنٹھ کول نے بھی اپنی تقریر میں کہا ہے کہ عدم تحفظ کے اس احساس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ بیرون ریاست کے سرمایہ کار یہاں سرمایہ نہیں لگاتے بلکہ یہاں کے سرمایہ کار بھی باہر جا کر سرمایہ نہیں لگاتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن ایک آدھی حقیقت ہے۔ کشمیری پنڈت اور پنجابی ہندو تو باہر جا کر سرمایہ لگاتا ہے لیکن کشمیر کا کوئی مسلمان باہر جا کر اپنا سرمایہ نہیں لگاتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عدم تحفظ کی جڑیں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کشمیر کا مسلمان اپنے آپکو غیر آسودہ اور غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اسے ہندوستان میں بڑھتے ہوئے کمیونلزم سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ بے چین ہے، مضطرب ہے۔ میں ہندوستان کی فرقہ پرستی کے لئے کسی کو دوش نہیں دیتا، یہ ہم سب کا مسئلہ ہے اور ہم سب کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جانا چاہیے، لیکن مسئلے کے وجود سے انکار کر کے آپ اس کو حل نہیں کر سکتے۔ چوتھے پلان میں تعلیم یافتہ بے کاروں کی بے کاری دور کرنے کی طرف توجہ دینے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس ریاست میں تعلیم یافتہ بے کاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا تعلق بھی اسی عدم تحفظ کی پیداوار ہے کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کی دنیا صرف اس ریاست کی چار دیواری تک محدود ہے۔ اُسے کشمیر سے باہر ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں ملازمت نہیں مل سکتی اور جب تک اُسے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اُسے کیرالا، مدراس، بنگال اور مدھیہ پردیش میں بھی ملازمت مل سکتی ہے، کشمیر کا مسئلہ قائم رہے گا اور صادق صاحب کے بیانات سے اس کے کردار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ قاسم صاحب نے آج سے چند ماہ قبل سوتنتر پارٹی کے ایک لیڈر سے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں

ہر سال کم از کم پانچ سو کشمیری نوجوانوں کو ملازمت مل جانی چاہیے۔اس سے ان میں اس ملک کی تئیں برابر کا شریک ہونے کا احساس بڑھ جائے گا، لیکن سوال صرف ملازمت ملنے کا ہی نہیں، انہیں اس بات کا بھی یقین ہو جانا چاہیے کہ وہ ہندوستان کے جس شہر میں ہیں وہاں ان کا وجود بھی محفوظ رہے گا۔ رانچی، مدھیہ پردیش، جمشید پور اور حیدر آباد کے فرقہ وارانہ فسادات نے اس کی ساری نفسیات کو متاثر کر دیا ہے۔

صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کو چاہیئے تھا کہ وہ کنونشن میں شریک ہو کر اس عدم تحفظ کے احساس کو دور کرنے کے لیے کوئی معقول اور مناسب تجویز پیش کرتے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے ''دامن کوہ'' کی بلندیوں سے یہ اعلان کرنے پر ہی اکتفا کیا کہ کشمیر نام کا کوئی مسئلہ موجود ہی نہیں اور ستم ظریفی دیکھئے کہ آج اس مسودہ پلان کو پیش کرتے ہوئے وہ غیر شعوری طور پر مسئلہ کشمیر کو اپنی تمام ناکامیوں اور کوتاہیوں کے جواز کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

مسودہ پلان پر اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مسودہ پلان محض ایک فریب ہے اور اس پر صرف شدہ ساری محنت بالکل ضائع ہو گئی ہے اور ہم نے اس بحث میں حصہ لے کر صرف تضیع اوقات کیا ہے اور بس!۔

مارچ 1970ء

بے کار حکومت کے بے کار اعضاء

''اس ریاست میں جمہوریت کا دوسرا نام ستم ظریفی ہے اور اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ میں بڑی ایمانداری اور خالص جمہوری طریقے سے منتخب ہو کر آیا ہوں مجھے صرف پانچ منٹ کا وقت دیا جارہا ہے اور اس کے برعکس جن لوگوں پر مخالف امیدواروں کے حلف نامے چُرانے ، بے ایمانی اور بد دیانتی کے ذرائع اپنانے ، حتیٰ کہ مخالفوں کے ووٹ چرانے کا بھی الزام ہے، انہیں پندرہ منٹ کا وقت دیا جاتا ہے۔''

''صرف انڈسٹری کا شعبہ ہی ایک ایسا شعبہ ہے ، جو ریاست کی اقتصادیات کو مستحکم بنیادوں پر تعمیر کرنے کا ایک ذریعہ ہوسکتا تھا لیکن ہمارے حکمرانوں نے آج بیس سال سے یہاں کے لوگوں میں سستے داموں چاول کی خیرات بانٹنے کو ہی اپنی منزل سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی میدان میں ہماری ریاست ملک کی سب سے پسماندہ ریاست ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سستے چاول کی تقسیم ایک منظّم سازش کا نتیجہ ہے تا کہ ریاستی عوام کا ذوقِ عمل اور ان کی قوتِ نمو خوابیدہ رہے۔ اگر اس ریاست کو واقعی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے تو ہمیں یہاں ایسی صنعتوں کو فروغ دینا ہوگا جن سے ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہو۔''

''بجلی کی رو مہیا کرنے کے سلسلے میں میرے حلقۂ انتخاب شوپیان کو قطعی طور پر نظرانداز کیا جارہا ہے اور میں حکمرانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ شوپیان کا اندھیرا بہت جلد ان کی قسمت کا اندھیرا بننے والا ہے۔

ٹرانسپورٹ اور پبلک سروس مطالبات زرپر

''ٹرانسپورٹ اور پبلک ورکس کے محکمے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور جتنے یہ محکمے اہم ہیں اتنا ہی ان میں ہیرا پھیری اور کورپشن کی بھی گنجائش ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ پچھلے بیس سالوں میں ہر حکومت نے ان ہی دو محکموں میں سب سے زیادہ اقربا نوازی، خویش پروری اور کنبہ پروری روا رکھی ہے۔

''یوں تو ہر محکمے میں نالائق اور نا اہل افسروں کی خاصی تعداد موجود ہے لیکن محکمہ ٹرانسپورٹ نالائق، نااہل، بد دیانت اور بد کردار افسروں کی ایک نرسری ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ رشوت ستانی اور بے ایمانی کہاں اور کس محکمے میں نہیں ہے لیکن ٹرانسپورٹ کا محکمہ رشوت اور بے ایمانی کا ایک کھلا اشتہار ہے۔

''ڈرائیور، کلینز اور کنڈیکٹر اور اس قبیل کے دوسرے کام کرنے والے تو اس محکمے کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، لیکن ان کی محنت اور ریاضت کا ثمر اٹھانے والے اس محکمے کے وہ بڑے بڑے افسر ہیں، جنہوں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر لاکھوں کی جائیداد بنائی ہے۔ موجودہ ٹرانسپورٹ کمشنر کی نااہلیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ موسم سرما میں جب سری نگر جموں شاہراہ مہینے بھر کے لیے بند رہی تو کمشنر صاحب نے ایک بار بھی بانہال یا بٹوت تک جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ریاستی سرکار اس محکمے کو تجارتی لائنوں پر

چلانے کے بجائے سیاسی اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے اور جب تجارتی اداروں کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو وہی ہوتا ہے جو اس محکمے میں ہو رہا ہے۔ پبلک ورکس کا ذکر کرتے ہوئے شمیم صاحب نے کہا:

''اس محکمے نے کافی کام کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جتنا روپیہ اس محکمے نے آج تک خرچ کیا ہے اس کو صحیح طور پر خرچ کیا گیا ہوتا تو اس سے دو گنا کام ہو سکتا تھا۔ یہ محکمہ تو راشی، بددیانت اور بے ایمان افسروں کی چراگاہ ہے اور اسی لیے یہاں اسسٹنٹ انجینئر سے لے کر چیف انجینئر تک سبھی افسروں نے بہت ہی قلیل مدت میں لاکھوں روپیہ کی جائیدادیں بنائی ہیں اور کچھ ایسے بھی مہاپرش ہیں جن کی جائیداد کا حساب کروڑوں تک پھیلا ہوا ہے۔ بے ایمانی اور رشوت ستانی کے ان چلتے پھرتے ہوئے اشتہاروں کے خلاف کوئی کاروائی کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ میں صادق صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک شعبے کو لیجئے اور اس کا نام ہے میکینکل اینڈ سٹور ڈیپارٹمنٹ۔ میرے پاس اس وقت سال ۱۹۶۷ء کی آڈٹ رپورٹ ہے۔ اس آڈٹ رپورٹ میں واضح طور پر یہ حقیقت درج ہے کہ اس محکمے کے چیف انجینئر نے لاکھوں روپے کا گول مال کیا ہے۔ ایک فرم کو ناجائز طور پر لاکھوں کا فائدہ پہنچایا ہے۔ اس نے لاکھوں روپے کے سیمنٹ کی چوری کی ہے لیکن اس کے باوجود ابھی تک اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی ہے۔ صادق صاحب کا ارشاد ہے کہ افسروں کے خلاف تحریری شکایت کرو، تو اس کی تحقیقات ہوگی۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس آڈٹ رپورٹ سے زیادہ معتبر شکایت کنندہ کون ہو سکتا ہے پھر اس بددیانت افسر کو ابھی تک کیوں برداشت کیا جا رہا ہے۔

صحت عامہ اور جیل خانہ نجات سے متعلق مطالبات زر:

’’ہسپتالوں کی بدنظمی اور افراتفری سے ہی محکمہ صحت کی صحت کا اندازہ لگانا ہو، تو یہ کہنا کافی ہے کہ یہ محکمہ بے حد بیمار ہے۔ سرینگر کے صدر ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ جس بے دردی اور بے رحمی کا سلوک کیا جارہا ہے اس کا ایک فائدہ ضرور ہوگا، شاید ان مریضوں کی آہیں اور بد دعائیں اس حکومت کو غرق کر کے اس انقلاب کو جنم دیں، جس کے لیے ہم سالہا سال سے منتظر ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک نوجوان شاعر غلام محمد دلشاد، ڈاکٹروں کی لاپرواہی کا شکار ہو کر واصلِ بحق ہو گئے۔ انہیں غلط گروپ کا خون دیا گیا تھا۔ اسی طرح آج سے چند ماہ پہلے ایک دیہاتی مریضہ کو ہسپتال کے عملے کی لاپرواہی کی بناء پر تین دِن تک غذا نہیں دی گئی۔ ایسے واقعات ہمارے ہسپتالوں میں روز کا معمول ہیں لیکن وزیر صحت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی‘‘۔

سرینگر کے امراض سینہ کے ہسپتال کو ایک ایسے ڈاکٹر کے سپرد کیا گیا ہے جس کے پاس امراضِ سینہ تو چھوڑیئے ڈاکٹر ہونے کی بنیادی کوالی فیکیشن بھی نہیں حالانکہ اسی شہر میں دو سند یافتہ اور تربیت یافتہ ڈاکٹر موجود ہیں۔ اس نظر عنایت اور کرم خصوصی کی کیا وجہ ہے۔ یہ میں وزیر صحت سے پوچھنا چاہوں گا۔

جہاں تک ہسپتالوں میں ادویات کی بہم رسانی کا تعلق ہے، ہمارے ہسپتال اس قدر مفلس اور قلاش ہیں، جس طرح یہ حکومت شہرت، اہلیت اور کارکردگی کے سلسلے میں مفلس اور تہی دست ہے۔ جہاں تک دور افتادہ دیہات میں طبی امداد کی بہم رسانی کا تعلق ہے میرے خیال میں ہماری یہ

جمہوری حکومت دیہات میں رہنے والے کسانوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتی ہے۔اسی لیے مفصلات کے ہیلتھ سنٹروں اور شفاخانوں کی حالت اس حد تک زبوں ہے کہ انہیں شفاخانہ کہنا ایک نہایت ہی بے رحم مذاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں حکومت سے مطالبہ کرونگا کہ شوپیان میں سری نگر کے صدر ہسپتال کے طرز پر ایک بڑا ہسپتال قائم کیا جائے جو اس قصبے سے ملحق سینکڑوں دشوار گزار اور دور افتادہ دیہات کی ضرورت کو پورا کر سکے۔

جیل خانوں کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

میں نے پچھلے سال بھی کہا تھا اور اب کی بار پھر دہراتا ہوں کہ جیل خانوں کا سدھار خود حکمران جماعت کے مفاد میں ہے۔ کیونکہ یہ کشمیر کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش سبق ہے کہ آج کا حکمران کل کا قیدی ہوتا ہے۔ میں موجودہ حکمرانوں کو یہ چیتاوَنی دیتا ہوں کہ وہ وقت نزدیک آرہا ہے جب انہیں اس روایت کا احترام کرتے ہوئے جیل جانا ہوگا۔ اگرچہ خواجہ شمس الدین (سابق وزیر اعظم) نے ابھی تک تاریخ اور روایات سے دغا کر کے اپنے آپ کو بچالیا ہے لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جیلوں کی حالت کو سدھارنا خود آپ کے لیے مفید اور مناسب رہے گا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے اپنے بارے میں بھی یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ جلد یا دیر پا آپ کی حکومت کے ہاتھوں مجھے بھی جیل جانا ہوگا۔ اس لیے میں گذارش کرونگا کہ جیل کی حالت سدھارنے کے لیے آپ نے جس اعلیٰ ماہر کو اس ریاست میں بلایا تھا اس کی تیار کردہ سکیم کو عملی

جامہ پہنایئے تاکہ میں ایک ایسی جیل میں جاسکوں جو مہذب اور شریف انسانوں کے شایانِ شان ہوگا۔

"وزیر صحت نے شوپیان نوٹیفائڈ ایریا کو بھی مقامی کانگریس کی شاخ تصوّر کر کے اسے اپنی دستبرد سے محفوظ نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے پردیش کانگریس کے صدر کی ہدایت پر کمیٹی سے معزز ذمہ دار اور تجربہ کار ممبروں کو خارج کر کے ان کی جگہ ایف ایس اور ہوم گارڈ کے والینٹر بھرتی کر دیئے۔ یہ وزیر صحت کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ان کی شہرت پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

قانون، اطلاعات اور بحالیات سے متعلق

پچھلے سال ۴ ستمبر کو اس لیجسلیچر کی تاریخ کا ایک تاریک ترین باب لکھا گیا اور اس کے مصنف ہیں ہمارے وزیر قانون شری گردھاری لعل ڈوگرہ۔ ۴ ستمبر کو عوامی نمائندگی میں ترمیم کا ایک ایسا بل ایوان سے پاس کرادیا گیا جسے پاس کرنے کا اس ایوان کو کوئی حق نہ تھا لیکن چونکہ سیاسی مقاصد کے پیش نظر اس بل کا پاس کیا جانا حکمران طبقے کے مفاد میں تھا، اس لیے وزیر قانون نے ہمارے احتجاج کے باوجود اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اس بل کو پاس کروا لیا۔ ۱۹ فروری کو جب پارلیمنٹ کے سامنے اس بل کو بغرض ترمیم پیش کیا گیا تو ساری دنیا ہم پر ہنسنے لگی، اس ایوان نے عوامی نمائندگی ایکٹ میں ایسی ترمیم کی تھی جو اس کے دائرہ اختیار میں نہیں تھی۔ ہم نے بزعم خود سپریم کورٹ کو کچھ اختیارات دئے تھے۔ پارلیمنٹ کے ممبران نے جائز طور پر ہمارا مذاق اڑا کر ہمیں اپنی حماقت کا احساس دلایا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تمام تر ذمہ داری وزیر قانون پر ہے۔ دنیا کے کسی مہذب ملک میں وہاں کے وزیر قانون کو

مستعفی ہونے پر مجبور کیا جاتا، لیکن اس ریاست میں سب کچھ چلتا ہے اور اسی لیے وزیر قانون بڑے اطمینان اور آرام سے اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

محکمہ اطلاعات اور فیلڈ سروے آرگنائزیشن کے متعلق

ریاست کے محکمہ اطلاعات کو ایک قومی سیکنڈل اور ذلت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اس محکمے کا کام اخبارات میں رشوت اور خیرات بانٹ کر صحافیوں کے اخلاق اور پریس کی آزادی پر شب خون مارنا ہے۔ اس محکمے کا کام صرف حکومت اور وزیروں کی کارکردگی سے متعلق پریس نوٹ شائع کرنا ہے اور باوجود اس کے کہ یہ ایک سرکاری محکمہ ہے یہ ریاستی کانگریس کے پبلک ریلیشنز آفس کی حیثیت سے بھی کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرسوں صدر کانگریس سید میر قاسم نے اس ایوان میں جو تقریر کی، محکمے کی طرف سے خاص طور پر اس کا پریس نوٹ شائع ہو کر تقسیم ہوا ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک اخبار کو پچھلے اڑھائی سال کے دوران صرف اس لیے پچاس ہزار روپے سے زائد رقم دی گئی ہے کہ اس نے ڈی۔ پی۔ در کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ وہ دلیپ کمار کی طرح خوبصورت ہیں۔ اگر اخبارات کو نوازنے کا صرف یہ معیار ہے کہ وہ جانی واکر کو دلیپ کمار اور دیو آنند کو کے۔ این سنگھ قرار دیں تو اس ریاست میں صحافت کا خدا ہی حافظ ہوگا۔

"فیلڈ سروے آرگنائزیشن محکمہ اطلاعات کی ایک ایسی ناجائز اولاد ہے جس کے مقاصد سے خود حکومت بھی ابھی تک واقف نہیں ہے۔ اس محکمے کا

کام اخبار نویسوں کو خرید کر حکومت کی مدح سرائی کرانا ہے۔ اس محکمے میں ساٹھ ہزار روپے کی رقم خفیہ سروس چلانے کے لیے مخصوص رکھی گئی ہے۔ یہ خفیہ سروس کیا ہوگی؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ پچھلے انتخابات کے دوران اس آرگنائزیشن کے ورکرس کو کانگریس کے مخالف امیدواروں پر پتھراؤ کرنے اور ان کے جلسوں میں ہلڑ مچانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اب معلوم نہیں آئندہ انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ بخشی صاحب پر الزام تھا کہ اُنہوں نے پیس بر گیڈ قائم کیا ہے۔ صادق صاحب نے صرف نام بدل دیا ہے۔

اپریل 1968ء

کشمیر یونیورسٹی
غفلت اور عدم توجہی کی علامت

جناب والا! زیر غور بل کا تعلق اس اہم تہذیبی ادارے سے ہے، جسے اصطلاح عام میں یونیورسٹی کہتے ہیں۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ملکوں کی تعمیر اور قوموں کے کردار کی تشکیل میں یونیورسٹی کا رول کس درجہ اہم ہوتا ہے۔ اس ریاست میں آج سے اٹھارہ سال قبل جب ایک یونیورسٹی قائم ہوئی تھی تو ہم لوگوں نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس خواب کا تعلق اسی یونیورسٹی سے تھا۔ یہاں کے دانشوروں، مفکروں اور معلموں نے یہ امید باندھی تھی کہ یہ یونیورسٹی نوجوانوں کی ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دے کر اس ریاست کی تہذیبی اور تعلیمی زندگی کو نئے افق عطا کرے گی۔ لیکن آج اٹھارہ سال بعد جب ہم اس خواب کی تعبیر دیکھتے ہیں تو امیدوں، آرزوؤں اور حسرتوں کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے قیام سے لے کر اب تک اس اہم تہذیبی ادارے کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کی کبھی کوشش نہیں ہوئی ہے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ صادق صاحب کے دورِ اقتدار میں اور کچھ نہ ہو کم از کم اس یونیورسٹی کو ایک مہذب اور فعال ادارہ بنانے کی طرف بھرپور توجہ دی جائے گی۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ صادق

صاحب کے دور میں یہ مستقبل ساز ادارہ زیادہ سرعت کے ساتھ تنزّل اور پستی کی طرف لڑھکتا جارہا ہے۔ صادق صاحب کے ہاں اس اِدارے کو غالباً ثانوی اہمیت بھی حاصل نہیں ہے اور اسی لیے وہ یونیورسٹی کے معاملات کو سدھارنے کے لیے اپنے مصروف وقت میں سے کچھ لمحے بھی نہیں نکال سکتے ۔ وہ کانگریس کنونشن کی تیاری اور اس کے انعقاد میں بارہ بارہ دن صرف کر سکتے ہیں۔ باغی نیشنل کانفرنسیوں کو کانگریس میں شمولیت پر رضا مند کرنے کے لیے ایک ایک ، دو دو دن صرف کر سکتے ہیں لیکن انہیں یونیورسٹی کو بہتر بنیادوں پر منظّم کرنے کی فرصت نہیں ۔ صادق صاحب جیسے باشعور اور پڑھے لکھے آدمی سے ہمیں ہرگز ہرگز یہ توقع نہیں تھی ۔ یونیورسٹی کے تصوّر اور اس کے وجود کے ساتھ پچھلے بارہ تیرہ سال میں بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں ۔ بخشی صاحب نے آصف اصغر علی فیضی جیسے بے مثال عالم اور قابل وائس چانسلر کے ساتھ اتنی زیادتیاں کیں کہ ان کے لیے یہاں رہنا ناممکن بن گیا۔ لیکن بخشی صاحب سے کبھی ہم نے شکایت نہیں کی ۔ اُنہوں نے خود کسی یونیورسٹی کا دروازہ نہیں دیکھا تھا ، اس لیے وہ یونیورسٹی کے منصب اور اس کے کردار کو نہ سمجھ سکتے تھے ۔ لیکن آپ نے تو اسی یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے جہاں مجھے کسب فیض کی سعادت حاصل ہوئی ہے ۔ پھر یہ کیسے ممکن بن گیا کہ آپ نے یونیورسٹی کی تاریخی ، تہذیبی اور تعمیری اہمیت کو نظر انداز کر کے اسے چند نا اہلوں اور نا عاقبت اندیشوں کے سپرد کر رکھا ہے ۔ نائب وزیر تعلیم جو اس بل کے محرک ہیں کو زندگی بھر کسی یونیورسٹی میں قدم رکھنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ۔ اس لیے ان سے یونیورسٹی کو بہتر بنانے کی توقع فضول ہے ۔ لیکن آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جموں وکشمیر یونیورسٹی میں کیا ہو رہا ہے ۔

اس بل میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تنخواہ دو ہزار سے ڈھائی ہزار روپے کرنے کی تحریک پیش ہوئی ہے۔ یہ تحریک منظور ہونے سے پہلے میں صادق صاحب سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ وائس چانسلر ہے کہاں؟ آج ڈیڑھ سال سے یہ یونیورسٹی ایک وائس چانسلر کے انتظار میں سوگوار بیٹھی ہے اور صادق صاحب کی قوت فیصلہ پر اس سے بڑھ کر کیا تبصرہ ہوسکتا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ سال سے انہیں اس یونیورسٹی کے لیے ایک وائس چانسلر بھی نہیں ملتا۔ پچھلی بار جب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی یہاں تشریف لائی تھیں تو میں نے صادق صاحب کی موجودگی میں ہی ان سے شکایت کی تھی کہ صادق صاحب ابھی تک اس یونیورسٹی کے لیے وائس چانسلر ڈھونڈنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس شکایت کے بعد وائس چانسلر کا انتخاب کرنے میں جلدی ہوگی۔ لیکن اس کے بعد یک نہ شُد دو شُد کے مصداق یہ یونیورسٹی پرووائس چانسلر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی اور آج جموں برانچ کے پرووائس چانسلر، وائس چانسلری اور پروچانسلری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ میں تو صادق صاحب کو Prisoner of indecision سمجھتا ہوں انہیں فیصلہ کرنے میں سالہا سال لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یونیورسٹی جیسے تہذیبی ادارے اور تعلیمی اداروں کو اس قسم کی تغافل شعاریاں گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔ اس سے قبل یونیورسٹی کے جو وائس چانسلر تھے ہم نے کئی بار شکایت کی کہ یہ صاحب بہت ہی عمر رسیدہ ہو چکے ہیں اور ان کے لیے یونیورسٹی کو چلانا ممکن نہیں۔ لیکن اس وقت تک ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی جب تک مالک دو جہاں نے انہیں اس دنیا سے ہی نہ اٹھالیا۔ مجھے آنجہانی سے کوئی شکایت نہیں لیکن ان لوگوں سے ضرور شکوہ ہے جو صرف اسّی اور بیاسّی برس

کے بوڑھوں کو ہی وائس چانسلری کے عہدے کے لیے مناسب اور موزون سمجھتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس نوجوان یونیورسٹی کے لیے ایک متحرک، فعال اور سرگرم وائس چانسلر کی ضرورت ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وائس چانسلر اور پرووائس چانسلر کا انتخاب کرنے میں بھی ذاتی پسند اور ناپسند کا خیال رکھا جاتا ہے اور نتیجہ یہ کہ یونیورسٹی کا نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ اساتذہ کا انتخاب ہو یا امتحانات کی تنظیم وترتیب، ہر معاملہ بدنظمی اور بے ترتیبی کا شکار ہے۔ ہماری یونیورسٹی کے ایک شعبے کا سربراہ ایک ایسا آدمی ہے کہ جس کے متعلق خود صادق صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ لکھنو میں ان کی شہرت قابلِ اعتراض حد تک مشکوک ہے۔ ایسے ایسے لوگ ہمارے اس سب سے مہذب اور مقدس ادارے میں کیسے گھس گئے، یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو یونیورسٹی کے معاملات کے ذمہ دار ہیں۔ اس طرح اس نئے بل کی رو سے ہر شعبے کا سربراہ یونیورسٹی کی اس فیکلٹی کا Dean ہوگا۔ پچھلے تین سال سے میں چلا رہا ہوں کہ انجینئرنگ کالج کا پرنسپل، انجینئرنگ کا نہیں جغرافیہ کا پروفیسر ہے اور اسے انجینئرنگ کے متعلق اتنی ہی واقفیت ہے جتنی مجھے یا صادق صاحب کو ہے اور وہ ہرگز ہرگز فیکلٹی آف انجینئرنگ کا Dean نہیں ہوسکتا، لیکن کوئی نہیں سنتا۔ صادق صاحب معقول بات سن کر اَن سنی کردیتے ہیں۔ ان سے کوئی شکایت کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ میں نے تو شکایت کرنے کی آزادی دے رکھی ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس شکایت کا ازالہ کرو، تو بات ٹال جاتے ہیں۔

صادق صاحب مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یونیورسٹی نوجوانوں کے کردار کی تشکیل کرتی ہے ان کے ذہنوں کی تربیت اور قوم کے مستقبل کی تعمیر میں ایک ایسا موثر رول ادا کرسکتی ہے کہ تعصب اور ذہنی اندھیروں کو دور

کرنے کے لیے اس سے بہتر ادارہ ممکن نہیں۔ اس ریاست میں جہاں ہر سال
لاکھوں اور کروڑوں روپیہ پولیس، ملیشیا، فیلڈ سروے اور محکمۂ اطلاعات پر
صرف ہوتا ہے اگر اس سے نصف رقم بھی یونیورسٹی پر صرف ہوتی اور صحیح طور
پر صرف ہوتی، پھر شیخ محمد عبداللہ کا سیاسی سطح پر مقابلہ کرنے کی ضرورت باقی
نہیں رہتی۔ پچھلے چودہ پندرہ سال میں ہم نے ایک ایسی نسل کی ذہنی
تربیت کا کام مکمل کر دیا ہوتا جو سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کو اس کے صحیح
پس منظر میں دیکھ سکتی۔ پھر ہمارے یہ نوجوان تخریبی کارروائیوں میں مصروف
ہوتے یا ملک کو نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہوتے۔ اگر آپ جہالت، تعصب
تنگ نظری، فرقہ پرستی، علاقائی عصبیت اور توہمات کے خلاف ایک فیصلہ کن
جنگ لڑنا چاہتے ہیں تو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ جنگ سیاسی
پس منظر میں نہیں، یونیورسٹی کے تہہ خانوں میں ہی جیتی جا سکتی ہے۔ اس
لیے میں صادق صاحب سے مؤدبانہ التماس کروں گا کہ وہ اپنی جماعت کے
جھگڑوں سے فرصت پانے کے انتظار میں نہ بیٹھیں اور اپنی اولین فرصت میں
یونیورسٹی کو تباہی اور زوال سے بچانے کی فکر کریں۔"

وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق نے شمیم صاحب کی تنقید کا جواب دیتے
ہوئے کہا کہ یونیورسٹی ایک آزاد اور خود مختار ادارہ ہے اور شمیم صاحب نے
اس ادارے کی جن خامیوں کا ذکر کیا ہے وہ خود یونیورسٹی سے متعلق حکام کی
پیدا کردہ ہیں۔ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کا انتخاب بھی چونکہ یونیورسٹی کا
اپنا کام ہے اس لیے ہم اس میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ صادق صاحب کی
تقریر کا جواب دیتے ہوئے شمیم احمد شمیم نے کہا "صادق صاحب کی تقریر
سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے کہ کشمیر یونیورسٹی ایک ایسا آزاد اور خود

مختار ادارہ ہے کہ حکومت اور اس ایوان کا اس پر کوئی کنٹرول نہیں۔ میں صادق صاحب کے اس مفروضے سے اتفاق نہیں کرتا۔ یونیورسٹی کو کس درجہ آزاد اور خود مختار ہونا چاہیئے اس سوال پر پورے ملک میں ایک دانشورانہ بحث ہو رہی ہے۔ لیکن کشمیر یونیورسٹی کے بارے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ہم اس درجہ بے بس ہیں کہ کچھ کر ہی نہیں سکتے اور اگر صادق صاحب کے بیان کو مبنی بر صداقت تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بات اور ضروری بن جاتی ہے کہ ہمیں یونیورسٹی کے معاملات کو سدھارنے کے لیے مناسب کاروائی کرنا ہوگی اور اس خود مختاری میں مداخلت کرنا پڑے گی۔ یہ کیسی خود مختاری ہے کہ خزانۂ عامرہ کا لاکھوں روپیہ برباد ہو رہا ہے، ہمارے نوجوانوں کا تعلیمی مستقبل مخدوش ہو رہا ہے اور ہم اس لیے کچھ نہیں کر سکتے، کہ یونیورسٹی خود مختار اور آزاد ادارہ ہے۔ یہ بل جو ہمارے زیر غور ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایوان بہت کچھ کر سکتا ہے اور میں صادق صاحب کی یہ توجیہہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ ساری برائیاں اور سارا قصور یونیورسٹی کا ہے۔ صادق صاحب نے کہا ہے کہ وائس چانسلری کے لیے کسی عمر رسیدہ بزرگ کا انتخاب ہی موزون ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عمر رسیدہ آدمی تجربہ کار بھی ہوتا ہے۔ عمر رسیدہ وائس چانسلر تو ٹھیک ہے کہ اس کا تجربہ پختہ ہوتا ہے لیکن عمر رسیدہ اور قبر رسیدہ میں فرق ہے۔ اسی بیاسی برس کا بوڑھا ایک نوجوان اور زیر تعمیر یونیورسٹی کے لیے یقیناً مفید نہیں ہو سکتا اور نہ ایسے پرو وائس چانسلر کی ضرورت ہے، جس کے وقت کا دو تہائی سے زائد حصہ ہوائی جہاز میں گزرے۔ اس یونیورسٹی کے جو پرو وائس چانسلر ابھی حال ہی میں یہاں سے تشریف لے گئے ہیں، ان کے بارے میں میری یہ اطلاع ہے کہ یونیورسٹی کے بجٹ کا زیادہ تر حصہ ان کے ہوائی سفر پر خرچ ہوتا رہا ہے۔ صادق صاحب کا کہنا

ہے کہ موزون وائس چانسلروں کا ملنا مشکل ہوگیا ہے۔ میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ صادق صاحب حکم دیں تو میں ایسے آدمیوں کے نام پیش کرونگا جو علمی، ذہنی استعداد اور قابلیت میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ صادق صاحب پہلے فیصلہ تو کر لیں۔

ایک اور اہم بات کا تذکرہ کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا اس ریاست کی سرکاری زبان اُردو ہے اور کشمیر یونیورسٹی ایک بہترین اُردو یونیورسٹی کا درجہ بھی حاصل کر سکتی ہے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کے جموں ڈویژن میں سرکاری ملازموں کو ایم۔ اے اُردو کی ایوننگ کلاسز میں داخلے کی سہولیات نہیں دی جا رہی ہیں۔ میں صادق صاحب سے گزارش کرونگا کہ وہ اپنی اولین فرصت میں اس بے انصافی کو دور کر کے یونیورسٹی اور دیگر سرکاری ملازمین کو ایوننگ کلاسز سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

اپریل ۱۹۶۸ء

سرکاری اخراجات
سیاسی انتقام گیری کا آلہ

جناب والا! اعداد و شمار کی باریکیوں میں نہ جاتے ہوئے میں صرف دو ایک اصولی باتیں ابھارنا چاہتا ہوں اور ان باتوں کا تعلق آج اس ایوان میں پیش کردہ زائد اخراجات کی ان مانگوں سے ہے جو وزیر خزانہ نے پیش کی ہیں اور جن کے لیے اس ایوان کی منظوری چاہتے ہیں۔ سرکاری بنچوں پر بیٹھے ہوئے دوستوں کی خالی نشستیں دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ حکمران جماعت کے ممبروں کو اس بحث سے کوئی دلچسپی نہیں جو اس وقت آٹھ کروڑ سے زائد روپے کی مانگوں پر یہاں ہو رہی ہے۔ عین اس وقت جب کہ ان مانگوں پر ووٹ لیے جائیں گے، کانگریسی ممبر حضرات 'ہاں' کہنے کے لیے اس ایوان میں تشریف لائیں گے۔ اس ایوان کے اندر اور باہر کبھی کبھی یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہ اسمبلی عوام کی نمائندہ نہیں اور حکمران جماعت اسے صرف ربر سٹیمپ کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ حکمران جماعت اپنے کردار، گفتار، قول اور فعل سے اس الزام کو تقویت پہنچاتی ہے۔

تقریباً آٹھ کروڑ روپے کے مطالبات زر کا پاس کیا جانا مطلوب ہے۔ یہ رقم ۶۴ـ ۱۹۶۳ء میں خرچ ہوئی ہے اور اس کا کچھ حصہ ۶۵ـ ۱۹۶۴ء میں خرچ ہوا ہے۔ یہ اس باقاعدہ بجٹ کا حصہ نہیں، جسے یہ ایوان پاس کرتا ہے اور یہ

زائد رقومات حکومت کی نا اہلیت ، بد دیانتی اور لا پرواہی کی وجہ سے خرچ ہوئی ہیں اور آج حکومت اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اس ایوان سے اس بے ضابطگی اور اس بے ایمانی کو قانون کا درجہ دینے کا مطالبہ کرتی ہے اور اُسے امید ہے کہ اس ایوان کی بھاری اکثریت اس کا مطالبہ منظور کر دے گی۔اب اگر دنیا پر یہ تاثر پیدا ہو کہ یہ ایوان محض ایک ربر سٹیمپ ہے تو مجھے بتائیے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی۔

بات اگر لاکھ دو لاکھ روپے کی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا کیونکہ اس ریاست میں لاکھ دو لاکھ روپے کی ہیرا پھیری اب ایک ایسا معمول بن گئی ہے کہ اس پر نہ کسی کو تعجب ہوتا ہے اور نہ احتجاج کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن مطالبات زر کی رقوم ۸ رکروڑ روپے سے بھی زائد ہے اس لیے ضروری بن جاتا ہے کہ ان رقومات کی منظوری دینے سے پہلے ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ یہ روپیہ صرف کیسے ہوتا ہے اور اس کے صرف کرنے والے لوگ کیسے ہیں۔اگر روپیہ خرچ کرنے سے ترقیاتی سکیموں میں کام کی رفتار بڑھ جاتی ہے عوام کا معیار حیات بلند ہوتا ہے، قومی آمدن میں اضافہ ہوتا ہے، لا اینڈ آڈر کی مشینری بہتر بن جاتی ہے تو یقیناً آٹھ کروڑ کیا ہم چودہ کروڑ روپیہ کی منظوری دینے میں بھی بخل سے کام نہ لیں گے۔لیکن پچھلے تین چار سال کی کارکردگی کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کے ہر شعبے میں یہ ریاست روبہ زوال ہے۔

جہاں تک پولیس پر روپیہ خرچ کرنے کا سوال ہے اس رقم میں ہر سال غیر معمولی اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس ریاست میں آج لا اینڈ آڈر کی کیا صورت ہے۔میرے دوستوں نے امن شکنی اور لاقانونیت کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔لیکن میں صرف دو ایسی مثالیں پیش کروں گا جن کا

مجھے ذاتی تجربہ ہے اور جن میں میری حیثیت سب سے معتبر گواہ کی ہے۔
۴ ستمبر کو میں نے اپنی آنکھوں سے صادق صاحب کی پولیس کو ایس۔ پی کالج کے پروفیسروں اور لیکچرروں کو بڑی بے دردی اور بے رحمی سے مارتے دیکھا۔ کالج کے پرنسپل بھی پولیس کی دست اندازی سے محفوظ نہیں رہے اور ان کا قصور یہ تھا کہ اُنہوں نے کالج کی عمارت کو بچانے، طلباء کو ہلڑ باری سے روکنے کے لیے خود پولیس طلب کی تھی۔ لیکن قانون کے ان محافظوں نے کالج کے پروفیسروں کی ہی ہڈی پسلی ایک کر دی۔

ایک اور مقدمے کا تعلق میری ذات سے ہے۔ ممبر اسمبلی کی حیثیت سے ہر ممبر کا اپنی کانسٹی چیونسی کے مسائل کا جائزہ لینے، اپنے لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کا حق ہے۔ لیکن صادق صاحب کے راج میں ایک ممبر اپنے ان فرائض کی انجام دہی میں بھی اپنی زندگی اور اپنی عزت محفوظ نہیں سمجھتا۔ ۵ رمئی کو مجھے ڈپٹی منسٹر زراعت نے ایک سرکاری طور منعقد کیے گئے جلسے میں شوپیان بلایا اور عین اُس وقت جب کہ میں اپنے حلقۂ انتخاب کے مطالبات اور وہاں کے لوگوں کی مشکلات ڈپٹی منسٹر صاحب کے سامنے بیان کر رہا تھا۔ کفن چوروں، بے ایمانوں اور پیشہ ور بدمعاشوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا اور ستم ظریفی یہ کہ ان حملہ آوروں میں سرکاری ملازم بھی شامل تھے۔ ڈپٹی منسٹر یہ تماشہ دیکھتے رہے اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یہ حملہ ان کے ایماء سے ہوا۔ میں ریاست میں امن اور قانون کے سب سے بڑے محافظ خواجہ غلام محمد صادق کے دربار میں فریاد لے کر پہنچا اور اس فریاد کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۵ رمئی سے لے کر اب تک پولیس نے ابتدائی کاروائی بھی شروع نہیں کی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جس ریاست میں ایک ایم۔ ایل۔ اے کی زندگی اور عزت محفوظ

نہ ہو وہاں لوگوں کی عزت محفوظ رکھنے کا قلمداں خود خواجہ غلام محمد صادق کے ہاتھوں میں ہے۔ اُس صادق صاحب کے ہاتھوں میں جس نے صرف شرافت اور بلند اخلاقی کے نام پر اقتدار حاصل کیا تھا۔ ہمیں روپے کی منظوری دینے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن ہم ان قاتلوں، جابروں اور بے ایمانوں کے ہاتھوں میں یہ روپیہ کس طرح دے سکتے ہیں؟ اس لیے دیں کہ آج شمیم احمد شمیم پر حملہ ہوا ہے، کل غازی رحمان پر ہوگا، پرسوں علی محمد نائیک پر، اور اس کے بعد رام ناتھ بلگوترہ کی باری آئے۔

ریاست کی صنعتوں کی جو حالت ہے، اس پر میرے دوست علی محمد نائیک نے روشنی ڈالی۔ میں صرف ایک صنعت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے ریشم کی صنعت۔ پرسوں اس ایوان کے اکثر ممبروں کو اس صنعت سے تعلق رکھنے والے کارخانہ داروں اور کاریگروں نے مدعو کیا تھا اور اُنہوں نے اپنا کیس پیش کر کے ہمیں مطمئن کر دیا کہ اس صنعت کو تباہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری ریاستی حکومت، متعلقہ وزارت اور ریشم خانہ کے ان بے ایمان افسروں پر ہے جو اپنا ذاتی کاروبار چلانے کے لیے اس صنعت کو پنپنے کا موقعہ نہیں دیتے۔ آج سینکڑوں مزدور بے کار ہو گئے ہیں اور اس صورت حال کی ذمہ داری صرف ریاستی حکومت پر ہے جو آج ہم سے ان اخراجات کی منظوری کا مطالبہ کرتی ہے جو آج سے پانچ سال پہلے اس نے اپنی نااہلیت کی بناء پر کیے ہیں۔

پچھلے پانچ برسوں میں اس حکومت کے دعووں کی قلعی کھل گئی ہے۔ اس حکومت نے انتخابات میں ایسی ایسی دھاندلیاں کیں کہ ہندوستان کے چیف الیکشن کمشنر مسٹر سندرم اور مسٹر سین ورما کو بھی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ بے ایمانی اور دھوکہ دہی کے چور دروازے سے حکومت کی کرسیوں پر بیٹھنے والے ان

دوستوں کی ہر خطا معاف ہوسکتی تھی اگر وہ ان کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے آپ کو اس منصب کے اہل ثابت کرتے ۔ لیکن ان لوگوں نے ثابت کر دیا کہ یہ صرف غاصب ہی نہیں نا اہل اور نا قابل بھی ہیں ۔ اُنہوں نے ہندوستان سے کروڑوں روپے کی رقم لا کر اس ریاست میں ہندوستان کی شہرت، عزت اور عصمت کو لوٹا ہے ۔ دنیا کہے گی کہ یہ کشمیری کتنے بے مروت اور بے ایمان ہیں کہ ہندوستان سے اتنی دولت حاصل کرنے کے بعد بھی ان سے ناراض اور برگشتہ ہیں ۔ دنیا کو کون بتائے کہ ہندوستان کے تئیں کشمیری عوام کی ناراضگی اور برگشتگی کا سبب ان ہی حکمرانوں کی نا عاقبت اندیشانہ پالیسیاں ہیں ۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہند کشمیر الحاق کے اصل دشمن موجودہ حکمران ہیں اور میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس رشتے کو کمزور کرنے والے نہ نیشنل کانفرنسی ہیں اور نہ جن سنگھی دوست ، اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکمرانوں پر ہے جو اپنی عافیت اور اپنے مفادوں کے لیے ہندوستان کی شہرت اور عزت کو خاک میں ملا رہے ہیں ۔ ساڑھے ۸ ر کروڑ روپے کے یہ مطالبات زر بہر حال منظور کر دیئے جائیں گے لیکن کانگریسی ممبران کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ مطالبات زر پاس ہونے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو لوٹیں ، اور انہیں تنہائی میں سوچنے کا موقع ملے تو وہ اپنے ضمیر سے یہ سوال پوچھیں کہ مطالباتِ زر پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے صادق صاحب اور قاسم صاحب کی کرسی کو تو محفوظ کر دیا لیکن کیا وہ اپنے ضمیر کو بھی مطمئن کر سکتے ہیں ۔

ستمبر ۱۹۶۸ء

غریبوں کی حق تلفی

زیر بحث قرارداد پر اس ایوان کے اکثر ممبران نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اکثر متعلق باتیں کہی گئی ہیں۔ میں اپنی تقریر میں اعداد و شمار اور دیگر تفصیلات میں جانے کے بجائے دو ایک اصولی باتوں پر توجہ دوں گا۔ سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ حکومت جس کے سربراہ خواجہ غلام محمد صادق ہیں سوشلزم اور سماجی انصاف کے بڑے بلند بانگ دعوے کرتی رہی ہے۔ اس حکومت کے بعض سرکردہ اراکین اپنے وقتوں میں ترقی پسندی اور اشتراکی سماج کے بھی علمبردار رہے ہیں اور آج بھی یہ لوگ سوشلسٹ طرز کے نظام کی تشکیل کی باتیں کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حکومت عملاً شہری اور دیہاتی کی تفاوت کو نہ صرف اصولی طور پر اپنی بنیادی پالیسی کے ایک جز کی حیثیت سے اپنا چکی ہے بلکہ اپنے عمل اور کردار سے اس تفاوت اور فرق کو اور زیادہ وسیع کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ راشن کی تقسیم ہو یا کھانڈ کی تقسیم، دیہات میں بسنے والے لوگوں کو تیسرے درجے کا شہری تصور کیا جائے حالانکہ جب کبھی اس حکومت کو اپنی فرضی مقبولیت یا مصنوعی عوامی اساس کا مظاہرہ کرنا ہو تو یہ شہر کی سرحدوں سے دور کسی دیہات میں ہی جا کر اس کا انتظام کرتی ہے۔ حتیٰ کہ مرکزی وزیر داخلہ مسٹر چوان کو بھی ریاستی

کانگریس کی مقبولیت کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے ایک دور و دراز گاؤں دمحال ہانجی پورہ میں جانا پڑا۔ یعنی اس حکومت کا فرضی وجود اگر کسی کے سہارے قائم ہے تو وہ ہیں دیہاتی۔ لیکن اس کے باوجود یہ حکومت شہریوں کے ناز اٹھاتی ہے ان کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے اور دیہاتیوں کو نظر انداز کرتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے اکثر اراکین اور وزراء شہر میں رہتے ہیں اور اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے لیے انہیں شہرداروں کو خوش رکھنا پڑتا ہے اور شہر والوں کی آواز دیہات کے مقابلے میں زیادہ بلند اور مؤثر ہے وہ احتجاج کرنا جانتے ہیں۔

میرے خیال میں اس امتیازی سلوک کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ خالص نفسیاتی ہے۔ اس حکومت کے وزیر اعلیٰ اور وزیر خوراک دونوں ہی دیہات میں رہنے والوں کے بنیادی مسائل اور ان کی مشکلات سے قطعی بے بہرہ ہیں۔ وزیر اعلیٰ اور وزیر خوراک دونوں ہی شہزادوں کی طرح پیدا ہوئے ہیں اور پلے ہیں اور رئیسوں کے گھروں میں جنم لینے کے بعد چونکہ رئیسوں ہی کی طرح ان کی دیکھ بھال ہوئی ہے، اس لیے انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ ایک غریب دیہاتی کو زندہ رہنے کے لیے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وزیر اعلیٰ ہوں یا وزیر خوراک دونوں نے غربت کے افسانے کتابوں میں پڑھے ہیں، یا کسی فلم میں دیکھے ہیں۔ اس لیے دیہاتیوں کے اصل مسائل سے ان کی عدم توجہی ان کی بنیادی نفسیات کا ایک حصہ ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ دیہات میں بسنے والے لاکھوں لوگوں کو مناسب قیمتوں پر راشن مہیا کرنے کے سوال پر حکومت کا رویہ اس قدر بے دردانہ اور بے رحمانہ ہو۔ میں نہیں جانتا کہ آخر حکومت کے پاس دیہات میں بسنے والے لوگوں کے تئیں اس فرض نا

شناسی کا جواز کیا ہے۔ حکومت نے یہ کیسے طے کرلیا ہے کہ شہر میں رہنے والوں کو پورا راشن ملنا چاہیئے ، قصبے میں رہنے والوں کو اس کا ہے[1] اور دیہات میں رہنے والوں کو اس سے قطعی محروم رکھنا لازمی ہے اور یہی مثال کھانڈ کے سلسلے میں ہے۔ اونچے اونچے ایوانوں میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دیہاتی کھانڈ استعمال ہی نہیں کرتے ہیں، اور اگر کرتے ہیں تو بہت کم کرتے ہیں۔ اس امتیازی سلوک سے شہروں اور دیہات کے درمیان فرق کو زیادہ گہرا بنایا جارہا ہے۔

ہندوستان میں آج سے بارہ سال قبل رفیع احمد قدوائی نامی ایک وزیر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے ہندوستان کے خوراک کا مسئلہ حل کردیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ اس سال موسمی حالات خوشگوار ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں خوراک کی پیداوار بہت تسلی بخش تھی۔ لیکن پھر دوسرے ہی سال ان کا یہ کھوکھلا دعویٰ بالکل بے بنیاد ثابت ہوا تھا۔ شری۔ ڈی۔ پی در نے بھی اسی طرح یہ دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے ریاست میں خوراک کا مسئلہ حل کردیا ہے۔ ڈی۔ پی صاحب بڑے ہی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ اتنے خوش قسمت کہ مجھے ان کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔ ان کا وزیر ہونا بھی ان کی خوش قسمتی کا ہی ایک حصہ ہے۔ خوش قسمتی سے گزشتہ دو سال سے سازگار موسمی حالات کے پیش نظر خوراک کی پیداوار میں قدرتی طور پر اضافہ ہوا ہے اور ڈی۔ پی صاحب اضافے کو اپنی کارکردگی کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس ریاست میں خوراک کا مسئلہ پہلے ہی کی طرح موجود ہے اور اگر اس کو مناسب طور حل کرنے کی دیانتدارانہ کوشش نہ کی گئی تو ایک نہایت ہی سنجیدہ اور سنگین صورت حال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ریاستی حکومت اور وزیر خوراک کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ آئندہ دو سال تک ریاست خوراک کے معاملے

میں خود کفیل ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ ایک منظّم سازش کے تحت کیا جارہا ہے، تاکہ آنے والی حکومتوں کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں۔ ریاستی حکومت کے اراکین کو بالعموم اور وزیر خوراک درگا پرشاد جی کو بخوبی معلوم ہے کہ ان کی حکومت دو سال سے پہلے ہی ختم ہو چکی ہوگی اس لیے وہ اس بیان کی صحت یا اس کو حقیقت میں بدلنے کے لیے جواب دہ نہ ہوگی۔ اس وقت چونکہ شمیم احمد شمیم، غازی عبدالرحمان اور علی محمد نائیک کی حکومت ہوگی اس لیے وہ ایک مشکل میں پھنس جائے گی۔ ورنہ خود وزیر خوراک بھی جانتے ہیں کہ دو سال کیا ابھی بیس سال تک بھی یہ ریاست خوراک کے معاملے میں خود کفیل نہ ہوگی۔

دوسرا اہم نکتہ جو یہاں ابھارا گیا ہے وہ ہے شہر سری نگر کے ان چالیس ہزار بچوں کا، جن کے لیے راشن کا کوئی انتظام نہیں، پچھلے کئی سال سے اس بات کا مطالبہ کیا جارہا ہے کہ جن بچوں کو راشن کارڈوں میں درج نہیں کیا گیا ہے، ان کو درج کر کے راشن دیا جائے۔ لیکن حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ میں حیران ہوں کہ ارباب حکومت آخر اس مشکل کو کیسے حل کرنا چاہتے ہیں۔ شہر میں چاول کی درآمد پر پابندی ہے لیکن اس شہر میں چالیس ہزار بچوں کے لیے راشن کا کوئی انتظام نہیں، آخر یہ بچے کھائیں گے کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس حکومت کے اراکین کو پیدا کرتے وقت ان کو کھوپڑیاں تو عطا کر دیں، لیکن اس میں وہ دماغ رکھنا بھول گئے۔ اس لیے اس سیدھے سادھے مسئلے کا ابھی تک حکومت نے کوئی حل یا کوئی جواب پیش نہیں کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کے تئیں اس لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا بھی ایک نفسیاتی جواز ہے اور وہ یہ کہ فیملی پلاننگ شروع ہونے سے بہت پہلے وزیر اعلیٰ

اور وزیر خوراک نے اس پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا اور آج جب کہ ان کے بچے جوان ہو گئے ہیں، وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اور لوگوں کے ہاں ابھی بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ میں وزیر اعلیٰ اور وزیر خوراک سے گذارش کروں گا کہ وہ کم از کم اپنے بچوں کے بچوں کا خیال کر کے شہر سرینگر کے ان چالیس ہزار بچوں کے لیے راشن کا انتظام کریں جو ان کے راج میں بغیر کسی راشن کے ہیں۔ یہ بچے جوان ہوں گے، تو آپ لوگوں کی قبروں پر جا کر احتجاج کریں گے کہ تم ہی وہ قاتل تھے کہ جنہوں نے ہمیں اپنے راج میں راشن سے بھی محروم رکھا۔ صادق صاحب اور ڈی۔ پی صاحب اس بات کا یقین رکھیں کہ بہت جلد اقتدار کی کرسی اُن سے چھن جائے گی۔ انقلاب آ رہا ہے اور یہ چالیس ہزار بچے اس انقلاب کے پیغامبر ہیں۔ آپ ان کو راشن دے کر انقلاب کی آمد میں تاخیر کر سکتے ہیں، لیکن اسے مستقل طور پر ٹال نہیں سکتے، اس لیے کچھ دیر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ریاست میں خوراک کے مسئلے کو دیانت داری سے حل کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

ستمبر ۱۹۶۸ء

”کشمیری پنڈتوں کی حالیہ ایجی ٹیشن نے ہند کشمیر الحاق کی جڑوں کو کمزور کر دیا ہے۔“

کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن پر قانون ساز اسمبلی میں شمیم احمد شمیم کی تقریر:

جناب والا! میں اس موضوع پر سب سے پہلے اس لیے بولنا چاہتا ہوں کہ ایوان کے ذی عزت ممبران کو یہ احساس دلاسکوں کہ جس مسئلے کے متعلق آج ہم اس ایوان میں اپنی رائے ظاہر کرنے والے ہیں، وہ انتہائی نازک، پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کچھ لوگ جذبات کی رو میں بہہ کر جذباتیت کا ایک طوفان کھڑا کریں گے اور اپنی شعلہ بیانی سے صورت حال کو بہتر بنانے کی بجائے اسے مزید بگاڑنے کی صورت پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مرحلے پر خود اپنے آپ کو بھی اور اس ایوان کے ذی عزت ممبران کو بھی یہ مشورہ دوں کہ ہم سب اس بات کا خیال رکھیں، کہ ہم اس وقت جو کچھ یہاں کہنے والے ہیں۔ اس کی گونج صرف اس ایوان کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں ہوگی، اس کا ردِ عمل دراصل اس ایوان کے باہر ہوگا۔ اس لیے میں گذارش کروں گا، کہ ہم سب لوگ بڑی ذمہ داری کے ساتھ، جذبات کی رو میں بہے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کریں اور ہمارے سامنے بنیادی مقصد یہ ہو کہ نازک صورت

حال کو بہتر کیسے بنایا جائے۔

اس مسئلے کے متعلق ابھی تک تین نکتۂ ہائے نگاہ پیش کیے گئے ہیں۔ ایک ہندو کا، دوسرا مسلمان کا اور تیسرا حکومت کا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ایک اہم نکتۂ نگاہ پیش نہیں ہوا ہے اور یہ وہ نکتۂ نگاہ ہے جسے میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور جو میری نگاہوں میں سب سے زیادہ اہم ہے اور جسے ایک نئی (Dimension) کہا جا سکتا ہے اور جس کی طرف اب توجہ دینا بے حد ضروری ہے۔ یہ نکتۂ نظر ایک انسان کا، ایک کشمیری کا نکتۂ نظر ہے۔ اس انسان کا اور اس کشمیری کا جو آج تک اپنے آپ کو صرف کشمیری کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ جس کے ذہن میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہیں تھی، لیکن جو بد قسمتی سے آج سب کچھ بھول کر ہندو اور مسلمان کے زاویۂ نظر سے سوچنے پر مجبور ہے اور اس صورت حال کا پس منظر یہ ہے کہ ہمارے کشمیری پنڈت بھائی کچھ عرصے سے ایجی ٹیشن کر رہے ہیں۔ مسلمانوں میں اس کا شدید ردعمل ہوا ہے اور حکومت اس الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھانے کی فکر میں ہے اور پچھلے تین ہفتوں میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوا، وہ اذیت ناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے اور اس کے تصوّر سے ہی حساس انسانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کرن نگر میں کچھ مکانات جل گئے ہیں۔ چند دکانیں لوٹی گئیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ کشمیر کی تین سو سالہ تاریخ جل گئی، کشمیر کی عزت و آبرو لٹ گئی۔ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا اور ہم کچھ نہ کر سکے۔ یہ کس نے کیا، کیوں کیا، اس بحث میں اُلجھنا بے سود ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان عظیم الشان روایات اور قابل فخر ماضی کے باوجود یہ سب کچھ ہو گیا۔ سب سے آسان بات یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ قصور فلاں آدمی، جماعت یا گروہ کا ہے، ہم یہ کہیں کہ

فلاں آدمی یا جماعت نے زیادتی کی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار ہوگا۔ اجازت دیجیے کہ میں اپنی طرف سے، آپ سب کی طرف سے اس حقیقت کا اعتراف کروں کہ اس جرم میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ اخلاقی طور، ذہنی طور، عملی طور ہم سب مجرم ہیں اور ہم سب نے مل کر اپنے ماضی کے عظیم الشان ورثے کو پھونک دیا ہے۔ جو کچھ پاکستان بیس برسوں میں نہ کرسکا، ہم نے بیس دنوں میں کر دکھایا اور آج کشمیر کے ہندو اور مسلمان میں اتنی گہری خلیج پیدا ہوگئی ہے کہ کبھی پہلے موجود نہ تھی۔ آج یہاں کا ہندو یہ سوچتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور میں یہ سوچنے پر مجبور کہ وہ ہندو ہے۔ اس سے بڑھ کر افسوس ناک صورتِ حال کیا ہوسکتی ہے۔

ہمارے کشمیری پنڈت بھائیوں کو اس حکومت سے کچھ شکایات ہیں۔ مجھے اچھی طرح یہ بات معلوم نہیں کہ ان شکایات کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنی شکایات کے لیے پچھلے تین ہفتوں سے ایجی ٹیشن کر رہے ہیں۔ اس موقعہ پر میں اپنے پنڈت بھائیوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ انہیں حکومت سے شکایات ہیں، ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے بھی ان سے شکایت ہے۔ اپنی شکایات اور اپنے غم و غصّے کے اظہار کے لیے جو طریقہ اور روّیہ اُنہوں نے اختیار کیا ہے وہ یقیناً مستحسن اور قابل تعریف نہیں۔ میں اپنے ان بھائیوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس حکومت سے کِسے شکایت نہیں۔ یہاں کی اکثریت کو بھی اس حکومت سے سخت شکایات ہیں۔ پھر صرف کشمیری پنڈت بھائیوں کا اپنی شکایات کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور پھر ان کے ازالے کے لیے اس شدت کے ساتھ ایجی ٹیشن کرنا کہاں کا انصاف ہے؟۔ آیئے یہ دیکھیں کہ پنڈت بھائیوں کی شکایت کیا ہے اور اس میں کہاں تک

معقولیت اور استدلال ہے۔ موجودہ ایجی ٹیشن کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک نوجوان پنڈت لڑکی نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان سے شادی کر لی اور بظاہر یہ اس شہر میں کوئی اس قسم کا پہلا واقع نہیں۔ اس قسم کی شادیاں ہوتی آئی ہیں۔ مسلمان لڑکیون نے ہندوؤں سے ہی نہیں، سکھوں اور عیسائیوں سے بھی شادی کر لی ہے اور بظاہر اس معمولی سے نجی واقعے پر ایجی ٹیشن کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن پنڈت بھائیوں کا کہنا ہے کہ یہ لڑکی نابالغ تھی اور اسے ورغلایا گیا ہے اس کے بعد انہیں یہ شکایت کہ پولیس نے لڑکی کی ماں کی شکایت پر جو کاروائی کی وہ ناجائز تھی اور پولیس کو لڑکی کے بالغ یا نابالغ ہونے کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اُسے یہ معاملہ عدالت کے سپرد کر دینا چاہئے تھا۔ اگر شکایت صرف اتنی سی ہے تو مجھے اس میں خاصی معقولیت نظر آتی ہے اور قانون کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے مجھے ذاتی طور اس استدلال سے اتفاق ہے اور اگر پنڈت بھائیوں نے پولیس کے طرز عمل پر اعتراض کیا تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن پولیس کی اس حماقت، بے ضابطگی یا دھاندلی کے خلاف مذہبی سطح پر ایک بھرپور ایجی ٹیشن چلانا میری سمجھ سے باہر ہے اور اس مرحلے پر میں ایجی ٹیشن چلانے والوں سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا پولیس نے پہلی مرتبہ اس قسم کی بے ضابطگی کی ہے؟ کیا اس سے پہلے ہماری پولیس اس سے بھی زیادہ دھاندلیاں روا نہیں رکھ چکی ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ یہی پولیس جو قاتلوں کا سراغ لگانے پر مامور ہے خود قتل کرتی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ یہی پولیس جس کا فرض چوروں کا سراغ لگانا ہوتا ہے رات کے اندھیرنے میں خود چوری کرتی ہے۔ ایسے بھی واقعات موجود ہیں جب پولیس نے حوالات میں بند قیدیوں کو قتل کر دیا ہے۔ غرض کوئی ایسی بے ضابطگی یا کوئی ایسا جرم نہیں جس

کا ارتکاب ہماری پولیس نہ کرتی ہو۔ جو کچھ پرمیشوری کے سلسلے میں ہوا اس سے پہلے یہی کچھ کسی زینہ، کسی فاطمہ، کسی راجہ اور کسی پریم لتا کے ساتھ بھی ہوا ہے لیکن ہمارے بھائیوں نے آج سے پہلے پولیس کی بے ضابطگی کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اپنی اس شکایت کا ازالہ کرنے کے لیے پنڈت بھائیوں نے وہی کیا جو کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی اُنہوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، تاکہ اس بات کا پتہ چل سکے کہ لڑکی بالغ یا نابالغ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پولیس کی بے ایمانی اور بے ضابطگی کا بھی اندازہ لگ سکے۔ لیکن عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کے بعد بھی اس لڑکی کی واپسی کے بارے میں ایجی ٹیشن چلانا مجھے بتایئے کہاں کی عقل مندی ہے۔ میں نے جیسا کہ ابھی کہا ہے کہ میں اس حد تک اپنے پنڈت بھائیوں سے متفق ہوں کہ پولیس کو خود فیصلہ کرنے کا اختیار نہ تھا، اسے معاملہ عدالت کے سپرد کر دینا چاہئے تھا لیکن اب جب کہ پولیس نے یہ حماقت کی ہے۔ اب اس کا علاج کیا ہے۔ انتظامیہ کے سربراہ غلام محمد صادق نے اسی ایوان میں آپ کو پیش کش کی تھی کہ آپ تحقیقاتی ایجنسی کے خلاف اپنی شکایات پیش کریں۔ ان کی تحقیقات کی جائے گی اور اگر شکایت صحیح ثابت ہوئی تو ذمہ دار لوگوں کے خلاف کاروائی کی جائے گی۔ اس مرحلے پر یہی تو کیا جا سکتا ہے۔ آپ بتایئے کہ اس سے زیادہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی خواہش ہے کہ ان مجرم افسروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے ...... ہم آپ کی تسلی کے لیے یہ بھی کرتے، میں صادق صاحب سے گذارش کرتا، آپ کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لیے ان افسروں کا قتل کر دیا جائے لیکن ہمارے سروں پر ہندوستانی آئین اور رینبر پینل کوڈ کی تلوار بھی تو لٹک رہی ہے اور ان کتابوں کی رو سے ہر سزا

سے پہلے جرم کا پایہ ثبوت تک پہنچنا بے حد ضروری ہے اور پھر ہر مجرم کو اپنی صفائی کا موقعہ دینا بھی ضروری ہے اور پھر ہر جرم کے لیے سزا کا معیار اور معیاد مقرر ہے۔ کسی مجرم کو اس مقررہ سزا سے زیادہ سزا نہیں دی جا سکتی۔ آپ نے خود عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے اور مناسب یہ ہے کہ اب آپ عدالت کے فیصلے کا انتظار کریں۔ کیونکہ عدالتی فیصلوں کے لیے شہادت، ثبوت، بیانات، بحث و استدلال کے مرحلوں سے گزرنا ضروری ہے۔ اس میں کچھ وقت لگے گا ہی، اس لیے پنڈت بھائیوں کو صبر و تحمل سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن میں ان کی موجودہ روش کو دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ ان کی عقلیت کا توازن اور ان کی روشن دماغی کہاں گئی ہے۔ وہ اپنی روایتی سنجیدگی کو چھوڑ کر اس ہنگامہ آرائی پر کیوں اتر آئے ہیں۔ غالباً انہیں اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہے کہ اپنی اس ضد اور ہٹ دھرمی سے انہوں نے زندگی کی ان قدروں کو کتنا نقصان پہنچایا ہے جن کی آبیاری میں ہمارے شاعروں، فن کاروں اور بزرگوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے، اور جو روایات ہمیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی تھیں، اور جن کی حفاظت کرنا ہمارا اخلاقی فرض تھا، وہ کس درجہ مجروح اور پامال ہو کر رہ گئی ہیں بلکہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہم اس معمولی سے واقعے کی بنیاد پر اپنے ہاتھوں اپنا سارا اثاثہ لٹا دیں! پچھلے پندرہ بیس دنوں کے دوران ہمارے ماضی کا شاندار تاج محل بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔ میں اپنے پنڈت بھائیوں کے سامنے اپنا دامن پھیلا کر ان سے بھیگ مانگتا ہوں کہ وہ عقل، توازن اور سنجیدگی سے کام لے کر اسے مزید نقصان پہنچانے سے باز رہیں۔ یہ بڑی غریب ریاست ہے۔ ہمارے پاس آرائش و زیبائش کا زیادہ سامان بھی نہیں، لیکن ہمارے پاس ایک طرۂ امتیاز تھا، جس کی بناء پر ساری دنیا میں

ہمارا نام عزت سے لیا جاتا تھا اور وہ ہے ہمارا فرقہ ورانہ اتحاد، بھائی چارہ اور رواداری، اُس وقت بھی جب کہ سارے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی، شعلے ہمارے سروں کے اوپر سے بھی گزر جاتے تھے لیکن ہم نے صلح وآشتی اور فرقہ ورانہ بھائی چارے کی روایات کو برقرار رکھا۔ لیکن آج یہ سب کچھ خطرے میں ہے۔ اسے بہت شدید نقصان پہنچا ہے۔ اب اس کا وجود خطرے میں ہے۔ اسے بچانے کے لیے ہم سب کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے کہ نابالغ لڑکی کے مسئلے کے علاوہ بھی کشمیری پنڈت بھائیوں کو کئی شکایات ہیں اور ان میں سب سے اہم شکایت یہ کہ انہیں برابر کے حقوق نہیں دیئے جارہے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں انہیں اقلیتوں کے تحفظات حاصل نہیں ہیں۔ میں نہیں جانتا اس میں کہاں تک صداقت ہے اور اصل صورتِ حال کیا ہے۔ لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ایسا ہوسکتا ہے اور یہ مان کر میں ان بھائیوں سے پھر یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ملک بھر میں صرف ایک ہی اقلیت کشمیری پنڈت رہتے ہیں۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کو بھی اپنے حقوق نہیں دیئے جارہے ہیں، کیا وہ جانتے ہیں کہ اس ملک کی کوئی اقلیت چاہے وہ سکھ ہوں، عیسائی ہوں یا مسلمان، اقلیتوں کے تئیں حکومت کی پالیسی سے مطمئن نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ملک میں ایک سیکولر آئین ہے۔ جس کی رو سے ہندوستان کے ہر شہری کو کچھ بنیادی حقوق اور ضمانتیں حاصل ہیں لیکن میں اس موقع پر اس کتابی دستور کی بات نہیں کررہا ہوں، اُن تلخ حقیقتوں کا ذکر کررہا ہوں جو ہمارے اردگرد بکھری پڑی ہیں۔ اُردو کا ہی مسئلہ لیجئے۔ ہندوستان کی اس مشترکہ میراث کو ایک اقلیت کے ساتھ منسوب کرکے آج اس کے نام پر بہار

میں قتل وخون کا بازار گرم ہے۔ اگر میرے پنڈت بھائیوں کے لیے ایک لڑکی کی شادی کا مسئلہ اتنی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے تو وہ اندازہ کریں کہ بہار کے قتل عام کے بعد مسلمان کی ذہنی کیفیت کیا ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں ان بھائیوں سے گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مسئلہ ملک میں اقلیتوں کے ساتھ ناروا اور ناجائز سلوک کا ہے تو میں بھی اُن کے ساتھ ہوں۔ میں ہی نہیں ہندوستان کی تمام اقلیتیں اور بالخصوص مسلمان انہیں اپنا رہنما ماننے کے لیے تیار ہیں۔ ملک کی بھاری اکثریت کو اُن کے مؤقف کے ساتھ ہمدردی ہوگی اور اس طرح ان کا دائرہ عمل بھی وسیع ہوگا۔ لیکن ان کے رویے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں صرف وادی کے چار دیواری میں ہی اقلیتوں کے حقوق اور تحفظات سے دلچسپی ہے اور ملک بھر کی اقلیتوں کے مسائل سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں۔ میرے پنڈت بھائیوں کو اگر ریاستی حکومت سے شکوے اور شکایات ہیں تو میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں کی اکثریت کو ان سے بھی زیادہ شکایات ہیں۔ پنڈت صاحبان کو یہ شکایت ہے کہ انہیں انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج میں دو چار سیٹیں کم ملتی ہیں، مسلمانوں کو شکایت ہے کہ انہیں پچھلے بیس سال میں ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمیں ٹیکنکل کالجوں میں برابر کا حصہ دیجیے۔ مسلمان کہتا ہے کہ میرے دل میں بھی کچھ خواہشیں ہیں، ان کو پورا کیجیے، حکومت پنڈت بھائیوں سے کچھ سیٹوں کی خیرات لے کر مسلمانوں کا دل بہلاتی ہے کہ وہ ان کھلونوں سے کھیلتے رہیں تاکہ وہ اپنے بنیادی حقوق پر زور نہ دیں اور میرے پنڈت بھائیوں کو آج یہ خیرات بھی ناگوار گزر رہی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے بھائیوں سے گذارش کروں کہ اس خیرات اور امتیاز کا بھی ایک تاریخی

پس منظر اور جواز ہے۔ مجھے اپنے پنڈت بھائیوں کی ذہانت پر مکمل اعتماد ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر انہوں نے خود اپنے آپ سے بھی اس امتیاز کی وجہ پوچھی ہوتی تو وہ یقیناً مطمئن ہو گئے ہوتے۔ اس امتیاز کی داغ بیل آج نہیں، آج سے ایک سو سال پہلے پڑی ہے۔ جب ظالم اور جابر حکمرانوں نے اپنی رعایا کے چند طبقوں کو اپنی عنایات اور نوازشات کے لیے منتخب کیا اور اکثریت کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ہماری سماجی، ذہنی، تعلیمی اور اقتصادی زندگی میں ایک ناہمواری پیدا ہو گئی۔ ایک طبقہ عنایات اور نوازشات کے سائے میں آگے بڑھتا گیا اور اکثریت اس سفر میں بہت پیچھے رہ گئی اور اس طرح زندگی کے سفر میں کچھ بہت گہری کھائیاں پیدا ہو گئیں اور راستے میں جگہ جگہ نشیب بن گئے۔ آزادی کے بعد جب اس ملک نے اپنی ترقی کے لیے ایک نئے سفر کا آغاز کیا تو ان گہری کھائیوں اور نشیبوں کو ہموار بنانے کے لیے دو چار میڈیکل اور انجینئرنگ سیٹوں کی خیرات ضروری سمجھی گئی تاکہ ان ناہمواریوں کو ہموار بنا کر ترقی کی دوڑ میں سب لوگ ایک ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر سکیں۔

اس تاریخی پس منظر کو میرے بھائیوں نے اپنے ذہن میں رکھا ہوتا تو نہ انہیں اس درجہ غصہ آتا اور نہ وہ یوں آپے سے باہر ہو کر ڈیڑھ انچ کی الگ مسجد بناتے۔ اے کاش کہ انہیں آج بھی اندازہ ہوتا کہ ان کی ناعاقبت اندیشی نے کس المناک صورت حال کو جنم دیا ہے اور جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے جو اس سارے ہنگامے کی اصلی وجہ ہو نہ ہو، اس کا نقطہ آغاز ضروری ہے۔ میں اس لڑکی سے ملا ہوں۔ میں اس ایوان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ صحیح واقعات کیا ہیں اور صحیح واقعات جاننے

کی کوشش میں وہ ایک اہم کڑی ہے۔ اس لیے میں نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس سے ملنے کی صورت پیدا کر لی اور میں نے اس ڈرامے کی بنیادی کردار کی زبانی کچھ ایسی معلومات حاصل کی ہیں جو بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے اور اس پر کسی قسم کا دباؤ استعمال نہیں ہوا ہے اور نہ کسی قسم کی لالچ یا ترغیب دی گئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے اپنی مرضی سے غلام رسول کنٹھ سے شادی کی ہے اور میں اپنے اس فیصلے پر نادم نہیں ہوں۔ میں نے اس لڑکی سے کہا کہ اے نادان لڑکی، کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری اس معصوم سی حرکت سے شہر کے خرمنِ امن میں آگ لگ چکی ہے اور کیا یہ مناسب نہیں کہ تم اپنا فیصلہ بدل کر واپس اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ۔ تاکہ فرقہ وارانہ اتحاد کی جلتی ہوئی میراث محفوظ رہ سکے۔ لیکن وہ بڑی ضدی اور ہٹ دھرم ثابت ہوئی اس نے کہا میں واپس جانے کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے مجھے یہ بتایئے کہ ہندوستانی آئین کی کس دفعہ کی رو سے مذہب تبدیل کرنا جرم ہے اور رنبیر پینل کوڈ میں درج کس قانون کی رو سے اپنی مرضی سے شادی کرنا قابل تعزیر ہے۔ جس کی رو سے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ مختصر الفاظ میں پروین اختر اس ایوان کے ذی عزت ممبروں سے یہ پوچھنا چاہتی ہے کہ کیا محبت کرنا جرم ہے اور میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کبھی محبت کی ہے؟ کیا آپ خود کبھی اس طوفان سے سے گذرے ہیں؟...... اب جب کہ اس لڑکی کی محبت جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق ایک عدالت اپنا فیصلہ صادر کرنے والی ہے۔ تو اس بات کی توقع رکھنا یا اس کا مطالبہ کرنا کہ صادق صاحب، ڈی، پی صاحب یا قاسم صاحب یا شمیم صاحب مداخلت کر کے عدالت سے کوئی خاص حکم جاری کروائیں، میرے

خیال میں انتہائی نامناسب ہے۔ہم سب کو ذہنی طور اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرنا ہوگا کہ عدالت کا فیصلہ جو کچھ بھی ہو، ہم اُسے خوشی خوشی تسلیم کریں گے، اور مجھے یہ کہتے ہوئی مسّرت ہو رہی ہے کہ صادق صاحب نے ابتدا سے لے کر اب تک یہی موقف پیش کیا ہے اور آج بھی انہوں نے اس کو دہرایا ہے۔چونکہ کشمیری پنڈت بھائیوں نے ہی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے، اس لیے اخلاق، شرافت، انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم سب انتظار کریں، کہ قانون کیا فیصلہ صادر کرتا ہے، اور اگر ہم میں سے کوئی طبقہ یا کوئی جماعت عدالت کو نظر انداز کر کے اپنی من مانی کرنا چاہے تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگی کہ ہماری مسجدیں بھی جل جائیں گی اور تمہارے خوبصورت مندر بھی ۔ کیونکہ پچھلے آٹھ دس دنوں میں جو کچھ ہوا، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اگلے آٹھ دس دنوں میں کیا ہوگا۔صورت حال انتہائی نازک ہے اور میں اس انتہائی نازک صورت حال کے انتہائی نازک پہلوؤں پر بحث کر کے آگ سے نہیں کھیلوں گا ۔لیکن بعض باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ریاست کے اس اذیت ناک ماحول میں کچھ قدریں جھلس کر رہ گئی ہے۔اعتماد اور اعتقاد کے شیشے چکنا چور ہو گئے ہیں۔پولیس جو ہماری جان و مال کی حفاظت کے لیے مامور ہے، پر سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔آج چاروں طرف سے پولیس کی ایجنسی کے خلاف شکایات موصول ہو رہی ہے اور یہ موجودہ صورت حال کا سب سے المناک پہلو ہے ۔ میں صادق صاحب کی وساطت سے شریمتی اندرا گاندھی اور دیگر مرکزی لیڈروں تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ پچھلے بیس دنوں میں الحاق کی جڑیں کمزور ہوگئی ہیں اور آج اس کی بنیادیں ہلتی نظر آ رہی ہیں ۔ وہ اثاثہ جس کے سہارے

ہم نے ہندوستان سے الحاق کیا تھا، جو ہمیں اپنے اسلاف سے ملا تھا، اور جس کی ہم نے دل و جان سے حفاظت کی تھی، آج لٹتا جا رہا ہے۔ شمیم کی بات رہنے دیجیے، کہ وہ ان طوفانوں میں بھی اپنے اعتقادات کا تحفظ کر سکتا ہے، لیکن عام آدمی کے دل سے ہندوستان کی عظمت پر وشواس اٹھتا جا رہا ہے اور اس ایجی ٹیشن نے ایسے گہرے زخم دیئے ہیں کہ ان کو بھرنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے، جتنی ایجی ٹیشن میں صرف ہوئی ہے۔ ہمارا دھرم، ہمارا مذہب اور ہمارا طریق زندگی چند تاریخی حادثوں کی پیداوار ہے اور ہمیں ان تاریخی حادثوں کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔ میرا مسلمان ہونا، آپ کا ہندو ہونا، کسی کا عیسائی ہونا، سب ہماری پیدائش کے حادثے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے باہمی نفرت، تعصّب یا بیزاری کا سوال کیوں کر پیدا ہو۔ مجھے اسلام کا کس درجہ مطالعہ ہے؟ میں اسلام کے اصولوں پر کاربند ہوں یا نہیں؟ یہ الگ سوال ہے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ مسلمان ہونے کے ناطے مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ آج ہندو اور مسلمان کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہے، جو آج سے پہلے کبھی نہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان جو کچھ بیس سالوں میں نہ کر سکا ہم نے بیس دنوں میں کر دکھایا۔ یہ آگ جس کے شعلوں سے آج کچھ چہرے جھلس گئے ہیں، جس کی تمازت اور وحدت سے ہماری عقل اور ہمارا توازن بگڑ گیا ہے، یہ آگ کچھ دنوں بعد بجھ جائے گی اور ہم ایک دوسرے سے مل جائیں گے لیکن اس دور کی تلخ یادیں بہت دنوں تک ہمارا ساتھ دیں گی۔ اس لیے اس بات کا خیال رکھیے کہ اس جذباتی ہیجان اور دیوانگی کے دور میں آپ

کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل نہ پائے ، کہ کل اپنے دوست سے آنکھیں ملاتے ہوئے آپ کو شرمندگی اور ندامت کا احساس ہو۔کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے کہ آپ کو تمام عمر پچھتانا پڑے۔میں آخر میں صادق صاحب سے گذارش کروں گا کہ ان کے لیے یہ سارا مسئلہ ایک کڑے امتحان کی حیثیت رکھتا ہے۔اگر یہ صرف ایک لڑکی کی شادی کا مسئلہ ہوتا تو یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہ ہوتا۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک اصول Involve ہے۔اس اصول کا تعلق ایک طرف آزادیٔ ضمیر سے ہے، تو دوسری طرف ہمارے عدلیہ کے وقار اور اس کی شہرت سے، صادق صاحب پر اور ان کی حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عدلیہ کے وقار کو بلند کرنے میں سب سے زیادہ کوشاں رہیں۔وہ اگر عدلیہ کا وقار بلند کرتے ہیں تو خود ان کے وقار میں اضافہ ہوگا اور اس کے برعکس اگر اُنہوں نے عدلیہ کے احترام کو کم کرنے کی کوشش کی تو ان کا، ان کی حکومت کا، ہندوستان کی جمہوریت کا اور جواہر لعل نہرو کے آدرشوں کا احترام بھی کم ہوگا۔ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس قسم کی ایک ایجی ٹیشن جموں کی پرجا پریشد نے بھی کچھ سال پہلے شروع کی تھی، اس ایجی ٹیشن سے پیدا شدہ طوفان میں ہمارا سب سے بلند قامت اور عظیم المرتبت رہنما شیخ محمد عبداللہ اس طرح بہہ گیا، کہ آج تک تاریخ اس کی تلاش میں پھر رہی ہے۔لیکن ابھی تک تاریخ کو اپنی منزل نہیں مل رہی ہے۔آج کی ایجی ٹیشن میں ایسے ایسے اصول اور آدرش Involve ہیں کہ اگر ان اصولوں کو پامال کرنے یا نظر انداز کرنے کی کوشش ہوئی تو اندرا جی کا سنگھاسن بھی ڈولے گا اور صادق سرکار کی بنیادیں بھی ہل جائیں گی۔

ستمبر ۱۹۶۷ء

◆◆◆

24 رستمبر 1968ء کو بجلی فیس میں اضافہ کے لیے ترمیمی بل پیش کرنے پر آزاد ممبر شمیم احمد شمیمؔ کی تقریر

''وزیر مملکت نے اس بل کو اس ایوان میں پیش کئے جانے کی ایک وجہ یہ بتائی ہے کہ پچھلے سال وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر میں ریاست کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ اقدامات کرنے کا وعدہ کیا تھا اور آج کا یہ بل اسی غرض کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ ہم وزیر خزانہ کی تقریر اور ان کے وعدوں کو صحیفۂ آسمانی نہیں سمجھتے کہ ان میں کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے پاس اس کی معقولیت پر اعتبار کرنے کی کوئی بھی وجہ نہیں کہ یہ اسی وزیر خزانہ کی تصنیف ہے جس کی غلط کار پالیسیوں نے اس ریاست کو اقتصادی اور معاشی تباہی کی اس سرحد پر کھڑا کر دیا ہے کہ جہاں گہرے اندھیرے کے سوا کچھ اور نہیں دکھائی دیتا۔ کیا وزیر خزانہ نے وہ تمام وعدے پورے کر دئے ہیں جو انہوں نے اس سے پہلے کی بجٹ تقریروں میں اس ریاست کے عوام سے کئے تھے؟ اگر نہیں تو پچھلے سال کی بجٹ تقریر میں کئے گئے وعدے کو پورا کرنے کی فکر انہیں کیوں دامنِ گیر ہے۔

گونئی صاحب نے کہا کی بجلی فیس میں معمولی سا اضافہ ہوگا۔ یعنی دو پیسے سے بڑھا کر چار پیسے یونٹ کر دیا جائے گا۔ گونئی صاحب کی نظروں میں ۵۰ رفی صد کا اضافہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن جن غریبوں اور مفلسوں پر اسکا بوجھ پڑے گا، ان کی کمر پہلے ہی آپ کے وزیر خزانہ کی نامراد اقتصادی پالیسیوں سے ٹوٹ چکی ہے۔ حکومت کو اگر واقعی ریاست کی آمدن میں اضافہ کرنا مقصود ہے تو کیا یہ مناسب نہیں کی غریب عوام پر نت نئے ٹیکس عائد کرنے کی بجائے وہ اپنے فضول اور بے

ہودہ اخراجات کم کرے۔ فیلڈ سروے آرگنائزیشن پر ۹ /لاکھ روپے کی رقم کیوں
صَرف ہو رہی ہے صرف اس لیے کہ سیاسی مخالفین پر قاتلانہ حملے منظّم کئے جائیں۔
محکمہ، اطلاعات اور سوشل ایجوکیشن پر لاکھوں روپیہ برباد ہو رہا ہے۔ پولیس کے
اخراجات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسی ایسی اسامیاں وجود میں لائی
جارہی ہیں، کہ جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ حکومت ان تمام اخراجات میں کمی کر کے
غریب لوگوں کو مصیبت سے نجات دے سکتی ہے۔ خود حکومت نے اس بات کا
اعتراف کیا ہے کہ بجلی کے ریونیو میں اس لیے کمی ہو رہی ہے کہ بجلی کے استعمال اور
فیس کی وصولی دونوں میں ہی Leakages ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان
Leakages کو روک دیا جائے لیکن بد دیانت حکومت کے بد دیانت اہل
کاران Leakages کو روکنے کی بجائے غریب عوام کو اپنی نااہلیت اور بد دیانتی
کی سزا بھگتنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ ستم ظریفی کشمیر میں ہی روا رکھی جاتی ہے"۔

۲۴ /ستمبر ۶۸ء کو شری گردھاری لعل ڈوگرہ نے ممبرانِ قانون ساز یہ کو مفت ٹرانسپورٹ فراہم کرنے کی غرض ان کی تنخواہوں اور الاؤنس کے قانون میں ترمیم کے لیے پیش کی گئی بل کے خلاف اٹھنے والی ایک ہی آواز شمیم احمد شمیم نے کہا:

"ابھی ابھی اس ایوان میں بجلی فیس میں اضافے کا بل پیش ہوا، تو میں نے
اور حزب مخالف کے دیگر دوستوں نے صرف اس بنیاد پر اس کی شدید مخالفت کی
کہ اس کا بوجھ اس ریاست کے غریب عوام پر پڑے گا۔ اب ممبران کو ٹرانسپورٹ
کی مفت سہولیات پہنچانے کا بل پیش ہوا تو میں یہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہوں کہ اس
کی مخالفت کروں۔ میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اپنے فائدے

کی خاطر ایک ایسے بل کی حمایت کروں کہ جس کا بوجھ بھی بالآخر اس ریاست کے غریب عوام ہی کو اٹھانا پڑے گا۔ ممبرانِ اسمبلی کو چار سو روپے کا مشاہرہ ملتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس دور میں چار سو روپے کی کوئی حقیقت نہیں لیکن ممبرانِ اسمبلی کی کارکردگی کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ چار سو روپے بھی زیادہ ہیں۔ ہم میں سے کتنے ممبران نے اپنے اپنے حلقۂ انتخاب کے سلسلے میں وہ فرائض انجام دئے ہیں جن کے لیے ہم منتخب ہو کر آئے ہیں۔ میں اور لوگوں کے بارے میں نہیں جانتا لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں پچھلے دو سال سے اپنے حلقۂ انتخاب کے لیے کوئی ایسا کام نہیں کر پایا ہوں کہ میں مزید سہولیات اور مراعات کا مطالبہ کروں۔ ہم لوگ اپنے حلقۂ انتخاب کے لیے کوئی کام کیوں نہیں کر پائے یہ الگ سوال ہے اور اس کا بھی ایک پسِ منظر ہے لیکن یہ بنیادی بات اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ہم کارکردگی کے اعتبار سے اس چار سو روپے کے مشاہرے کے بھی حقدار نہیں۔

بل کے اغراض و مقاصد میں کہا گیا ہے کہ اس کا مقصد ممبران کو ریاست کے مختلف حصوں میں ترقیاتی کاموں کی دیکھ بھال کرنے کا موقعہ دینا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب سے یہ حکومت برسرِ اقتدار آئی ہے ترقیاتی کام ہو کہاں رہے ہیں جو ہم دیکھنے جائیں۔ آپ ممبران کو سہولیت دینا چاہیں، تو انہیں یہ سہولیت دیجئے کہ وہ جب اپنے اپنے حلقۂ انتخاب میں جائیں تو ان پر سرکاری افسروں اور غنڈوں کی مدد سے قاتلانہ حملے نہ کروائے جائیں۔ میرے بارے میں یہ ایوان پہلے ہی سن چکا ہے کہ مجھ پر میرے اپنے حلقۂ انتخاب میں ایک ڈپٹی منسٹر کی ایما سے قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں چیف منسٹر صاحب سے گذارش کرونگا کہ مفت ٹرانسپورٹ مہیا کرنے کے بجائے اگر وہ ہماری سلامتی کا ہی انتظام کر دیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ میں ممبرانِ اسمبلی کو مفت ٹرانسپورٹ مہیا کرنے کے اس ترمیمی بل کی

پرزور مخالفت کرتا ہوں''۔

۲۵ر ستمبر ۶۸ء کو وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق نے جائدادِ منقولہ و غیر منقولہ کو سرکاری تحویل میں لئے جانے سے متعلق ایک بل پیش کیا۔

نیشنل کانفرنس کے سردار سریندر سنگھ اور جن سنگھ کے شیو چرن گپتا نے اس بل کو ایوان کی ایک منتخبہ کمیٹی کے سُپرد کئے جانے کی تحریکیں پیش کیں۔ آزاد ممبر شمیم احمد شمیم نے ان تحریکوں کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس بل کا تعلق چونکہ عام شہریوں کے سب سے اہم بنیادی حق ___ جائداد ___ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اسے عجلت میں پاس کرنا مناسب نہ ہوگا اور اسے ایک منتخبہ کمیٹی کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ کانگریس پارٹی کے چیف وہپ میر غلام محمد (پونچھی) نے بھی بل کو منتخبہ کمیٹی کے سپرد کئے جانے کی حمایت کی۔ وزیر قانون شری گردھاری لعل ڈوگرہ نے منتخبہ کمیٹی کی تحریک کی پرزور مخالفت کی اور کہا کی اس بل کو جتنی جلدی پاس کیا جائے، عوام کو اسی قدر فائدہ ہوگا۔ حزب مخالف کی طرف سے پرزور تقریروں اور دلائل کے باوجود حکومت نے بل کو سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کئے جانے کی تحاریک نامنظور کروائیں اور کانگریسی ممبران کو ہدایت دی گئی کہ وہ بل کو پاس کرنے کے لیے ایوان میں موجود رہیں۔

جب بل پاس کرنے کی تحریک پیش ہوئی تو آزاد ممبر شمیم صاحب نے اس کی پرزور مخالفت کرتے ہوئے کہا:

''ابھی ابھی اس ایوان میں ایک ایسا مظاہرہ دیکھنے میں آیا ہے جو یقیناً جمہوریت کی قابلِ فخر روایات کے منافی ہے۔ جمہوری اداروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہاں بحث و تمحیص، غور و فکر، دلائل اور براہین سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس ایوان میں حکومت کا رویہ دیکھ کر مجھے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کو حیرت ہوتی ہے کہ اکثریت کے بل بوتے پر حکومت نہ معقولیت کا

پاس کرتی ہے اور نہ اقلیت کے دلائل سے متاثر ہوتی ہے۔ اس بل کے سلسلے میں ہم نے صرف اتنی گذارش کی تھی کی اس کو پاس کرنے سے پہلے ایک سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کردیا جائے تاکہ جائیداد سے متعلق ایسے قانون کو پورے غور وخوض کے بعد پاس کیا جاسکے۔ اس مسودہ قانون سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ متاثر ہونگے، اسلئے ضروری ہے کہ اس کو جلدی میں پاس کرنے کی بجائے ممبران کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اس مطالبے کی معقولیت کا اُکثر کانگریسی ممبران کو بھی اعتراف ہے اور کانگریس پارٹی کے چیف وہپ نے کھل کر اس کی حمایت کی، بہت سے دوسرے کانگریسی ممبران نے بھی ہمارے اس مطالبے سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے لیکن ڈوگرہ صاحب اور صادق صاحب تو کانگریسی ممبران کو اپنا ملازم سمجھتے ہیں اس لیے ان کی خواہشات اور جذبات کا احترام کرنے کے بجائے وہ انہیں حکم دیتے ہیں کہ یہ بل پاس کرو۔ (اس مرحلے پر کئی کانگریسی ممبران نے ملازم لفظ پر احتجاج کیا)۔ یہ طریق کار یقیناً جمہوری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ فاشزم کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ہٹلر نے بھی جرمنی میں جمہوریت کے نام پر فاشزم کو رواج دیا تھا اور آج صادق صاحب کی حکومت بھی اسی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ اکثریت کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ معقولیت اور اقلیت کی آواز پر کوئی کان نہیں دھرنا چاہیے لیکن ڈوگرہ صاحب کی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے اس میں انہوں نے صرف یہی سیکھا ہے کہ جائز اور ناجائز قانون پاس کروالو۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس ایوان میں دلائل اور براہین سے حکومت کے اراکین کو سمجھانے سے کوئی ٹھوس فائدہ حاصل ہوگا۔ اراکین حکومت پہلے سے ہی طے کرتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے اور اس کے بعد اپنی ''ٹھوس اکثریت'' کا سہارا لے کر اپنا مقصد پورا کرلیتے ہیں۔ ایسی اکثریت کے لیے Brute Majority کی اصطلاح ایجاد ہوئی ہے اور اس Brutality کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے میں اس ایوان سے واک آوٹ کرتا ہوں۔ ◆◆◆

بددیانت وزیر کا بددیانت بجٹ

جناب والا! میری خواہش تھی کہ اس وقت جبکہ میں بجٹ پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں، قائد ایوان بھی یہاں تشریف فرما ہوتے۔ ان کی موجودگی سے مجھے یہ احساس رہتا ہے کہ میں ایسے شخص سے مخاطب ہوں جو میری ہی طرح الیکشن لڑ کر اس ایوان میں آیا ہے، مجھے افسوس ہے کہ بلا مقابلہ اور چور دروازے سے آئے ہوئے اُن ''معزز'' ممبران سے براہ راست مخاطب ہونے میں مجھے کچھ تامل ہوتا ہے۔ جو اس ایوان کی ''زینت'' بنے ہوئے ہیں۔

جہاں تک سالِ رواں کے لئے پیش کردہ بجٹ کا تعلق ہے، میں ایک جملے میں اس کے متعلق اپنی رائے بیان کروں گا۔ یہ ایک بددیانت بجٹ ہے اور وزیر خزانہ شری درگا پرشاد در سے مجھے ایسے ہی بجٹ کی توقع تھی، یہ حکومت کی خوش قسمتی ہے کہ آمدنی اور اخراجات کے اس گوشوارے کا مطالعہ ایک مشکل اور تکنیکی معاملہ ہے۔ عام آدمی اس کی جزئیات، اسکی پیچیدگیوں اور اعداد و شمار کے ہیر پھیر کو سمجھ نہیں سکتا۔ ورنہ میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ اگر عوام بجٹ کے اس فریب کو سمجھ پائیں، تو انہیں بغاوت کرنے اور اس حکومت کا تختہ الٹنے کی ترغیب دینے کے لئے اس سے زیادہ موثر دستاویز کوئی دوسری نہیں ہو

سکتی۔ یہ دستاویز اس بات کی حتمی شہادت ہے کہ کس طرح ریاستی سرکار مرکز سے کروڑوں روپے امداد اور قرضہ لے کر برباد کر رہی ہے۔ یہ بجٹ اس بات کا اعلان ہے کہ ہمارے حکمران دونوں ہاتھوں سے ہندوستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی لوٹ رہے ہیں اور ریاستی عوام کے نام پر حکمران طبقہ تمام ملک کے مفادات کے ساتھ غداری کر رہا ہے۔ بجٹ کے دلفریب نام سے عوام کے ساتھ جو فریب ہو رہا ہے، اس پر میں اس وقت مزید کچھ نہیں کہنا چاہوں گا کیونکہ مجھ سے قبل قاسم صاحب اور بعض دیگر دوستوں نے بجٹ پر بحث کے دوران کچھ ایسے سیاسی مسائل اور موضوعات کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق میں اپنی رائے اور ردِ عمل ظاہر کرنا چاہوں گا۔

قاسم صاحب نے اور بعض دیگر دوستوں نے اس معزز ایوان میں شیخ صاحب کا بھی ذکر خیر کیا ہے۔ ان کے سیاسی موقف، ان کی حالیہ تقاریر اور بیانات پر نکتہ چینی کی گئی ہے میں نہ کبھی شیخ صاحب کا وکیل تھا، نہ اب ہوں اور نہ شاید آئیندہ ہوں گا۔ اس لئے میں ان کی صفائی پیش کرنے کے بجائے اس معزز ایوان کے ممبروں سے یہ جاننا چاہوں گا، کہ شیخ صاحب کی نکتہ چینی کرنے سے ہمارا کون سا مقصد حل ہوگا؟ اس سے کون انکار کرے گا کہ وہ ہماری تحریک حریت کے سب سے بلند قامت اور بلند مرتبہ رہنما ہیں۔ ان کی قیادت میں ہم نے جنگ آزادی کا آغاز کیا اور ان کے دوش بدوش ہم نے اس کٹھن سفر کی کئی منزلیں طے کیں۔ آج اگر وہ ہم سے ناراض ہیں، آج اگر انہیں ہماری بات سے اختلاف ہے یا بقول سید میر قاسم اگر وہ اپنے موقف سے ہٹ گئے ہیں تو کیا ہم سب پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ ہم اس ناراضگی، اس اختلاف اور انحراف پر طعنہ زنی کرنے کی بجائے اس کی وجوہات سمجھنے کی کوشش کریں۔ کیا

یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم نے ان ہی کی قیادت اور رہنمائی میں ایک سیکولر ہندوستان کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کیا۔ آج اگر ہندوستانی سیکولرزم سے ان کا اعتقاد اٹھ گیا ہے تو وکیلوں کی طرح قانونی اور آئینی بحث سے اس اعتماد اور اعتقاد کو بحال کیا نہیں کیا جا سکتا۔ قاسم صاحب نے ایک اچھے وکیل کی طرح شیخ صاحب کے سابقہ اور موجودہ بیانات سے حوالے دے دیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیخ صاحب کے سابقہ اور موجودہ بیانات میں تضاد ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تضاد ہے لیکن میں جاننا چاہوں گا کہ یہ ثابت کرنے کے بعد آپ نے ثابت کیا کیا؟ شیخ عبداللہ صحیح ثابت ہوتا ہے یا غلط۔ اس سے اُس انسانی مسئلے پر کیا اثر پڑے گا جو اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اختلاف اور کشیدگی کا باعث ہے۔ قاسم صاحب اپنی بحث سے عدالت میں یہ مقدمہ جیت سکتے ہیں۔ شیخ صاحب کیخلاف انہیں ڈگری بھی مل سکتی ہے، لیکن بعض انسانی مسائل ایسے ہوتے ہیں جو وکیلانہ بحث اور عدالتی ڈگریوں سے حل نہیں ہو سکتے۔ آئین اور قانون کی بات رہنے دیجئے اس بنیادی مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کیجئے جس کی وجہ سے کروڑوں انسانوں کی زندگی جہنم بنی ہوئی ہے۔ جہاں تک آئینی موشگافیوں کا سوال ہے، روڈیشیا کی غیر آئینی سرکار بھی افریقیوں کو پھانسی پر چڑھانے کے لئے قانون اور آئین ہی کا سہارا لیتی ہے۔

آپ کا دعویٰ ہے کہ شیخ صاحب کے ساتھ لوگ نہیں ہیں۔ خدا کرے کہ لوگ آپ ہی کے ساتھ ہوں۔ لیکن اس بنیادی حقیقت سے آپ کہاں بھاگ سکتے ہیں کہ لوگ آپکے ساتھ نہیں ہیں۔ پچھلے بیس سالوں سے ہم ایک عجیب وغریب ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے شیخ صاحب نے یہ دعویٰ کیا کہ

لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد بخشی صاحب نے اعلان کیا، کہ لوگ دراصل ان کے ساتھ ہیں۔ پھر ریاست کے ساتھ ایک اور مذاق بھی ہوا۔ خواجہ شمس الدین وزیراعظم بنے اور انہیں بھی یہ غلط فہمی ہوگئی کہ لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ اب آپ کا دعویٰ ہے کہ لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ معلوم نہیں آپ کا یہ دعویٰ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے یا خوش فہمی کا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کا ضمیر بھی اس دعوے سے مطمئن نہیں۔ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ لوگ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انتخابات ہوئے اور جس طرح ہوئے اس کے متعلق کچھ کہے بغیر ہم سب کو اس بات کا احساس ہے کہ ہمیں لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔ ہم ان کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتے، غور سے سوچیئے تو آپ کو اس سارے ڈھانچے میں ایک مصنوعی پن کا احساس ہوگا۔ ہم زبان سے ایک بات کہتے ہیں لیکن ہمارا دل کچھ الگ کہتا ہے گواہوں کی بات چھوڑ دیجئے کہ کشمیر کی شاہراہوں اور گذرگاہوں سے پوچھئے کہ لوگ کس کے ساتھ ہیں۔

کشمیری مسلمانوں کی دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھ لیجئے تو آپ کو ان میں صرف عدم تحفظ کا احساس نظر آئیگا۔ اس نے ہندوستان کے سیکولر کردار، اس کی جمہوری روایات اور اپنے تابناک مستقبل کی خاطر ایک رشتہ قائم کیا تھا۔ آج ہندوستانی سیکولرازم پر سے اس کا وشواس اٹھ گیا ہے۔ میرے دوست شیو چرن گپتا نے میرٹھ کا ذکر کیا ہے۔ میں بھی میرٹھ ہی کا ذکر کروں گا۔ کیا میرٹھ کے حالیہ واقعات سے کشمیری مسلمان کا ہندوستانی سیکولرازم پر وشواس بڑھ جائیگا؟ یہ مسلمان آپ سے ایک سوال پوچھتا ہے اور وہ یہ کہ کیا وہ ایک ایسے غیر محفوظ ماحول میں اطمینان اور آسودگی کی زندگی بسر کرسکتا ہے؟

اس نے نہ معلوم کتنی تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ ملک کی ہندو اکثریت پر اعتماد کر کے الحاق کیا تھا، لیکن آج مسلمان کے نام پر رانچی، روڑکیلا، جمشید پور اور میرٹھ میں چھریاں چلتی ہیں، آگ لگتی ہے اور کشمیر کے مسلمان کو اپنا، اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ کشمیر کا مسلمان آپ سے کچھ نہیں چاہتا وہ صرف تحفظ کا احساس مانگتا ہے اور میں اس کی طرف سے دامن پھیلا کر آپ سے بھیک مانگتا ہوں کہ اُسے اپنے مستقبل کی ضمانت دے دیجئے۔

صادق صاحب! ہم لوگ چلے جائیں گے، ہماری جگہ ایک نئی نسل لے گی۔ ہمیں صرف اپنے لئے نہیں اس نئی نسل کے لئے سوچنا ہوگا۔ آپ کے بچے کا مستقبل محفوظ نہیں۔ میرے بچوں کا مستقبل محفوظ نہیں۔ سارا مسئلہ یہی ہے۔ اس مسئلے کو حل کر دیجئے تو شیخ عبداللہ پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اگر جن سنگھ ان اندیشوں اور ان کی بدگمانیوں کو دور کرنے کا بیڑا اٹھائے، تو میں جن سنگھ کو ملک کی سب سے بڑی قوم پرست جماعت تصور کروں گا، اور سمجھوں گا کہ اس جماعت نے ملک کی بہت بڑی خدمت کی، لیکن صرف یہ کہنا کہ شیخ عبداللہ کو یہ نہیں کہنا چاہیے، کافی نہیں۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق خود کشمیری مسلمانوں نے کیا ہے۔ مہاراجے نے نہیں کیا تھا۔ مہاراجہ بہادر رات کی تنہائیوں میں وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ اس الحاق کو مضبوط بنانے کے لئے کشمیر کے اکثریتی فرقے نے ہی قربانیاں دی ہیں۔ اسلئے اگر آج وہ اپنے اطمینان اور تحفظ کے لئے ضمانتیں چاہتے ہیں تو انہیں موردِ الزام نہیں گردانا چاہیے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عین اس وقت جبکہ ملک کی اکثر ریاستیں زیادہ سے زیادہ اندرونی خودمختاری حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ واحد ہماری ہی ریاست مرکز کے

قریب تر جانا چاہتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔

مدراس والے، بنگال والے، بہار والے تو اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اختیارات اور کم سے کم مرکزی مداخلت کا مطالبہ کررہے ہیں، لیکن ہمارے ہاں ادغام اور قربت کا چرچا عام ہے۔ صادق صاحب نے ابھی حال ہی میں شیخ صاحب سے کہا ہے کہ اگر وہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کو حتمی تصور کریں تو پھر ان کے ساتھ الحاق کے Quantum کے متعلق بات چیت کی جاسکتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس سارے مباحثے میں صادق صاحب دلی کے وکیل کیوں بنتے ہیں۔ کیا کشمیر کی اندرونی خود مختاری کے تحفظ کے لئے ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ وہ کشمیری عوام کی طرف سے خود مرکزی لیڈروں سے یہ مطالبہ کیوں نہیں کرتے کہ ریاست کو اندونی طور پر خود مختار اور زیادہ با اختیار ہونا چاہئے۔ اگر شیخ صاحب غلط بات کررہے ہیں تو آپ کو تو صحیح بات کرنا چاہئے۔ اس طرح ریاست کی اندرونی خود مختاری کی بحالی کا سہرا آپ ہی کے سر رہے گا، لیکن آپ لوگوں نے صرف شیخ صاحب کی نکتہ چینی کو ہی اپنا مقصد قرار دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے نہ آپ کو کوئی فائدہ ہوگا اور نہ شیخ صاحب کو کوئی نقصان۔

مارچ ۱۹۶۸ء

ریاستی پولیس اور موئے مقدس کی چوری

جناب والا! آج جن مطالباتِ زر پر بحث ہو رہی ہے وہ میرے لئے ہی نہیں بلکہ ساری ریاست کے لئے حد درجہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مطالباتِ زر پر کچھ کہنے سے قبل میں صادق صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر بحث کے لئے وقت میں اضافہ کر کے ہماری بہت سی مشکلوں کو حل کر دیا ہے۔

جنرل ایڈمنسٹریشن

سب سے پہلے میں جنرل ایڈمنسٹریشن کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ اس سارے ڈھانچے کو ایک سرسری نظر دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس ریاست کا ایڈمنسٹریشن Top heavy ہے، بالکل غیر ضروری ہے اور نامناسب طور پر عہدے اور اسامیاں قائم کی جا رہی ہے اور بھاری بھر کم تنخواہیں دیکر خزانہ عامرہ کے ساتھ شدید نا انصافیاں ہو رہی ہیں۔ سرکاری بینچوں پر ایک نظر ڈالئے تو وزیروں کی ایک پوری فوج نظر آئے گی۔ وزیروں اور نائب وزیروں کی یہ بھرتی کس غرض کے لئے ہوئی ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ریاست اپنے مخصوص حالات کی بناء پر نہ ہریانہ ہو

سکتی ہے، نہ یو۔ پی اور نہ پنجاب۔ پھر وزیروں کی یہ مسلح فوج منظم کرنے کا جواز کیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں اور یہ خزانہ عامرہ پر ایک بوجھ بنے بیٹھے ہیں۔ وزیر کے ساتھ چونکہ صرف اس کی تنخواہ ہی نہیں ہوتی ایک مفت مکان، ایک موٹر کار، ٹیلی فون، سفر خرچہ اور اس طرح کی سینکڑوں بدعتیں وجود میں آتی ہیں۔ اس لئے سرکاری بینچوں پر بیٹھا ہوا ایک ایک وزیر ریاستی عوام کی بدقسمتی اور بدنصیبی کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ ان وزیروں کے پاس ایک ایک آدھا محکمہ ہے اور یہ دن بھر مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ ایک آدھے وزیر کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ دن بھر اپنے ماتحت محکمے کی کیش بُک چک کرتا رہتا ہے۔

شری عبدالغنی لون: Interruption

ڈپٹی سپیکر: No Interruption

شمیم احمد شمیم: میں صادق صاحب سے گذارش کروں گا کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ کیا واقعی اس ریاست کا ایڈمنسٹریشن چلانے کے لیے ان سارے وزراء کی ضرورت ہے، جن کو انہوں نے کرسیوں پر سجا رکھا ہے اور جو بات وزیروں کے بارے میں صحیح ہے وہ دوسرے افسروں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ابھی تک اس ریاست میں ایک چیف سکریٹری تھا اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ہر ریاست میں ایک ہی چیف سکریٹری ہوتا ہے، لیکن اب ایک ایڈیشنل چیف سیکرٹری کا عہدہ بھی تخلیق کیا گیا ہے۔ ابھی تک یہاں ایک ایڈوکیٹ جنرل ہوا کرتا تھا۔ اب ایک ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل بھی مقرر کیئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں کل ملاکر ۱۶ ایڈیشنل سیکرٹری ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غریب سی ریاست اتنے بڑے اور ناقابل

برداشت بوجھ کی متحمل ہوسکتی ہے۔ آپ کو بعض مخصوص وجوہات کی بناء پر مرکز سے بڑی فراخدلانہ امداد ملتی ہے، لیکن خدارا اس امداد کو اس بے رحمی اور بے دردی سے ضائع نہ کیجئے۔ تعجب کی بات ہے کہ ہم مرکز کی طرف سے دی جانے والی امداد اور قرضے کا بیشتر حصہ اس ریاست کی پیداوار بڑھانے یا اس کی دولت میں اضافہ کرنے کی بجائے افسروں کی تنخواہوں پر خرچ کرتے ہیں اور اقتصادیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ مستقبل میں یہ ہمارے لئے کس درجہ تباہ کن ثابت ہوگا۔

ریاستی پولیس اور موئے مقدس:

برسر اقتدار جماعت کے اکثر ممبروں نے پولیس کی تعریف اور شان میں قصیدے پڑھے ہیں۔ ان ممبروں کی حیثیت چونکہ گواہانِ سلطانی کی ہے، اس لئے ان سے کوئی شکوہ نہیں، لیکن ان تعریفوں کے پیچھے جو رجحان کام کر رہا ہے، اس کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ بہت سے ممبروں کی تقریروں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے نزدیک پولیس کی توسیع اور اس پر خرچ ہونے والی رقومات سے بالواسطہ طور پر حکومت کی تعریف کا پہلو نکل آتا ہے، لیکن میں ان دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ پولیس کی تعداد نہیں بلکہ اس کی کارکردگی حکومت کی شہرت اور ذلت کا پیمانہ ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ پولیس پر تین کروڑ روپیہ صرف کرنے کے بعد جرائم کی تعداد میں کمی ہوئی ہے، یا اضافہ؟ سماج میں اخلاقی، سماجی اور سیاسی شعبوں میں جو بے راہ رویاں رواج پاگئی ہیں، ہماری پولیس ان کا تدارک کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہے۔ میں ریاستی پولیس کی اہلیت اور نااہلیت کو جانچنے کے لئے صرف ایک

مثال پر اکتفا کروں گا۔

موئے مقدس: آج سے چار سال قبل سرینگر کے مقام پر ایک سنسنی خیز چوری ہوئی۔ موئے مقدس کو حضرت بل میں اپنی جائے پاک سے ہٹایا گیا اور اس کے بعد نتیجے میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طوفان کی رو میں ایک حکومت، ایک نظام اور ایک دور بہہ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد موئے مقدس بازیافت ہوا۔ مجرموں کے ناموں کا اعلان بھی ہوا، لیکن اس کے بعد سے کیا ہوا؟ کسی کو معلوم نہیں۔ خوش قسمتی سے اس ریاست کو اب ایک قابل، محنتی اور دیانتدار انسپکٹر جنرل ملا ہے اور موئے مقدس کی چوری کے مجرموں کا سراغ نہ ملنا ان کی قابلیت اور اہلیت کے لئے ایک چیلنج ہے۔ کیونکہ مجرموں کے بارے میں عجیب وغریب افواہیں اڑی ہوئی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ موئے مقدس کے اصلی ملزم وزیر بن گئے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ پاکستان بھاگ گئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ دراصل چینی ترکستان میں ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ صرف یہی ایک واقعہ پولیس کی نااہلیت اور نالائقی کا اتنا بڑا اشتہار ہے کہ میرے خیال میں اس تنظیم پر مزید تنقید کی ضرورت ہی نہیں۔

اس سانحے کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے اس کی بدولت اس ریاست کی حکومت بدلی اور صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کو برسرِ اقتدار آنا نصیب ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر موئے مقدس کی گمشدگی کا سانحہ رونما نہ ہوا ہوتا تو ابھی تک اس ریاست پر شمس الدین صاحب کا راج ہوتا اور صادق صاحب لائن میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے ہوتے۔ اس لحاظ سے بھی صادق صاحب پر یہ لازم ہے کہ جس موئے مقدس کی خیرات میں انہیں اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا، اس کے چوروں کا سراغ لگا کر کما حقہ اپنا فرض ادا کریں۔

شیخ صاحب کو مبارکباد: کانگریس اور جن سنگھ کے بہت سے ممبران نے یہاں شیخ صاحب کا بھی ذکر خیر کیا ہے اور کشمیر کی موجودہ صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کشمیر میں کونسی قیامت بپا ہوئی ہے کہ ہمارے یہ دوست دوڑو، بھاگو، بچاؤ کے نعرے بلند کرنے لگے ہیں۔ میں ابھی چند دن ہوئے کشمیر گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں کی صورت حال کا مشاہدہ کیا۔ شیخ صاحب کا رویہ حد درجہ معقول، صلح کن اور تعمیری ہے اور یہ بات میری فہم سے بالاتر ہے کہ ریاست میں ان کے داخل ہونے کے بعد کون سی ایسی بات ہوئی ہے جو جس کی بناء پر کچھ دوست ہڑ بڑا اٹھے ہیں۔ میرے خیال میں کچھ لوگ بادشاہ سے بھی زیادہ وفادار بننے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور وہ مصنوعی خطرات اور فرضی ااندیشوں کی آڑ لے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے رستم ہیں۔ اگر انہیں موقعہ دیا جائے تو وہ شیخ عبداللہ کو بات کرنے کی اجازت بھی نہیں دیں گے۔ شیخ صاحب کے تئیں صادق صاحب کا رویہ بے حد معقول اور عاقبت اندیشانہ ہے اس لئے بعض ساتھی دنیا پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ صادق صاحب کمزور آدمی ہیں اور صورت حال سے نپٹنے کے لئے انہیں میدان عمل میں آنے کی اجازت دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ صادق صاحب اس قسم کی ریشہ دوانیوں سے باخبر ہیں۔ بعض دوستوں نے صادق صاحب کو مبارکباد دی ہے کہ کشمیر میں لا اینڈ آڈر اچھی طرح سے کام کر رہا ہے اور شیخ صاحب کے باوجود لا اینڈ آڈر کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس بات کے لئے صادق صاحب کو مبارکباد دینے والوں کو شیخ صاحب کو بھی مبارک باد دینا چاہئے۔ وہ آگ لگا سکتے تھے انہوں نے نہیں لگائی۔ شعلے بھڑکا سکتے تھے انہوں نے بھڑکائے نہیں۔ میں نے ان کے کئی جلسوں میں شرکت کی

اوران سے ملاقات بھی کی۔ انہوں نے بڑے جلسوں میں لوگوں کو امن و امان قائم رکھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اندرونی امن و امان میں خلل ڈالنے والے ہمارے دشمن ہیں۔ میں ان سے ملا تو انہوں نے صرف ایک بات کہی اور وہ یہ کہ وہ اس دنیا میں کشمیریوں کے لئے باعزت زندگی گذارنے کا حق چاہتے ہیں اور بس۔ کیا اس بات کی خواہش رکھنا یا اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا جرم ہے؟ ہم میں سے کون ہے جو اس جرم میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔

شیو چرن گپتا:

کشمیر میں شیخ صاحب نے جو تقریریں کی ہیں کیا شمیم صاحب ان سے متفق ہیں۔

شمیم احمد شمیم:

میں تو ان کی ایک بات سے بھی متفق نہیں ہوں، لیکن میں انہیں اس بات کے حق سے محروم کیسے کر سکتا ہوں کہ وہ جو کچھ صحیح سمجھتے ہیں اسے کھل کر کہیں اور پوری آزادی کے ساتھ کہیں۔ میں تو اپنے اس ملک پر عاشق ہی اس لئے ہوں کہ یہاں ہر انسان کو ہر بات کہنے کی آزادی ہے۔ میں اپنے ملک کے آئین پر پروانہ وار فدا ہوں کہ اس نے یہاں کے باشندوں کو یہ بنیادی حق دیا ہے کہ وہ اپنے نظریات اور خیالات کی آزادی کے ساتھ تبلیغ کر سکتے ہیں۔ پھر شیخ صاحب کو آئین کی کس دفعہ کی رُو سے ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جا سکتا ہے۔ انہیں چودہ سال تک ان کے حقوق سے محروم رکھے جانے کی وجہ سے میرا ہی نہیں، میری ہی طرح بہت سے لوگوں کا آئین اور اس کے تقدس پر سے اعتقاد متزلزل ہونے لگا ہے۔ اس اعتقاد کو بحال کرنے اور مضبوط بنانے

کے لئے یہ ضروری ہے کہ شیخ صاحب کو یہ حق دیا جائے کہ وہ آزادی کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنا مافی الضمیر رکھیں اور اگر شیو چرن جی اور پنڈت پریم ناتھ جی سیاسی میدان میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے کریں۔

جہاں تک شیخ صاحب کی سیاست کا سوال ہے، میں ان کی سیاست سے متفق نہیں ہوں، لیکن مجھے ان کی نیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ خلوص دل سے ہندوستان اور پاکستان کی دوستی اور کشمیر کے جھگڑے کا منصفانہ حل چاہتے ہیں۔

اٹانومی:

میرے دوست شیو چرن گپتا نے ریاست کی اٹانومی کے مطالبے کو ریاست کی تقسیم کے مترادف قرار دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ گپتا صاحب کے پاس انگریزی کی وہ کونسی ڈکشنری ہے۔ جس کی رُو سے اٹانومی کے معنی تقسیم کے ہیں۔ میری ڈکشنری میں اٹانومی کا مقصد خود مختاری ہے، تقسیم نہیں ہے، اور ریاست کو بحیثیت مجموعی اور مختلف خطوں کو انفرادی طور اندرونی خود مختاری مل جانی چاہئے۔

شیو چرن گپتا: کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ ڈاکٹر کرن سنگھ اور شیخ صاحب کا آپس میں کیا سمبندھ ہے۔

شمیم احمد شمیم: یہ آپ جا کر شیخ صاحب اور ڈاکٹر کرن سنگھ سے پوچھ لیجئے۔ میں اس بارے میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔

کانگریس جن سنگھ معاشقہ:

پچھلے کئی دنوں سے اس ایوان میں کانگریس اور جن سنگھ کا جو معاشقہ چل

رہا ہے۔ وہ اس ایوان میں اور اس کے باہر بڑی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ صادق صاحب اور ڈی، پی در صاحب، پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ اور ان کے ساتھیوں کی تعریفیں کر رہے ہیں اور جن سنگھ، صادق صاحب اور در صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ جن سنگھ اور کانگریس کا یہ معاشقہ رنگ لائے اور جن سنگھ اپنی فرقہ پرست سیاست کو خیر آباد کہہ کر کانگریس کے اصولوں کو اپنا لے اور اس طرح یہ جو اشاروں میں بات چیت ہو رہی ہے اور جس کی وجہ سے عوام میں بڑی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں وہ ختم ہو جائیں، میں پنڈت جی اور صادق صاحب کو اس نئے معاشقے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

تعلیم کے بارے میں

آج کے مطالبات زر پر اپنی تقریر ختم کرنے سے قبل میں تعلیم اور بالخصوص یونیورسٹی تعلیم کے متعلق دو ایک باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے دس بارہ سال سے پرائمری سکولوں، مڈل سکولوں، ہائی سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اس حد تک ریاستی حکومت کی کارکردگی کی تعریف کرنا بے جا نہ ہوگا، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یونیورسٹی سطح پر ہماری تعلیم کا نظام .... بے حد ناقص ہی نہیں، نقصان دہ بھی ہے۔ بدقسمتی سے اس ریاست میں یونیورسٹی کی تنظیم اور اس کی کارکردگی کو زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ اس وقت یہ یونیورسٹی بغیر وائس چانسلر کے ...... ہے اور صادق صاحب چونکہ فیصلہ کرنے میں بڑی دیر لگاتے ہیں۔ اس لیے معلوم نہیں کہ وائس چانسلر کے انتخاب کا کب فیصلہ ہو۔ میں ان سے گذارش کروں گا کہ وہ اس میں مزید تاخیر نہ کریں اور جلد از جلد کسی موزون آدمی کو وائس چانسلر

منتخب کریں تا کہ یونیورسٹی کا نظام بہتر طور پر چل سکے۔

رشوت ستانی اور کنبہ پروری:

ریاست میں ایڈمنسٹریشن کی کارکردگی اور اہلیت کے بارے میں جو کچھ کہوں گا، آپ یہی سمجھیں گے کہ میں حکومت کا مخالف ہوں۔ اس لئے مخالفت ہی کروں گا، لیکن میری بات جانے دیجئے، میں ایک کانگریسی ایم۔ ایل۔اے کو ہی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ خوش قسمتی سے

پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

عشرت صاحب نے ابھی حال ہی میں سرکاری اخبار ''قومی آواز'' میں ''وعدوں کی قطاریں'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں انہوں نے ریاستی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں گھی کا ایک کنستر دے کر ملازمت حاصل کی جاتی ہے۔ رشوت اور سفارشوں کے سہارے قابل، تعلیم یافتہ اور مستحق اشخاص کو نظر انداز کر کے نالائق اور اَن پڑھ نوجوانوں کو ملازمت میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ عشرت صاحب کا تعلق چونکہ آپ کی اپنی جماعت سے ہے۔ اس لئے اس پر غور کیجئے اور سوچئے کہ آپ کے ہوتے ہوئے کیا کچھ ہو رہا ہے۔

نیک نیتی ہی کافی نہیں:

میں جانتا ہوں کہ صادق صاحب نیک آدمی ہیں وہ خلوص دل سے رشوت ستانی کنبہ پروری اور بدعنوانیوں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ان کی نیت کی پاک دامنی کی میں قسم کھانے کو تیار ہوں، لیکن اس کا کیا کیجئے کہ محض نیک نیتی سے ہی نیک اور اعلیٰ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ ان کے لئے طریق کار اور

عمل پیہم کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور صادق صاحب مجھے معاف کریں گے کہ اُن کے ہاں ان اوصاف کی کمی بے حد کھٹکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے پاس بڑی ٹھوس اکثریت ہے اور حزب مخالف میں ہم صرف آٹھ دس آدمی ہیں۔ (جن سنگھ کو آپ پہلے ہی ورغلا چکے ہیں) لیکن انقلاب آپ سے مشورہ کر کے نہیں آئے گا۔ وہ آپ سے پہلے آپ کے دروازے پر دستک بھی نہیں دے گا۔ وہ چپکے سے دبے پاؤں چلا آئے گا۔ اس لئے اس بڑی بھاری اکثریت پر نازاں ہو کر وقت اور تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کیجئے۔ کیونکہ اس ظاہری سکون اور اطمینان کی آغوش میں بھی ایک انقلاب پرورش پا رہا ہے۔

حلقۂ انتخاب شوپیان:

دیکھئے میں نے اپنے حلقۂ انتخاب کا ہر کوئی مطالبہ یا مسئلہ پیش نہیں کیا ہے۔ وسیع القلب اور عالی ظرف وزیر اعلیٰ نے میرے حلقۂ انتخاب کا ہر مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اُنہوں نے آج سے چھ ماہ پہلے سترہ احکامات جاری کئے ہیں اور ہدایت کی ہے کہ شوپیان کا ہر مسئلہ حل کر دیا جائے، لیکن میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر صادق صاحب سے صرف یہ کہوں گا کہ وہاں کے پٹواری اور تحصیلدار نے ان احکامات کی تعمیل نہیں کی۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر صاحب نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ خدارا اپنے پٹواریوں، تحصیلداروں اور ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت کیجئے کہ وہ آپ کے احکامات کی تعمیل کریں۔

مارچ ۱۹۶۸ء

کالے قوانین
مخالفت کو کچلنے کا ہتھیار

''جناب والا! سب سے پہلے میں حکمرانوں کو یہ تاریخی واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں، کہ ریاست کی اولین آئین ساز اسمبلی میں احتیاطی نظر بندی کا سخت اور شدید قانون پاس کروانے کا سہرا شیخ محمد عبداللہ کے سر تھا اور ۱۹۵۳ء میں سب سے پہلے وہ اور ان کے دوسرے ساتھی اس قانون کا شکار ہو گئے، اس کے بعد بخشی غلام محمد نے اپنے دورِ اقتدار میں اس قانون کو زیادہ سخت اور وحشی بنادیا اور ۱۹۶۴ء میں وہ اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کی زد میں آکر گرفتار ہو گئے۔ آج صادق صاحب اور ان کے ساتھی، فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے نام پر جو وحشیانہ قانون پیش کر رہے ہیں، تعجب نہیں کہ اس کا پہلا وار خود ان ہی پر ہوگا۔ معلوم نہیں کہ ہر حکمران اقتدار کے نشے میں یہ کیوں بھول جاتا ہے، کہ وہ خود اپنی بنائی ہوئی زنجیروں میں جکڑا جا سکتا ہے، آج جو مسودہ قانون پیش ہو رہا ہے، یہ حکمران جماعت نے اپنوں دشمنوں سے نپٹنے کے لئے تیار کیا ہے اور اس کا یقیناً فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے زہر کو روکنے سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک طرف ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس ریاست میں فرقہ وارانہ اتحاد اور سیکولرازم کی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط ہیں، کہ ہندوستان کی کسی دوسری

ریاست میں نہیں ہیں، لیکن دوسری طرف فرقہ پرستی کے زہر کو روکنے کے لئے ایسا سخت قانون بنا رہے ہیں، کہ ملک کی کسی دوسری ریاست نے ابھی تک ایسا قانون نہیں بنایا ہے۔ گجرات اور مہاراشٹرا جہاں ابھی حال ہی میں فرقہ واریت کے خوفناک نظاروں نے انسانیت کو تڑپا دیا ہے۔ وہاں اس قسم کا قانون پاس نہیں کیا گیا، لیکن یہاں اسے فوری طور ایک آرڈی ننس کے ذریعے لاگو کر کے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، کہ اس ریاست میں گجرات، مہاراشٹرا اور بہار سے بھی نازک صورت حال ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والوں کو سخت سزائیں دینے سے واقعی فرقہ پرستی کا زہر ختم ہو جائیگا؟ کیا اس قسم کے قوانین پاس کرنے سے فرقہ واریت کا مسئلہ ختم ہو جائے گا؟ اگر جواب اثبات میں ہے، تو میں کہوں گا کہ ہمیں اس سے بھی زیادہ سخت قوانین پاس کرنا چاہئیں، لیکن اس ایوان کے سبھی ممبران اچھی طرح جانتے ہیں، کہ فرقہ پرستی کسی ارتکاب جرم کا نام نہیں، ایک ذہنی رویے، ذہنیت اور طریق فکر کا نام ہے۔ یہ نفرت دلوں میں پلتی ہے، ذہنوں میں پرورش پاتی ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے غذا حاصل کرتی ہے۔ جب تک آپ انسانوں کے دل، ان کے ذہن اور ان کا ماحول نہیں بدلتے۔ قوانین اور سخت قسم کے قوانین پاس کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

"رنبیر کوڈ اور تعزیرات ہند میں اس سے پہلے بھی جرم کی سزا مقرر ہے۔ قاتل کو پھانسی کی سزا، عمدِ قتل کرنے والے کو سات سال کی سزا، آگ لگانے والے کے لئے دس سال کی سزا اور اسی طرح ہر چھوٹے بڑے جرم کے لئے سزائیں مقرر ہیں، لیکن کیا آج تک فرقہ وارانہ فسادات میں سینکڑوں آدمیوں

کو قتل کرنے والے ایک بھی قاتل کو قتل کی سزا ملی ہے۔ سزا تو دور کی بات ہے، کیا ایسے کسی قاتل کا عدالت میں چالان پیش ہوا ہے؟ احمد آباد، بھیونڈی، چائباسہ، رانچی یا جبل پور میں کسی آگ لگانے والے کو سات اور آٹھ سال نہیں، سات اور آٹھ مہینے کی سزا بھی ہوئی ہے؟''

''ان قوانین کے ہوتے ہوئے بھی اگر مجرم ابھی تک قانون کی گرفت سے دور ہیں، تو ایک نئے قانون کا اضافہ کر کے ہم ساری صورت حال کو کیوں کر بدل سکتے ہیں۔ احمد آباد کی ہاجرہ بیگم نے اپنے چار بچوں کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے کچھ لوگوں کے نام بھی لئے تھے۔ ان میں سے کتنوں کو پھانسی یا جیل کی سزا ہوئی ہے؟''

''مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے، اور وہ یہ کہ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے لئے حکومت کی نیت صاف نہیں ہے ااور اندرا گاندھی کی حکومت اور انکی جماعت اسے ایک نعرے کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ جن سنگھ ایک فرقہ پرست جماعت ہے۔ اس کا فیصلہ خود اندرا گاندھی نے کیا ہے، لیکن اس کے باوجود قومی یک جہتی کونسل میں جن سنگھ کو مدعو کر کے اس جماعت کے لیڈروں سے فرقہ پرستی کے موضوع پر تبادلہ خیالات کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیرلا مسلم لیگ کے ساتھ متحدہ محاذ اور پنجاب میں اکالیوں کے ساتھ مفاہمت سے صاف ظاہر ہے، کہ حکومت کو ضرورت پڑنے پر فرقہ پرستوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں کوئی عار نہیں۔

''ملک''، میں ''آگنائزر'' اور اس قبیل کے درجنوں اخبارات فرقہ دارانہ منافرت کا زہر پھیلانے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح جن سنگھ اور دوسری کئی جماعتیں کُھل کر فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات کی تحریک اور ترغیب دیتی

ہیں، لیکن ہم بے بس تماشائیوں کی طرح ان کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا، کہ آر، ایس، ایس کے ورکر سکولوں اور میدانوں میں نوجوانوں کو چھرے بازی اور آتش زنی کی تربیت دیتے ہیں، لیکن ہم ان کی پریڈوں پر تک پابندی تک عائد نہیں کرسکتے۔''

''میں ایک اور اہم مسئلے کی طرف بھی آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں، کہ کیا آپ کے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرنے والے افسر فرقہ پرستی کے زہر سے محفوظ ہیں! کیا یہ حقیقت نہیں کہ بڑے بڑے سیکریٹری، ڈپٹی سیکریٹری، انسپکٹر پولیس، ڈپٹی کمشنر، خود فرقہ پرستی کے زہر سے ملوث ہیں؟ ہندوستان کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے فرقہ پرستوں کی پیٹھ ٹھونکنے میں وہاں کے اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں کا بھی contribution تھا۔ ان حالات میں صرف قانون پاس کرنے سے کیا ہوگا؟ اگر آپ دیانتداری سے ملک کے ماحول کو بدلنا چاہتے ہیں، تو سب سے پہلے انتظامیہ سے ایسے افسروں کو خارج کرنے کے لئے اقدامات کیجئے کہ جن کے دل فرقہ پرستی کے زہر سے بھرے پڑے ہیں۔''

''میں پھر پوچھنا چاہوں گا، کہ دلوں میں پرورش پانے والی نفرت اور ماحول میں پھیلے ہوئے زہر کو یہ مسودہ قانون کیسے ختم کرسکتا ہے؟ آپ جب تک فرقہ پرست سیاست کا سیاسی سطح پر مقابلہ کرنے کے نااہل ہیں، یہ قوانین محض دکھاوا ہیں اور جہاں تک زیر بحث مسودہ قانون کا تعلق ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اس قانون کو پاس کرنے کا مقصد خالص سیاسی ہے۔ اس قانون کا دائرہ اتنا وسیع ....اور اس کے تحت افسروں کو دئے جانے والے اختیارات اتنے لامحدود ہیں، کہ اس میں پوشیدہ مقصد چھپائے بھی نہیں چھپ سکتا۔ مسودہ

قانون کی رُو سے الفاظ ، اشاروں اور افواہوں کے ذریعے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے کو دھر لیا جائے گا، لیکن الفاظ اور اشاروں کے معنی کا تعین کون کرے گا؟ اور پھر افواہوں کی کیا تعریف ہے؟ خبر اور افواہ میں فرق کیسے کیا جائے گا؟ دوسرے الفاظ میں اس قانون پر عمل درآمد کی کیا صورت ہوگی؟ حکومت کا کوئی بھی اہلکار کسی بھی شخص کو الفاظ، اشارے یا افواہ کا بہانہ بنا کر گرفتار کر سکے گا اور اس طرح انتظامیہ کو فرقہ وارانہ منافرت کو روکنے کے نام پر وسیع اور لامحدود اختیارات حاصل ہوں گے اور شہری آزادی پر ہزاروں قسم کی پابندیاں عائد ہوں گی۔ الفاظ، اشاروں اور افواہوں کے معانی کا تعین کرنے والے جج کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ بجائے خود فرقہ پرستی اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہوگا؟''

''اس مسودہ قانون کی رُو سے مذہبی مقامات اور عبادت گاہوں پر'' فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے'' کی تعریف کیا ہوگی؟ اگر حضرت بل کی درگاہ میں شیخ صاحب مسلمانوں کو متحد و متفق رہنے کی اپیل کریں اور ساتھ ہی انہیں ہندو فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے خطرے کا احساس دلائیں، تو کیا یہ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے مترادف ہوگا؟ اگر خانقاہ مولیٰ میں کوئی مسلمان احمد آباد کے فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یہ کہے ، کہ گجرات کے ہندوؤں نے مسلمانوں پر بے پناہ ستم توڑے، تو وہ اس مسودہ قانون کی نگاہوں میں مجرم قرار پائے گا یا نہیں؟ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ہر مخصوص ماحول میں فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ منافرت کا زہر پھیلانے کی الگ الگ تعریفیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے مسجدوں ، مندروں ، خانقاہوں اور دوسرے مذہبی مقامات میں مذہبی منافرت پھیلانے کو اس مخصوص پس منظر

میں دیکھنا ہوگا، قانون کے اس حصے کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ مذہبی مقامات کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے، یہ ایک بہت نیک اور پاک مقصد ہے مگر مذہبی مقامات کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنے کا ایک تاریخی اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اسے آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہماری تحریک آزادی نے جامع مسجد کے صحن میں جنم لیا ہے۔ خانقاہ معلیٰ میں پرورش پائی ہے اور حضرت بل کی سیڑھیوں پر چلنا سیکھا ہے۔ پھر آج آپ یک لخت یہ حکم کیسے نافذ کر سکتے ہیں، کہ ان مقامات کو سیاسی تحریکوں کیلئے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیا خود صادق صاحب نے ان مقدس مذہبی مقامات کو سیاست کیلئے استعمال نہیں کیا ہے؟ موئے مقدس کی گمشدگی ایک سیاسی سازش تھی یا نہیں۔ اور کیا صادق صاحب اس سانحہ کے فوراً بعد وہاں نہیں گئے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس کی بازیافت کے لئے شروع کی گئی ایجی ٹیشن نے کشمیر کی سیاست میں ایک انقلاب عظیم بپا کر دیا؟

"میں مذہبی مقامات کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کئے جانے کے حق میں نہیں ہوں، لیکن میرے حق میں یا مخالف ہونے سے حقائق بدل تو نہیں سکتے۔ کشمیر کی سیاسی تحریک نے مذہب اور مذہبی مقامات سے قوت پائی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اسی لئے حضرت بل، جامع مسجد، خانقاہ معلیٰ اور شیتل ناتھ سبھی مقامات سیاسی تحریکوں کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ سکھوں کی ساری سیاست تو گوردواروں کے گرد گھومتی ہے، اس قسم کا قانون بناتے وقت ہم ان بنیادی حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

افواہ ہی کا قصہ لیجئے، افواہ پھیلانا تو ہر کشمیری اپنا بنیادی اور پیدائشی حق سمجھتا ہے اور عام طور پر بے ضرر اور معصوم افواہیں پھیلانا بہت سے لوگوں کا

محبوب مشغلہ ہے۔ خبر زینہ کدل کا ذکر تو لارنس نے اپنی کتاب 'ویلی آف کشمیر' میں بھی کیا ہے۔ اب ضرورت پڑنے پر حکومت ہر اس شخص کو گرفتار کر سکتی ہے، کہ جس پر افواہ پھیلانے کا شُبہ ہو۔ یہ تو عجیب و غریب قسم کی پولیس سٹیٹ ہوگی، کہ جہاں انسان سرگوشیوں میں بھی بات نہیں کر سکتے۔"

"میرے لئے اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، کہ اس قانون کو پاس کرنا دراصل حکمران جماعت کا ۱۹۷۲ء کے انتخابات کے لئے میدان صاف کرنا ہے۔ اب چونکہ محاذ رائے شماری، جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں نے عام انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے، حکومت بدحواسی میں ایسے قانون پاس کر رہی ہے کہ جن کا مقصد ان جماعتوں کا سیاسی مقابلہ کرنے کے بجائے ان کے خلاف ایسی کاروائی کرنا ہے کہ جس سے یہ انتخابات میں حصہ نہ لے سکیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قانون کی رُو سے قانون ساز یہ کے ممبران منتخب ہونے کے بعد بھی DISQUALIFY قرار دئے جا سکتے ہیں تا کہ اگر کوئی "ناپسندیدہ" عنصر انتخاب کی کٹھنائیوں کے باوجود اسمبلی میں آجائے تو اس کے بعد بھی اس سے نپٹنے کی گنجائش موجود رہے۔"

"اس قانون کا مقصد شیخ محمد عبداللہ اور میرزا محمد افضل بیگ کو گرفتار کر کے انہیں انتخاباست میں حصہ لینے سے محروم رکھنا ہے اور اس طرح ۱۹۷۲ء کے عام انتخابات کے نتائج مرتب کرنے کا کام ابھی سے شروع کر دیا گیا ہے۔

۱۹۵۱ء میں ۷۵ کے ۷۵ ممبران بلا مقابلہ کامیاب ہوئے تھے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخاب میں صرف ۲۲ ممبر بلا مقابلہ کامیاب ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں ۱۹۵۱ء کی حکایت دہرائی جائے گی اور ایک ایسی اسمبلی وجود

میں آئے گی کہ جس میں حزب مخالف کا ایک بھی ممبر موجود نہ ہو۔''

''ممبران اسمبلی کو منتخب ہونے کے بعد اسمبلی کی رکنیت کے نااہل قرار دینے کا قانون انتہائی وحشیانہ اور غیر مہذب ہے اور اس طرح ہر ممبر اسمبلی کے سر پر ہمیشہ ایک تلوار لٹکتی رہے گی اور جب سر پر تلوار لٹکتی ہے، تو ظاہر ہے کہ ممبر آزادی کے ساتھ اپنی رائے اور اپنا مافی الضمیر پیش نہیں کرسکتا۔ اس اعتبار سے یہ بل شہری آزادی اور جمہوریت پر ایک بہت بڑا وار ہے۔''

''آج اس بل کو یہاں صادق صاحب اور ڈوگرہ صاحب پیش کررہے ہیں اور میں انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے، کل حکومت بدل سکتی ہے۔ اقتدار کچھ اور ہاتھوں میں جاسکتا ہے۔ ممکن ہے، اس وقت کے حکمران ڈوگرہ صاحب کی برہمن نوازی ان کی ہیرا نگر پرستی کو فرقہ وارانہ منافرت سے تعبیر کر کے انہیں گرفتار کریں۔ اور صادق صاحب کی کمیونسٹ دوستی کو فرقہ پرستی کا نام دے کر اس قانون کا ان پر بھی اطلاق کریں۔ اس وقت صادق صاحب اور ڈوگرہ صاحب دونوں ہی پچھتائیں گے، لیکن بے سود۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کل صادق صاحب اور ڈوگرہ صاحب کہیں آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھے جائیں اور پولیس کا کوئی افسر انہیں افواہیں پھیلانے یا اشارے کرنے کے جرم میں گرفتار کرے! کیونکہ قانون بجائے خود کوئی چیز نہیں۔ اس پر عملدرآمد اسے مفید یا نقصان دہ بناتا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے دور میں میر غلام محمد لسجن پر چادر چرانے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ غلام رسول کار پر کون کون سے الزامات عائد نہیں ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ قانون ہی کے نام پر ہوا تھا۔ اسی قانون کا استعمال کرنے والے وہی لوگ ہونگے کہ جو اس سے پہلے صادق صاحب کے
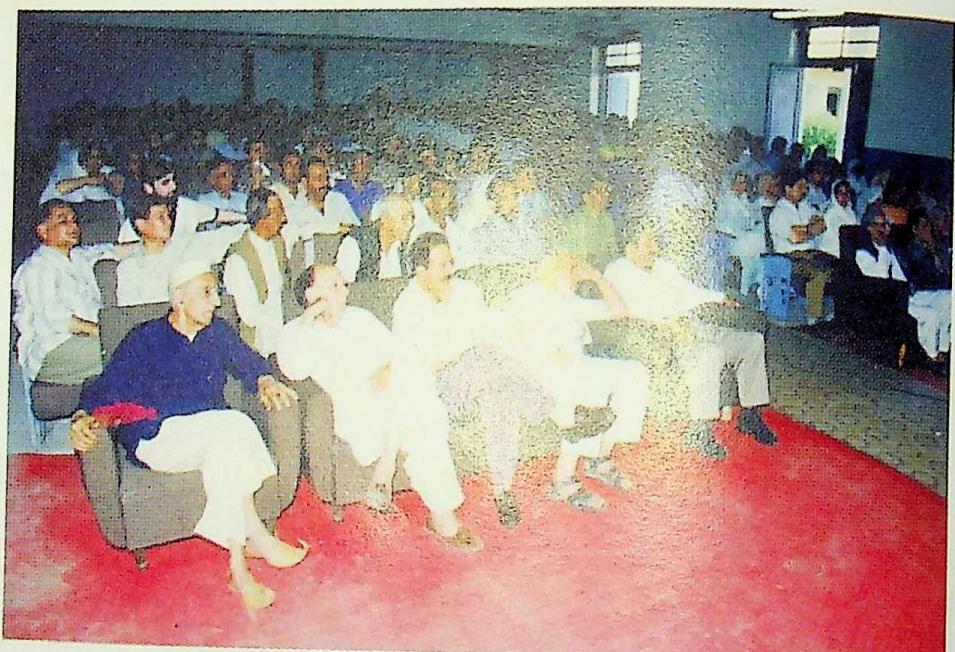
ساتھیوں کو فرضی جرائم کی پاداش میں گرفتار کر چکے ہیں۔ آج صرف مجرم بدل گئے ہیں۔ افسر وہی ہیں اور قانون بھی وہی!"

"فرقہ پرستی کا مجھ سے بڑھ کر اس برصغیر میں کوئی دشمن نہ ہوگا، لیکن فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے نام پر سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی مخالفت اور مزاحمت کرنا میرا فرض ہے اور مجھے شبہ نہیں، یقین ہے کہ زیر بحث مسودہ قانون کا مقصد فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی بجائے سیاسی مخالفوں سے نپٹنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کے پاس فرقہ پرستی اور فرقہ پرستوں سے نپٹنے کیلئے بہت سے قوانین پہلے ہی موجود ہیں۔ سوال صرف ان پر عملدرآمد کا ہے۔ خلوص نیت کا ہے اور قوت ارادی کا ہے۔ جس دن احمد آباد میں ان قاتلوں کو سزا دی جائے گی، کہ جنہوں نے ایک ماں کے سامنے اس کے چار بچوں کو دہکتی آگ میں جھونک دیا۔ اس دن فرقہ پرستی کے خلاف منظّم اور موثر جدوجہد کا آغاز ہو جائے گا۔ جب تک احمد آباد، بھیونڈی اور جلگاؤں کے قاتل آزاد پھرتے رہیں، فرقہ وارانہ منافرت کو روکنے کا کوئی قانون موثر نہیں ہوسکتا۔ موجودہ حالات میں زیر بحث بل کو ایک فسطائی سازش اور سیاسی حربہ سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس قسم کا مسودہ قانون جمہوریت اور سوشلزم کے علمبردار نہیں، بلکہ جمہوریت، انصاف اور آزادی کے قاتل ہی پیش کر سکتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس بل کو پیش کرنے کا سہرا صادق صاحب اور ڈوگرہ صاحب جیسے "ترقی پسند" لیڈروں کے سر ہے۔"
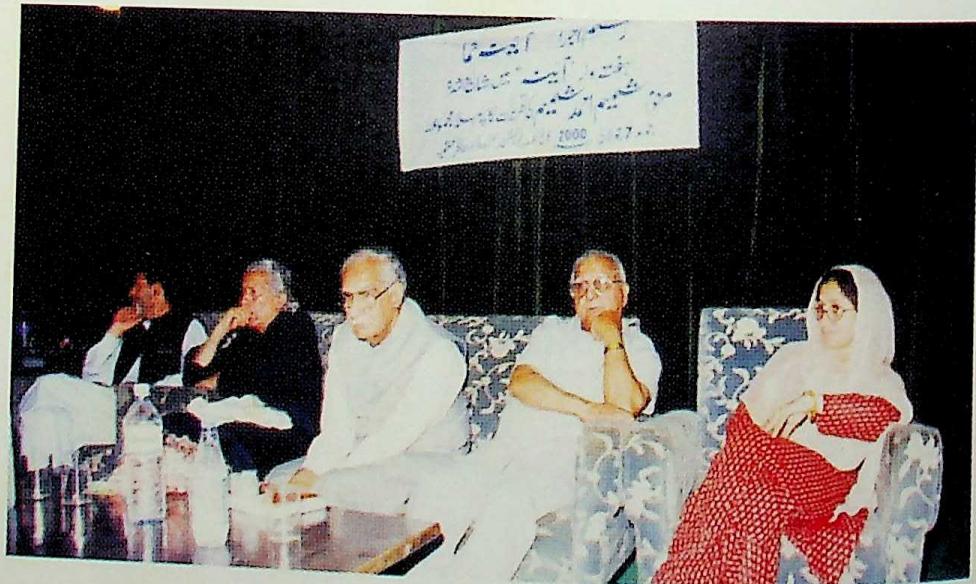
۱۹۷۰ء

پارلیمنٹ

آئینہ نما کے پہلے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں
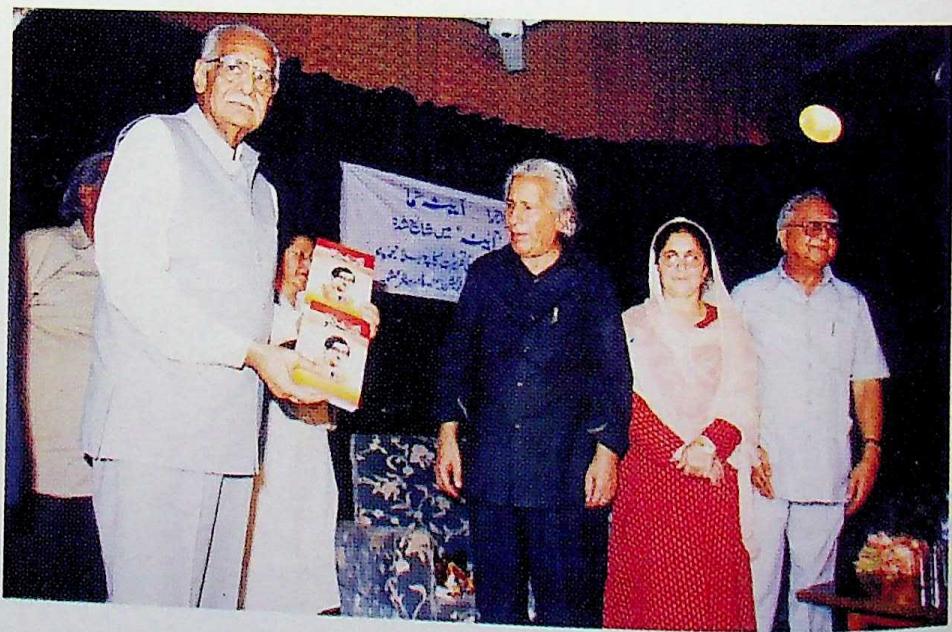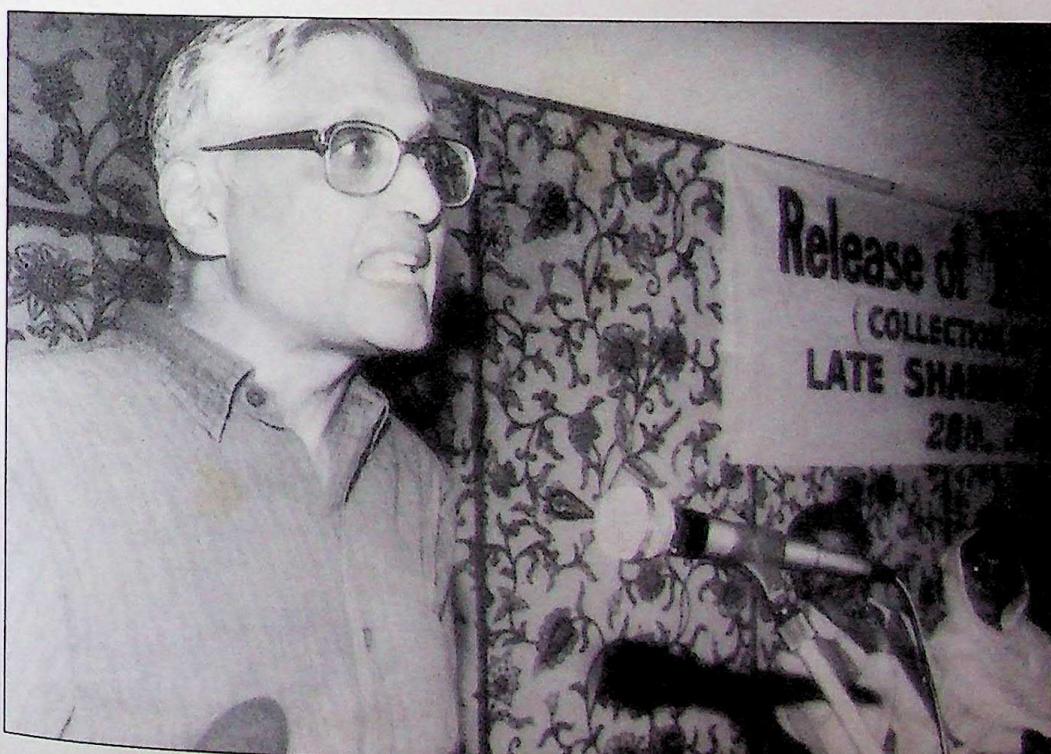
آئینہ نما کے پہلے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

آئینہ نما کے پہلے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

آئینہ نما کے دوسرے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

آئینہ نما کے دوسرے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

ایمر جینسی

اعترافِ شکست

چیرمین صاحب! آپ اس بات کی شہادت دینگے کہ پچھلے ۴ر سال سے ایوان میں، میں نے عام طور پر ہر ایشو کو اس کے میرٹ پر جج کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے بعض اوقات اپوزیشن والے مجھ سے ناراض رہے ہیں اور کبھی کبھی حکومت کے بینچوں پر بیٹھنے والے مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ اس آزادی کی قیمت ہے جو ہم نے بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے۔ اس آدھار پر میں ایک بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ پچھلے ۴ر سال سے سدن میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ یقیناً پارلیمنٹری ڈیموکریسی کے رولز کے عین مطابق نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھ کر اس بات کا تجربہ کیا تھا کہ یہ لوگ پارلیمنٹری ڈیموکریسی کا استحصال کر کے اپنے آپ کو ایسی حرکتوں کا اشتہار دینا ہی پارلیمنٹری ڈیموکریسی سمجھتے تھے۔ ان کی حالت ایک بیمار کی سی ہو گئی تھی۔ ایک ایسے شرابی کی سی ہو گئی تھی جو دارو پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ان کی نگاہیں نہ ملک کے فیوچر پر تھیں نہ اس سدن کی روایات پر تھیں، بلکہ ان کی نگاہیں پریس گیلری پر رہا کرتی تھیں۔ میں نے ان کو بیماروں کی طرح تڑپتے ہوئے دیکھا ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت کریں جس سے یہ صورت پیدا ہو جائے کہ ان کا نام اخبار میں آ جائے۔ مجھ

سے کچھ دوستوں نے کہا یہاں میرے ساتھ بیٹھنے والوں نے، کہ ہمارا جو ٹوٹل کومٹمینٹ ہے پارلیمنٹ کے ساتھ وہ یہ ہے کہ اخبار میں کیا چھپتا ہے۔ سپیکر کی عزت پر کئی بار حملے ہوئے اور ایسے بھی مواقع آئے جب ہم نے کھل کر ان ممبران سے کہا کہ آپ اپوزیشن کے نام پر ایسا واتاورن مت بنائیں کہ سارا اپوزیشن ہی بدنام ہو جائے۔ اس کی پرواہ انہوں نے نہیں کی۔ انہوں نے صرف ایک چیز کی پرواہ کی کہ اخبار میں کالم کب چھپتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخبار والوں نے ان کو او بلائج (oblige) کیا۔ ان کا خاص گروپ تھا جو ممبر جتنی شرارت کرتا ہے، پارلیمانی روایات کی جتنی بے عزتی کرتا ہے اتنا ہی نمایاں نام اس کا چھپنا چاہئے۔ لیکن جو constructive Suggestion دیتے، ہنگامہ آرائی نہیں کرتے تھے ان کے نام نہیں آتے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہوتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ پارلیمنٹ کے پریویلیج کو استعمال کر کے ایسی باتیں کہو جو آپ کو باہر کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ موشن آف پریولیجز اس سدن کا سب سے بڑا ایک حق تھا۔ لیکن اس موشن آف پریویلجز کو کتنی بار بری طرح استعمال کر کے اس کی قدر و قیمت ہی ختم کر لی گئی اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

دوسرے آپ جانتے ہیں الزام تراشی میں کتنا وقت ضائع ہوتا تھا۔ ایک بار جب شری ایل۔ این۔ مشرا کے لائسنس سیکنڈل کے سلسلے میں تحقیقات ہو رہی تھی تو میں نے کہا تھا کہ اس میں کل رقم ۱۲ ر لاکھ انوالو ہے لیکن ۱۰ ر لاکھ ہم نے صرف کیے ہیں۔ پارلیمنٹ میں اس بحثا بحثی کا مطلب کیا ہے؟ ایک سٹیج آئے گا جب اس ملک کی جنتا سوچے گی کہ یہ پارلیمنٹ ایک Irrelevant تماشا ہے۔ یہاں پر لوگ بحث سننے نہیں آتے تھے کہ ممبر ایک

دوسرے کو کنونس کرینگے بلکہ یہاں پر گیلریوں میں بہت سے لوگ اس لیے آ جاتے تھے کہ کوئی تماشا ہونے والا ہے۔ گیلریاں جتنی فل ہوتی تھیں اتنا ہی واقعی زوردار تماشا ہوتا تھا۔ اس کی روک کیوں نہیں کی گئی۔ سدن کے پاس اختیارات تھے، ان کو کیوں استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ سوال اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے اس ملک میں ہنگامے ہوتے رہے۔ ممبران پارلیمنٹ نے میمورنڈم پیش کیا کہ راشٹریہ سیوم سیوک پر پابندی لگنی چاہئے، جماعت اسلامی پر پابندی لگنی چاہئے، کانگریس کی شریمتی سبھدرا جوشی اور ششی بھوشن جی نے بہت سے ممبروں کے ساتھ مجھ سے دستخط کرائے ہیں کہ پابندی لگنی چاہئے کیوں کہ ان کا واتاورن جو ہے، ان کا کام جو ہے، وہ ملک کے لیے بہت خطرناک ہے۔ کیوں نہیں لگی پابندی؟ کس نے آپ کا ہاتھ روکا تھا پابندی لگانے پر؟ لیکن پابندی نہیں لگی۔

اس کے بعد مطالبہ ہوا، ٹوٹل ریولیوشن کا، بہار کی اسمبلی کو بھنگ کرو۔ بہت سے مطالبے ہوئے ہیں اور ان مطالبوں پر میں نے اپنی رائے ظاہر کی کہ ہم ان کے ساتھ متفق ہیں یا نہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی لوگ اپوزیشن کے ساتھ نہیں تھے۔ اپوزیشن کے ان سدسیوں کے ساتھ نہیں تھے۔ دو یا چار لوگ جو اس پارلیمنٹ میں ہنگامہ کرنے والے تھے وہ ایسے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ پارلیمنٹ سال بھر چلے کیونکہ جب پارلیمنٹ چلتی تھی تب ہی ان کا نام سنائی دیتا تھا۔ ان کا ویسٹیڈ انٹرسٹ ڈیولپ (develop) ہو گیا تھا لیکن یہ بائی اینڈ لارج آپ بھی جانتے ہیں، سارا ملک جانتا ہے کہ لوگوں کا بہومت انہیں کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔ مجھے کہتے ہوئے تکلیف بھی ہوتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ لوگ مسز اندرا گاندھی کے ساتھ تھے۔ لوگوں نے مسز اندرا گاندھی کو

بہومت دیا۔ باوجود اس کے کہ اپوزیشن نے جو کچھ کہا۔ کبھی کوئی الیکشن جیتا لیکن اپوزیشن والے جنرل الیکشن ہارے۔ اس میں کوئی سند یہہ نہیں ہے لیکن جب لوگ آپ کے ساتھ ہیں، جب قانون آپ کے ساتھ ہے، جب پارلیمنٹ کے رولز آپ کے ساتھ ہیں، پھر آپ کوئی کاروائی کیوں نہیں کرتے۔ ٹھیک ۱۲ جون ۱۹۷۵ تک آپ کچھ نہیں کرتے۔ قصہ کیا ہے۔ جیسا کہ انتھونی صاحب نے کہا ملک تباہ ہو گیا۔ انڈسپیلن ہو گیا۔ سب گوارا تھا آپ کو، سب منظور تھا آپ کو، بہومت آپ کے ساتھ ہے۔ حکومت ٹھیک سے چل رہی ہے۔ لیکن ۱۲ جون کو حادثہ ہو گیا اور ۱۲ جون کے بعد سارے خطرے نظر آنے لگے۔ کہیں سے کھوپڑیاں نظر آنے لگیں، کہیں سے تلواریں برآمد ہونے لگیں۔ میری سمجھ نہیں میں آتا یہ ۱۲/ جون کے بعد کیوں ہوا۔ آپ جن چار پانچ آدمیوں کے لیے انڈسپلن کا ذکر کر رہے تھے، بجائے اس کے کہ آپ ان چار آدمیوں کو سزا دیتے، ان کو آپ ڈسیپلن میں کرتے، آپ نے پوری قوم کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس ایوان میں اپوزیشن میں ایسے ممبر تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو لیکن آج وہ بھی پھنسے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ملزم کو آپ سزا دیتے آپ نے پورے ملک کو سزا دی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کیوں کیا آپ نے ایسا؟۔

You Should have hauled these criminals.You Should have hauled up those accused persons and not the whole of nation.

آج آپ نے ایمرجنسی کے نام پر کیا کیا؟ ایمرجنسی میں، میں اتفاق کرتا ہوں کہ حالات ایسے تھے کہ واقعی ڈراسٹک میجرز (Drastic

(measures لیے جانے چاہئے تھے۔ لیکن یہ ڈراسٹک میجرز کس کے خلاف آپ نے لیے ہیں۔ڈراسٹک میجرز آپ نے ساری نیشن کے خلاف لیے ہیں۔ ڈراسٹک میجرز آپ نے میرے خلاف لیے ہیں۔آپ نے ان لوگوں کے خلاف لیے ہیں، جو آپ کے ساتھ ہیں۔آپ نے ان کی آزادی ہڑپ کی ہے جو قانون کا احترام کرتے ہیں۔ یہ انصاف نہیں ہے، کہ آپ کسی کے بھی ادھیکار چھین لیں کیونکہ کسی ایسے شخص نے ایسی حرکت کی ہے جو آپ کو ناپسند ہے۔ پارلیمنٹ کے بڑے بڑے لوگ جو بڑا اہلہ کرتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کے سرکٹ گئے، لوگوں نے ان کے سرکاٹ لیے آج پھر آپ ایک بار ملک کے سامنے جائیں اور کہیں کہ وہ لوگ پارلیمنٹ نظام کو نہیں چلنے دیتے۔ آپ دیکھیں کہ جنتا آپ کو پھر بہومت دیتی اور ان لوگوں کو نکال دیتی۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔ایمرجینسی جو ۱۲/جون کو پیدا ہوگئی اور ۲۵/جون کو اپنی انتہا تک پہنچ گئی۔اس کی لمٹس کیا ہے۔

you have started a war against the people of this country.

اس ایوان کی حالت یہ ہے جیسا کہ ذکر ہوا ہے کہ گیلری بھی خالی ہے یہاں سے کچھ رپورٹ نہیں ہوسکتا ہے۔آپ کس سے ڈرتے ہیں؟ سب لوگ آپ کے چاہنے والے تھے آپ کو ڈر نہیں ہونا چاہیے تھا لگتا ہے اندر سے کچھ بھیڑ کا ڈر پیدا ہو گیا ہے، اور آپ لوگوں سے ڈرنے لگے ہیں۔ یہ بہت افسوس ناک بات ہے۔اس ملک میں اتنا بہومت کسی حکومت کا نہیں ہوا تھا" دو سٹیٹس (States) کو چھوڑ کر سارے ملک میں آپ کی حکومتیں ہیں۔ پارلیمنٹ میں ۳۵۰ سے زائد آپ کے ممبران ہیں اور کیا چاہئیے آپ کو

ڈیموکریٹک سیٹ اپ چلانے کے لئے؟ اس سے زیادہ یہ ملک دے نہیں سکتا۔اس کے بعد بھی آپ چاہیں آپ کو پاور دیئے جائیں،تو میں کہوں گا کہ یہاں پر اتنا بہومت اور سٹیٹس میں آپ کی گورنمنٹ ہونے کا کیا فائدہ ہے؟بہتر یہ ہے آپ کہئے ہم بڑے نالائق ہیں اتنے بہومت کے بعد بھی نہیں چلا سکتے،کوئی اور کوشش کرے۔

سینسر شپ کی لمٹس جو ہیں،مسز گاندھی نے یہاں پر اپوزیشن پر حملہ کیا اور آپ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔اپوزیشن کے آٹھ دس آدمی،آپ ان کو بند کریں اور ان کو جیلوں میں رکھ کر یہاں پر گالی دے دیں۔پارلیمنٹری ڈیموکریسی کا تقاضا تھا کہ جو کچھ آج آپ نے کہا ان کی موجودگی میں کہتیں۔اور (Proclamation of Emergrncy) پر ووٹ لیتیں۔

They would have been defeated: The whole world would have known that Atal |Bihari Vajpayee and Piloo Modi had their say and they were defeated by the majority.

لیکن یہ بہادری نہیں ہے۔اب اس کے بعد آپ تالیاں بجائیں،یا ان کو طعنے دیں۔مسز گاندھی یہ آپ نے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا۔مسز گاندھی کی اس ملک میں ایک بڑی زبردست امیج تھی۔یہ ملک ان کو ایک بہادر خاتون سمجھتا تھا۔۱۹۶۹ء سے لے کر اب تک جب جب انہوں نے حریفوں کو ہرایا،سارے ملک نے ان کی شان میں تالیاں بجائیں۔ہر بار انہوں نے اس ملک کی جنتا سے تالیاں وصول کی ہیں۔لیکن آج ایسا محسوس ہوتا ہے ان کے اندر کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔اپنے حریفوں کو ہرانے کا جو طریقہ انہوں نے

اختیار کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان لوگوں نے ان کو بہت گالیاں دی ہیں لیکن ان گالیوں نے ہی ان کو ایک سٹیچر (Stature) دیا ہے ۔ایک ڈیموکریٹک کنٹری کا ہیڈ بنایا۔

Yes in a Democracy, of course, certainly the opposition with all their imaginations and with all their efforts cannot dislodge her.

چیرمین صاحب میں یہ بات آج ہی نہیں کہہ رہا ہوں ۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے اخبار کے حوالے سے کچھ پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ جب ایمر جنسی لاگو نہیں ہوئی تھی تو میں نے اس وقت لکھا تھا۔ ''آج تو بہت سے لوگ مسز گاندھی کی تعریف میں قصیدے پڑھ رہے ہیں'' میں اپوزیشن لیڈروں کے بارے میں اس لیے بات نہیں کرر ہا ہوں کہ کیا فائدہ ہے۔ وہ تو پہلے ہی مرے ہوئے ہیں لیکن ایمر جینسی سے بہت پہلے ۱۲ر جون کے بعد میں نے اپنے اخبار کی ایک اشاعت میں جو لکھا تھا اس کو پڑھنا چاہتا ہوں تا کہ اس بات کا اندازہ ہو۔ آپ جانتے ہیں، میں کسی اپوزیشن پارٹی کو بیلونگ نہیں کرتا۔ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ کہاں تک صحیح ثابت ہوئی ہے۔ میں نے اس وقت کہا تھا مسز گاندھی آپ نے اپنے سٹیچر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ خاتون ایک بہادر خاتون ہے۔ بہادر عورت ہے ہر خطرے کا مقابلہ کرسکتی ہے لیکن ایمر جینسی پاور کے چھتر سایہ میں اپنے مخالفوں پر اس طرح سے وار کرینگی اس بات کی توقع نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں ان اپوزیشن پارٹیوں میں ویسٹڈ انٹریسٹ تھا۔ وہ پارٹیاں یہ جانتیں تھیں کہ الیکشن میں وہ آپ کو ہرا نہیں سکتیں۔ اسی لیے انہوں نے سوچا کی الہ آباد ججمنٹ کا سہارا

لیں۔ اگران میں ہمت ہوتی تو سپریم کورٹ ججمنٹ کا انتظار کرتیں۔ لیکن آپ نے اپوزیشن پر جس طرح سے اختیار کا استعمال کیا، اس سے دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ مسز گاندھی کرسی سے چپکے رہنا چاہتی ہیں۔ وہ قانون کا احترام کرنے کو رضا مند نہیں ہیں۔

اب میں اپنے اخبار سے کوٹ(Quote) کر کے سنانے جارہا ہوں۔

''یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حکومت زیادہ بد دیانت ہے یا حزب مخالف زیادہ بے اصول ہے۔ مسز اندرا گاندھی کے اخلاقی جرائم کی فہرست گنوانے والوں کا اپنا کردار اتنا مکروہ ہے کہ ان کے مقابلے میں اندرا گاندھی کا وجود بہر حال غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ وزیر اعظم کا استعفیٰ طلب کرنے والے لیڈروں کی فہرست پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان میں سے ایک نام بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کی اخلاقی حیثیت مشکوک، اور جس کا سیاسی کردار داغدار نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ پچھلے دس سال سے سیاسی میدان میں مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں ہر قدم پر شکست کھا کر اتنے مایوس اور مفلوج ہو گئے ہیں کہ اب تنکوں کا سہارا لے کر اپنی ڈوبتی کشتی کو کنارے لگانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ چھ ماہ بعد ہونے والے عام انتخابات میں بھی مسز گاندھی اور ان کی جماعت کے مقابلے میں جیت نہیں سکتے، اس لیے وہ سیاسی معرکہ آرائی کے بجائے ایک عدالتی فیصلے کا سہارا لے کر اپنے سب سے بڑے حریف مسز گاندھی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ ایسا کرتے ہوئے وہ بڑی بے دردی کے ساتھ اخلاقیات اور آداب سیاست جیسی اصطلاحیں استعمال کرتے رہتے ہیں، ان میں سے کون ہے جس نے اپنی سیاسی زندگی میں کبھی ان اصولوں اور اصطلاحوں کا احترام کیا ہے؟ مرارجی ڈیسائی،

اٹل بہاری واجپائی، راج نارائن، ان سیاسی بہروپیوں کی بات تو رہنے دیجیے،
اس دور کے نئے مسیحا جے پرکاش نارائن جی کو ہی لے لیجیے۔ انہوں نے ساری
زندگی فرقہ پرستی، مذہبی تعصب کے خلاف جنگ لڑی۔ لیکن آج اندرا گاندھی کو
نیچا دکھانے کے لیے جن سنگھ اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ جیسی جماعتوں کو قوم
پرستی اور حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ دیتے پھرتے ہیں۔ سیاسی اخلاقیات کے
دوسرے امام مرار جی ڈیسائی کا کردار ملاحظہ کیجیے، جو اپنے دورِ اقتدار میں
اپنے بیٹے کو ہر ممکن ناجائز مراعات دینے کے بعد بھی اپنی پارسائی کا دم بھرتے
رہے اور جن کی بے ایمانی کی تازہ ترین مثال گجرات کی سودے بازی ہے،
جہاں انہوں نے حصولِ اقتدار کے لیے اس چمن بھائی پٹیل سے مدد مانگی کہ
جس کے خلاف بدعنوانی کے ایک نہیں سینکڑوں الزامات ہیں، اور جس کی
حکومت کو گرانے کے لیے گجرات کے نوجوانوں نے اپنا لہو بہایا تھا۔ اس
موقعہ پرستی اور جاہ پسندی کے خلاف نئے دور کے مسیحا جے پرکاش بابو نے
ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ اٹل بہاری واجپائی کی سیاست کے متعلق کچھ نہ کہنا
ہی بہتر ہے۔ یہ قاتلوں اور خونیوں کی اس جماعت کے سربراہ ہیں کہ جن کا
واحد مقصد اس ملک کی سیکولر بنیادوں کو کھوکھلا کر کے یہاں ایک ہندو راج قائم
کرنا ہے۔ اب رہے راج نارائن جیسے مسخرے، ان کے بارے میں صرف یہ
کہنا کافی ہے کہ یہ لوگ پارلیمنٹری جمہوریت کے ماتھے پر ایک کلنک ہیں اور یہ
ہمارے جمہوری نظام کی کمزوری ہے کہ اس قماش کے لوگ ملک کے اعلیٰ ترین
ایوانوں میں جگہ پاتے ہیں۔ میں پچھلے پانچ سالوں سے جمہوریت اور
پارلیمنٹری نظام کی دھائی دینے والے ان سبھی اداکاروں کو بہت قریب سے
جانتا ہوں اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے ایک بھی اس

قابل نہیں ہے کہ اس کی نیت، اس کے فہم اور اس کے خلوص پر بھروسہ کر کے اس کی بات کا اعتبار کیا جائے۔ یہ سب لوگ اقتدار کے متوالے ہیں۔ انہیں اندرا گاندھی سے صرف یہ شکایت ہے کہ یہ ان کے عزائم، ان کے ارادوں اور منصوبوں کے تعمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ خدانخواستہ اگر ان کے ہاتھ میں ملک کی تقدیر اور اقتدار آ جائے تو یہ ملک اس قابل نہیں رہے گا کہ یہاں شریف، خوددار اور باعزت انسان رہ سکے"۔

مسز گاندھی کے موجودہ رویّے کو کوئی بھی باشعور اور دیانت دار انسان حق بجانب قرار نہیں دے سکتا۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھ جیسے اندرا گاندھی کے وکیل کا مقدمہ بھی ۲۵ رجون کو کمزور ہو گیا، جب مجھے معلوم ہو گیا کہ جس کے پاس اتنی سیاسی طاقت ہے، اتنی طاقت ہے، وہ اب ایمرجنسی کا سہارا لے کر اپنے دشمنوں کو خاموش کرنے کو تیار ہوئی ہے، آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے دن بھی اس ایوان میں اپوزیشن ممبروں کو یہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی کہ اب نئے نظام کو سمجھئے۔ آپ "کوسچن آور" کی بات کر رہے ہیں۔ جو سسپنڈ (suspend) ہوا ہے لیکن مجھے تو یہ خطرہ لگ رہا ہے کہ پارلیمنٹری نظام سسپنڈ ہونے جا رہا ہے اور جو ابھی تک ہوا ہے، اسے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ یہ پارلیمنٹ شاید اس ملک کی آخری پارلیمنٹ ہو۔ اس کی شہادت مسز گاندھی کا وہ بیان ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پری ایمرجینسی (Pre-emergency)، نارملسی اب واپس نہیں آ سکتی۔ جس کا نام انہوں نے لائسینس رکھا ہے، لائسینس کیا ہوتا ہے۔ جس ملک میں ایک شخص فیصلہ کرے گا کہ نارملسی کیا ہوتی ہے، فریڈم کیا ہوتی ہے۔ اس ملک کے دروازے پر ڈکٹیٹرشپ دستک دیتی ہے۔

مسز گاندھی ڈکٹیٹر نہیں ہیں۔ لیکن ڈکٹیٹر شپ کے راستے پر چلنے لگی ہیں۔ ڈکٹیٹر شپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ شروع میں اس کے لیے اصولوں کو بڑی خوبی سے تراشا جاتا ہے۔ خوبصورت الفاظ میں تراشا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو اس میں مزا آنے لگتا ہے اور پھر آدمی کہنے لگتا ہے کہ یہی جمہوریت کے اصول ہیں۔ یہ بات صرف یہاں ہی نہیں، روس، جرمنی یا دوسرے ملکوں میں جہاں ڈکٹیٹر شپ ہے، عام طور پر لوگ جمہوریت کی دہائی دیتے ہیں۔ مسز گاندھی سے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ بڑی صاف گو عورت ہیں جو کچھ کہنا چاہتی ہیں صاف گوئی سے کہتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ پارلیمنٹری نظام سے ان کا وشواس اٹھ گیا ہے۔ بڑی خوبی کی بات ہے اگر وہ صاف کہیں کہ اس نظام کے لیے آج اس ملک میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی وجوہات چاہے جو بھی ہوں اس میں میں نہیں جانا چاہتا۔

آج تو لوگ کہہ رہے ہیں کہ کوسچن آور سسپینڈ ہوا اور سنسر شپ کیوں ہے۔ ہماری تقریر کیوں نہیں جاتی ہے۔ یہ ۲۷ برس پرانی عادت ہے۔ ہم میں یہ عادت پیدا ہوگئی ہے کہ چاہے جو کہیں اسے کہنے کا ہمیں حق ہے اور اس بات کو اخباروں میں چھاپنے کا حق ہے لیکن اب وہ دن گئے۔ اب نئے دور کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہوگا۔ اب وہی خبریں جائیں گی جو مجھے پسند ہوں۔ وہ ہو جائے گا جو میں چاہوں گی۔ میں کوئی نئی آزادی نہیں چاہتا اور مسز گاندھی، میرا خیال ہے فی الحال کوئی اور آزادی دینے کو تیار بھی نہیں ہیں۔ لیکن جو کچھ اس ایوان میں ہوا ہے، وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ ایسا کرنے میں آپ کو کیا تکلیف ہے۔ اگر جنتا آپ کے ساتھ ہے۔ اگر آپ کے ساتھ بہومت ہے۔ اگر حکومت آپ کے پاس ہے تو دنیا کو یہ معلوم ہو کہ شمیم احمد شمیم نے کیا کہا۔

میں پوچھتا ہوں اس سے کون سا انقلاب آ جائے گا۔اس سے کوئی انقلاب نہیں آئے گا لیکن شاید آپ یہ سوچتے ہوں کہ اتنا بھی باہر جانے سے آپ کا سنگھاسن ہلنے لگے گا۔ایک بات سوچیئے۔کس کس نے آپ کی حمایت کی؟ آج منشی صاحب چلا رہے تھے،کس نے ہماری مخالفت کی۔امریکہ نے مخالفت کی،سوویت یونین نے مخالفت کی،جی نہیں۔آپ کی حمایت بھی ہوئی ہے۔پاکستان نے ظاہر تو کچھ نہیں کیا،لیکن بائی امپلیکشن حمایت کی۔روس نے حمایت کی۔شاہ ایران نے حمایت کی،ان کے پاس ایک اخبار نویس کو بھیجا گیا جس پر شاید سنسر نہیں ہے کہ وہاں سے وہ فرمان لائے۔شاہ ایران جو دنیا کا سب سے جابر حکمران ہے،اس نے آپ کی ایمرجنسی کی حمایت کی۔میں آپ سے اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں،ایسا نہ ہو کہ آپ مغالطے میں رہیں۔جمہوریت کا استحصال کریں اور رفتہ رفتہ آپ کو اطمینان ہو جائے۔

This country does not deserve a Parliamentary democracy.People are not educated enough to understand. I will say that in spite of the fact that people gave you more than what you deserve,only because few individuals did not behave properly, you are punishing the whole nation.Did you not hold the world's greatest rally after the Allahabad judgement? Did not the all India Radio and the people are with Mrs.Indira Gandhi.Then why this action aganist the whole nation? Only because Mr.

Jayapraksh Narain and few others mis-behaved.

اگر آپ کو اس اصول کا نظام بدلنا ہے تو صاف کہیئے ۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پارلیمنٹری سسٹم ٹھیک نہیں ہے، تو ختم کیجئے تا کہ نہ سر رہے نہ درد سر۔ لیکن جھوٹ نہ بولیئے ۔ مسز گاندھی آپ کی عادت جھوٹ بولنے کی نہیں تھی لیکن ڈکٹیٹر شپ کا سب سے پہلا خاکہ یہ ہے کہ آدمی جھوٹ بولنا شروع کرتا ہے۔ آج آپ نے اپنی تقریر میں کئی جھوٹ بولے ہیں۔

جولائی ۱۹۷۵ء

آئینی ترامیم

عدلیہ پر حملہ

ابھی سالوے صاحب جب تقریر کر رہے تھے تو میں نے یہ گستاخی کی تھی اور یہ درخواست کی تھی کہ اب آپ تشریف رکھئے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ میں انہیں روکنا چاہتا تھا بلکہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ سالوے صاحب اپنا مقدمہ اپنے آپ تباہ کر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ان سے یہ کہا کہ اگر آپ تشریف نہیں رکھتے تو آپ کے خلاف ڈگری ہو جائیگی۔ انہوں نے اس کو برا مانا اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

تقریر سن کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا ہی نہیں بلکہ تمام ججوں کی تقرری کا اختیار نہیں ہونا چاہیئے، ان کی تقریر سن کر بار بار میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر کیا دلیل انکے پاس ہے؟ کیا لاجک ہے؟ کیا ریشنل ہو سکتا ہے کہ سینیارٹی (Seniority) کے اصول کو ترک کر کے اپنی مرضی کے جج کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بنایا جائے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سوال یہ ہے کہ سالوے صاحب یا اور کوئی ممبر جو ہاؤس میں ہے وہ کیوں ہے۔ اس لیے کہ باقاعدہ ایک قانون کے تحت الیکشن ہوا، پریزائڈنگ آفیسر مقرر ہوا، لوگوں کو ووٹ ڈالنے کے لئے کہا گیا، اگر ایک ووٹ بھی زیادہ آیا تو ممبر یہاں کے لیے چنا گیا چاہے وہ دوسرا آدمی کتنا بھی قابل کیوں نہ ہو، اگر اس کے پاس ووٹوں کی ایک مقرر تعداد نہیں ہے

تو وہ اس ایوان میں نہیں آسکتا۔ اس کے معنی ہیں کہ یہاں ایوان میں آنے کے لئے بھی ایک قانون، ایک سسٹم، ایک انسٹی ٹیوشن قائم کیا گیا۔ بعض اوقات صرف قانون کا احترام کرنے سے ہی قانون کا صحیح احترام نہیں ہوسکتا۔ اس وقت امریکہ کے اندر نکسن ہر مسئلہ پر اپنی ہر مشکل اور الجھن کے لئے قانون کا اور آئین کا سہارا لے رہے ہیں اُن سے کہا گیا کہ ٹیپ سرنڈر کریں۔ انہوں نے کہا کہ کونفیڈنشیلٹی آف دی پریذیڈنسی (Confidentiality of Presidency)، ان سے کہا گیا کہ آپ واٹر گیٹ کمپنی کے سامنے آئیں، اس میں بھی قانون کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح سے سپر سیشن میں بھی حکومت نے اور حکومت کی طرف سے بولنے والوں نے قانون اور آئین کا سہارا لیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ شبہ کیوں پیدا ہوا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ شبہ اس لیے پیدا ہوا کہ جن حالات میں سینئر موسٹ جج کو نظر انداز کیا گیا، وہ مشکوک تھے۔ جن لوگوں نے کیا اُن کا اپنا کردار مشکوک تھا۔ اگر یہ کام کسی ایسی حکومت نے کیا ہوتا جس پر ہمارا وشواس ہوتا تو یقیناً اتنا ہلہ نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے ہوا کہ ایک خاص ججمنٹ کے فوراً بعد جب کہ لاء کمیشن کی سفارشیں ۱۰ سال پہلے کی تھیں خاص ایک مقدمے میں، خاص ایک جج کے سلسلے میں اس قانون کا استعمال ہوا۔ میں نے اس وقت بھی یہ بات کہی تھی اور آج بھی یہ بات کہتا ہوں۔ آپ نے اس وقت یہ دلیل تھی کہ سپریم کورٹ کے کچھ جج پروگریسیو ہیں اس لئے پروگریسیو جج کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے تو مجھے ان لوگوں کے پروگریسیو ہونے پر شک ہے یہ کون سے انقلابی ہیں؟ کون سے ریولوشنری ہیں(revolutionay) جو وایا(via) سپریم کورٹ چیف جسٹس انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ خود ان کا

پروگریسیو ہونا مشکوک ہے۔ ان سے زیادہ پروگریسیو تو اس سائیڈ میں بیٹھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ برلا ٹاٹا کے ٹھیکیدار ہیں۔ ان کو خود ان کی نیت پر شک ہے۔ پھر یہ لوگ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم زیادہ پروگریسیو ہیں۔ ہم اپائنٹ کرینگے؟۔

دوسری بات: جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سپریم کورٹ کے کچھ جج پروگریسیو ہیں اور کچھ ریٹروگریسو ہیں تو اس وقت کیا ہوگا جب عدالت کے سارے جج پروگریسیو کہلائیں گے۔ جیسے اس وقت ایک آدمی کو چیف جسٹس بنانا تھا تو پرائم منسٹر، گوکھلے صاحب اور پولیٹکل آفیسرز کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ فلاں جج بڑا پروگریسیو ہے اور اس کو اپائنٹ کر دیا گیا لیکن جب سارے جج پروگریسیو ہونگے تو اس وقت کون سا کرائیٹرین استعمال کیا جائے گا؟ کیا اس وقت سینیارٹی کا خیال کیا جائے گا؟ اگر اس وقت سینیارٹی کا خیال کیا جائے گا تو اس وقت کون سی سینیارٹی کے سانپ نے کاٹا ہوگا۔ اس وقت جو بھی آدمی پرائم منسٹر کو پسند ہوگا، قانون منتری کو پسند ہوگا۔ کیوں پسند ہوگا اس کی اگر وجوہات ہو سکتی ہیں، اس کو بنا دیا جائے گا۔ اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس سسٹم کو تباہ کر رہے ہیں۔

میری رائے صاحب سے ملاقات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت اچھے آدمی ہوں۔ لیکن سوال آدمی کا نہیں، سوال انسٹی ٹیوشن کا ہے، سسٹم کا ہے۔ ہم اس کنٹری میں ایک سسٹم کو، ایک انسٹی ٹیوشن کو پروجیکٹ کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا انہوں نے کہا کہ وہ سسٹم خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ مجھے خطرہ اس وقت نظر نہیں آرہا ہے۔ اس وقت رائے صاحب اکیلے آدمی ہونگے۔ لیکن کل کو یہ ہتھیار میرے دوست واجپائی جی کے ہاتھ میں چلا جائے گا تو وہ بھی یہی مثال دینگے۔ جو آج شریمتی اندرا گاندھی نے دی ہے اور واجپائی جی کسی آر۔ ایس۔ ایس کے

ماننے والے کو سپریم کورٹ کا جج بنادینگے اور کہیں گے کہ میرے نکتہ نظر میں وہ بڑا پروگریسیو ہے۔

سوال یہ ہے کہ آپ نے اس انسٹی ٹیوشن کو ڈیسٹرائے کر کے یہ خطرناک ہتھیار خطرناک ترین آدمی کے ہاتھ میں دیا ہے۔

ابھی جب میں تقریر سن رہا تھا تو معلوم یہ ہو رہا تھا کہ بازار میں کوئی ڈاکٹر دوائی بیچ رہا ہے اور اپنی دوا کی تعریف اور گن گا رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم غریبی کو ہٹانا چاہتے ہیں، ہم انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ مجھ کو بتایئے، بینکوں کا نیشنلائزیشن ہوا، پریوی پریس کا معاملہ آیا اس کو سارے سدن نے سپورٹ کیا۔ آپ نے غریبی ہٹانے کے سلسلے میں جو پروگرام ہمارے سامنے رکھے ہم نے اس کو بھی مانا، اب اس بات کو ایک سال ہو رہا ہے۔ بتایئے اس دوران رائے صاحب نے کون سا تیر مارا، کون سی غریبی ختم کر دی۔ آج واجپائی جی مجبور ہو کر کہنے لگے، ہماری پرانی غریبی ہی ہم کو واپس دے دو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کیا دوائی بیچنا کوئی Contemptous ایکٹ ہے۔ یہاں باقاعدہ لوگ دوا بیچنے کا لائنسیں لیتے ہیں۔ کبھی کسی کو پولیس نے نہیں پوچھا کہ دوا کیوں بیچتے ہو، میں تو صرف موڈ آف سپیچ کو ایکسپلین کر رہا تھا جو دوا بیچتے ہیں وہ اس قسم کی تقریریں کر کے لوگوں کے جذبات ابھارتے ہیں۔ وہ یہ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دیتے ہیں کہ وہ دوائی ان کے حق میں ہے بھی یا کہ نہیں۔

میں عرض کرر ہا تھا کہ سپریم کورٹ کے جج کس تاریخ سے ریٹروگریٹو اور کنزرویٹو ہو گئے۔ یہ سوال میں نے پہلے بھی پوچھا تھا اور آج بھی پوچھتا ہوں، ان سپریم کورٹ کے ججوں کو سپریم کورٹ تک لے جانے کی ذمہ داری کس کی

تھی، جج بنانے سے پہلے آپ نے ان کے بغل میں اور منہ میں تھرمامیٹر رکھا تھا کہ یہ پروگریسیو ٹیمپر یچر کے ہیں اور یہ ریٹروگیسو ٹمپریچر کے ہیں۔ آپ نے جج بنایا ۔چن چن کران کو ہائی کورٹ سے اٹھایا اور اس کرسی پر پہنچایا۔ ۱۴؍برسوں سے سن رہے تھے کہ بڑے شاندار جج ہیں ان کے ججمنٹ کا بڑا احترام ہوتا ہے۔ کتنا کریڈٹ ان کو دیا جاتا رہا ہے۔ ہماری جوڈیشری کتنی انڈیپینڈنٹ (independent) ہے۔ لیکن کس تاریخ سے ان ججوں کا پارا اتر گیا۔ کس تاریخ سے شک ہو گیا کہ وہ ریٹروگریسو ہو گئے یہ پتہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان کو جج بنانے کی ذمہ داری کس پر تھی۔ میرے پتاجی پر تھی یا آپ کے پتاجی پر تھی۔ جب آپ نے بنایا اور اپنے سسٹم میں ان کی عزت تھی تو آج ان کی پگڑی کو کیوں چھین رہے ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں۔ ان میں کمزوری بھی ہو سکتی ہے۔ اب آپ نے جس کو جج بنایا ہے کیا وہ آدمی نہیں ہے۔ کیا ان کو ڈرائی کلین کیا۔ ان کے ذہن کو ڈرائی کلین کیا، اب ان میں کوئی کمزوری نہیں رہی؟۔

چیرمین صاحب: ابھی تو صرف ایک ہی جج بدلا ہے۔ لیکن سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کے علاوہ باقی جو تیرہ ججز ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ ابھی تک سپریم کورٹ میں کمزور ججز، بیک ورڈ لوکنگ (backward looking) ججز تھے لیکن اب بڑے انقلابی جج آ گئے ہیں اور بڑا بھاری انقلاب لانے والے ہیں۔ ان ۱۳؍ججوں کے بارے میں آپ کیا سوچ رہے ہیں کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جب تک ان میں سے ایک ایک جج ریٹائر نہ ہو جائے تب تک اس ملک کی جنتا منتظر بیٹھے گی، کب یہ ہٹیں گے تاکہ فارورڈ لکنگ لجسلیشن (forward looking legislation) پاس ہوں۔

آپ کے پاس سمودھان تبدیل کرنے کے لیے تمام اختیارات ہیں۔ آپ نے بہت بار سمودھان کو تبدیل کیا ہے۔آپ ایک بار نہیں، پچاس بار نہیں، بلکہ سو بار ترمیم کیجئے یہ ججمنٹ اگر ہمیں سوٹ نہیں کرتا ہے یا ان کے ججمینٹ پراگریسیو نہیں ہیں تو امنیڈ مینٹس لائیے۔آپ نے ایسا کیا بھی ہے۔ بات بات پر کیا ہے۔اب کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی انسٹی ٹیوشن کو ڈسٹرائے کر رہے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس بار سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے ایمپلائمنٹ پر سارے ملک میں سپریم کورٹ کے کردار کی تنقید ہوئی۔ان کے لیے بیک ورڈلکنِگ اور کنزرویٹو الفاظ کا استعمال ہوا۔اس کے بعد یہاں مرحوم کمار منگلم صاحب نے ایسی باتوں کا اظہار کیا جسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کے سارے ججز نکمے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوڈیشری کا سارے ملک میں جو پرسٹیج تھا وہ گر گیا۔جوڈیشنری کے وقار کو خاک میں ملا دیا گیا۔آج تک کسی کو ان کی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں خود بھی ان کے خلاف کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا کیونکہ اس میں کنیٹمپٹ آف کورٹ (contempt of court) کی بات آجاتی تھی۔لیکن جب پرائم منسٹر اور ان کے ساتھیوں نے، ان کے چمچوں نے ہی کہنا شروع کر دیا تو آنے والے زمانے میں کیا انجام ہوگا۔اس لیے آپ نے چیف جسٹس کو اپوئنٹ ہی نہیں کیا ہے بلکہ سارے ملک کو ڈس اپوئنٹ کیا ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہتا ہوں: اکثر دیہات میں جب کسی کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی، اس کے ساتھ انیائے ہوتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ میں سپریم کورٹ تک جاؤں گا۔تم سے سپریم کورٹ تک جا کر لڑوں گا، انصاف حاصل کروں گا، لیکن آج اُسی دیہاتی سے کہا گیا ہے کہ تم جس سپریم کورٹ کو سمجھتے تھے کہ انصاف کا بڑا مندر ہے، وہ تو

ناانصافی کا ڈین (den) ہے، دوسرے ملکوں میں سمگل کرنے کا اڈہ ہے۔ یہ آپ نے بتایا کہ اب سپریم کورٹ سے لوگوں کا وشواش اٹھ جائے اس سے پہلے خیال تھا کہ کبھی کوئی زیادتی کرے گا تو سپریم کورٹ کے پاس جائینگے۔ آپ نے کہا سپریم کورٹ کے پاس مت جائیے۔ پارلیمنٹ سپریم ہے۔ لیکن پارلیمنٹ کی سپرمیسی کسی مینر (manner) میں، کسی میتھڈ (method) میں ایکسپوز ہوگی یا جو بھی کچھ آپ چاہیں وہ ہوسکتا ہے۔ میری گذارش ہے کہ میں سینئر موسٹ کے اصول پر ضد نہیں کرتا لیکن چونکہ مجھے اپنے حکمرانوں کی نیت، ان کے چال وچلن پر شبہ ہے، ان کے کریکٹر پر شبہ ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ایسا طریقہ پیدا ہونا چاہیئے جس سے کہ کم سے کم اس بات کی ضمانت ہو کہ ایگزیکٹو کو وقتاً فوقتاً اپنی مرضی کا جج بنانے کی نوبت نہ آئے۔

جو اس سارے سسٹم کو ایک شخص یا دوسرے شخص کی مرضی پر نہ چھوڑ دے۔ آپ نے سپریم کورٹ کے ساتھ انیائے کیا ہے اس کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن میں آخیر میں اقبال کا شعر پڑھنا چاہتا ہوں کیونکہ سالوے صاحب نے اقبال کے شعر کا غلط استعمال کیا اور میں اس کا صحیح استعمال کرنا چاہتا ہوں:۔

خداوندہ یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ابھی ہم سوچتے تھے سپریم کورٹ کے درویش جو ہیں، سلطانوں نے فیصلہ دیا ان کی نیت بھی ٹھیک نہیں ہے، ان کی نیت آپ نے کہا ٹھیک نہیں ہے آپ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ آپ کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور ہم سوچتے ہیں ملک کا کیا ہوگا۔ خدا ہی بچائے اس ملک کو۔

نومبر ۱۹۷۳ء

جے۔ پی۔ تحریک
اِقدار کی جنگ

شری ایس۔ اے۔ شمیم، سرینگر: سبھاپتی جی! پارٹیوں کے نمائندوں کی بات آپ نے سنی۔ میرا خیال ہے کہ اس ساری بحث میں ایک ہی پارٹی لیس (Partyless) ممبر حصہ لے رہا ہے اور اس لحاظ سے پارٹی لیس ڈیموکریسی کے کانسپٹ کو آگے بڑھانے میں اگر کسی کا کوئی حصہ ہوسکتا ہے تو وہ میرا ہے۔

میں سب سے پہلے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ بہار کی حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ جے پرکاش نارائن اور بہار کے لوگوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آپ زیادہ دیر تک ان لوگوں کے جذبات کو، انکے مسائل اور انکی مشکلات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جے پرکاش جی ایک سمبل (symbol) ہیں۔ جے پرکاش جی پر الزام لگا کر کہ وہ سی۔ آئی۔ اے کے ایجنٹ ہیں، آج بہار کی جو حقیقت ہے، ستتھی ہے اسکو نظر انداز نہیں کر سکتے آپ ہندوستان کی ۱۴ زبانوں میں سے کوئی بھی زبان نہیں سمجھتے، اس لئے آپ کو کیا معلوم ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکہ دے سکتے ہیں، دنیا کو دھوکہ نہیں دے سکتے ہیں۔ جے پرکاش جی کے ساتھ میرے کچھ اصولی

اختلاف ضرور ہیں، پرنسپل کے اختلاف ضرور ہیں۔ ان کی میں چرچا کروں گا لیکن ان کی حب الوطنی پر، ان کے پیٹریاٹزِم Patriotism پر، انکی نیک نیتی پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جو ان کی نیک نیتی پر شبہ ظاہر کرتا ہے، مجھے اس کی دیانت پر شبہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جے پرکاش نارائن نے ۲۷ سال انتظار کرنے کے بعد جو راستہ اختیار کیا ہے تو اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنھوں نے عقل کی بات، ریشنلٹی (rationality) کی بات، سنجیدگی کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ ورنہ جے پرکاش نارائن اس بڑھاپے میں اتنا بڑا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں اٹھاتے۔ اس درد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس آواز کو سننے کی ضرورت ہے، جس نے مجبور کیا جے پرکاش نارائن کو جب انکی زندگی کا چراغ ٹمٹمار ہا ہے تو انہوں نے اپنے کندھوں پر اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالی۔ اس لیے جے پرکاش نارائن پر انگلی اٹھانے والوں سے میں یہی کہوں گا کہ جے پرکاش نارائن پر انگلی اٹھاتے وقت آپ ہندوستان کی زمین پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی شخصیت پر انگلی اٹھاتے ہیں اور آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس پرکار کے ایوانوں میں بیٹھ کر اس دیانتدار اور شریف آدمی کے جذبے کو آپ ٹھکرا دیں۔ ہوسکتا ہے جے پرکاش جی نے فیصلے کی غلطیاں کی ہوں، ان سے اور غلطیاں ہوئی ہوں، لیکن انکی نیت پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ میں خاص طور سے اس بات کی طرف توجہ اس لیے دلانا چاہتا ہوں کہ حکمران طبقے کی طرف سے بہار کے لوگوں کو بالخصوص اور ہندوستان کے لوگوں کو بالعموم یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جے پرکاش نارائن دراصل ایک مسلم وزیر اعلیٰ کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔ میں جے پرکاش نارائن کو جانتا ہوں۔ میرے سامنے انکی زندگی کی تصویر ہے۔ ان پر ہزار قسم

کے الزام لگ سکتے ہیں، لیکن جے پرکاش نارائن جیسا سیکولرسٹ ہندوستان میں دوسرا کوئی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ انکی ہمدردی کیا ہے، انکے جذبات کیا ہیں؟ انکی بات ماننے والی تھی۔ مردولا سارا بائی اور وملا ککر جنہوں نے ہندوستان کے فساد کے علاقوں میں جا کر جہاں فرقہ پرست جماعتوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا، انکو حوصلہ دیا........

SHRI H. K. L. BHAGAT:I want to give him the information that about late Mrs. Mridula Sarabai whom he mentioned the Jana Sangh even opposed the condolence message in the Corporation.

شری ایس۔اے۔شمیم: بھگت جی ذرا شانتی سے کام لیں۔ میں انکی بات بھی کروں گا۔

میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ وہ جے پرکاش نارائن سے انسپی ریشن(insrpiration) لیتی رہیں تھیں اور انہوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بیشتر علاقوں میں جا کر مسلمانوں کو تسلی دی۔آج صرف اس لیے کہ بہار کا کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا بائی ایکسڈنٹ(By-accident) happens to be a Muslim اس کے لیے جے پرکاش نارائن پر یہ الزام لگایا جائے کہ وہ مسلم چیف منسٹر کا وجود برداشت نہیں کر سکتے.....

شری محمد جمیل الرحمان: (کشن گنج) سبھاپتی مہودیہ، میرا پوائنٹ آف آرڈر ہے۔ کس قدر irrelevant بات کی ہے یہ جو انہوں نے کہا ایرا غیرا نتھو خیرا، کیا یہ پارلیمنٹری ہے؟ دوسری بات انہوں نے اپنی سپیچ کی بگننگ (شروع) میں کہی کہ سارے بھارتی نیتا بول چکے، پہلی ورڈنگ(wording) یہی ہے

ان کی، تو کیا مطلب ہے ان کے یہ کہنے کا؟ کیا اپنے کو وہ بھارت سے الگ سمجھتے ہیں؟ اور ایرا غیرا نتھو خیرا جو انہوں نے کہا کیا یہ پارلیمنٹری ہے؟۔

Shri.S.A.S: I dismiss this interruption with the contempt it deserves.

Shri.M.Jamil-ul Rahman: I also dismiss with the cotempt his vulgar language.

شری ایس۔ اے شمیم: میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جے پرکاش نارائن کا سیاسی سطح پر مقابلہ کیجئے۔ ضرورت پڑے تو لاٹھیوں سے بھی زخمی کیجئے۔ کمیونلائز (communalise) کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ ہزاروں شکلیں ہیں جے پرکاش کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ ضرور کیجئے لیکن اس میں کیمونل ایلمینٹ انٹرڈیوس کر کے ملک کی فضا کو خراب کرنے کی کوشش مت کیجئے۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں، میں نے اظہار کیا کہ جے پرکاش نارائن سے میرا کچھ اصولی اختلاف ہے۔ وہ اصولی اختلاف دو سطحوں پر ہے۔ ایک اس سطح پر ہے کہ میں سمجھتا ہوں، میرا ایمان ہے کہ اس ملک کی حکومت نے، اس موجودہ حکومت نے ملک کا ناش کر دیا ہے۔ غریب کی کمر توڑ دی ہے اور اس ملک میں ساری برائیوں کی ذمہ دار یہ حکومت ہے۔ بہار میں کورپشن کی ذمہ دار یہ حکومت ہے۔ تو میرا مطالبہ یہ ہے کہ اس حکومت کو ختم ہونا چاہئے اور یہ حکومت چونکہ طاقت draw کرتی ہے اس پارلیمنٹ سے، اس لیے اس پارلیمنٹ کو بھنگ کر دینا چاہئے۔ کیا وجہ ہے کہ آپ نے صرف بہار میں اسمبلی کے ڈیزولیوشن کا مطالبہ کیا؟ آپ کیا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس پارلیمنٹ میں اور اس حکومت میں آپ کا اعتماد ہے؟ آپ بہار میں اسمبلی بھنگ کر کے

انڈائریکٹلی (indirectly) اس حکومت پر کانفڈینس کا پرستاو پاس کررہے ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اس حکومت کو بھی رہنے کا حق نہیں ہے۔ اس لیے اصولی طور پر جب جنتا کو یہ محسوس ہو کہ یہ حکومت ناکام ہوئی ہے ان مسائل کو حل کرنے میں جن کے لیے اس کا انتخاب ہوا تھا تو اس حکومت کو جانا چاہئے۔ بہار کا آپ نے کیوں مخصوص ایک ایریا الگ ایجاد کیا ہے؟ اور اگر بہار میں یہ اصول مان لیا جائے تو پھر کل کس ریاست میں اس اصول کو ٹوکیں گے، کس کو روکیں گے؟ اس صورت میں آپ یہ طے کیجئے کہ آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ ایک اصولی اختلاف تو یہ ہے۔

دوسرا اصولی اختلاف یہ ہے کہ جے پرکاش نارائن کے سیکولرزم پر مکمل وشواس رکھتے ہوئے میں جے پرکاش نارائن کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس ایجی ٹیشن کے ساتھ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کا شامل ہونا جو ہے اس نے اس تحریک کا کردار مشکوک کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جے پرکاش نارائن دق کے مریض نہیں ہیں۔ انہیں ٹی۔ بی نہیں ہے۔ لیکن جے پرکاش نارائن کو جاننا چاہئے کہ دق کے مریضوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا صحت کے لیے بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ جراثیم جو ہیں آر پار ہو جاتے ہیں۔ اگر مائینا رٹیز (minorities) میں ابھی تک سسپشن (Suspicion) رہا ہے اس موومینٹ کے بارے میں تو وہ اس لیے کہ اس تحریک کے ساتھ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کا وجود ہے۔ اٹل بہاری واجپائی نے سوال کیا کہ کون ہے جو جے پرکاش نارائن کی حب الوطنی کو، ان کے پیٹریاٹزم کو چیلنج کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ لیکن جن سنگھ نے کیا ہے۔ مجھے یاد ہے آج سے آٹھ دس سال قبل جن سنگھیوں نے جے پرکاش نارائن کو چاندنی چوک میں جلسہ نہیں کرنے دیا۔ پتھراؤ کیا۔ انہیں غدار کہا۔ جب وہ کشمیر میں

انصاف کی بات کہتے ہیں، جب وہ پاکستان کے ساتھ دوستی کی بات کرتے ہیں تو یہ سور ما انہیں پاکستانی جاسوس کہتے ہیں، ان پر پتھراؤ کراتے ہیں۔ آج مجھے حیرت ہے کہ کس طرح سے، کس بنا پر جے پرکاش نارائن کی حب الوطنی جن سنگھ کی نگاہوں میں قابل احترام ہوگئی۔ جے پرکاش نارائن کہتے ہیں کہ میں ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے رشتے کو مانتا ہوں۔ شیخ صاحب بات کررہے ہیں اندرا جی کے ساتھ۔ جے پرکاش نارائن بات چیت کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن اٹل بہاری واجپائی اور مسٹر ایڈوانی کہتے ہیں کہ بات مت کرو۔ اس چیز میں جے پرکاش نارائن لیڈر نہیں ہیں۔ جے پرکاش نارائن لیڈر صرف اس وقت ہیں جب جن سنگھ کے سیاسی مفادات کو تقویت پہنچے۔ جے پرکاش نارائن پنساری کی دوکان نہیں ہیں کہ جس وقت اٹل بہاری واجپائی جی چاہیں اٹھنی دے کر سودا خریدیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں کیا اٹل بہاری واجپائی جی تسلیم کریں گے کہ کشمیر کے سوال پر جو بات چیت ہورہی ہے، جے پرکاش نارائن اس میں ثالث بنیں اور آپ کو ان کا فیصلہ منظور ہوگا؟ نہیں ہوگا کیونکہ جن سنگھ کے فرقہ دارانہ مفاد کو اس سے تقویت نہیں پہنچے گی۔ اس لیے جے پرکاش جی کو میں چیتاونی دینا چاہتا ہوں، انہیں میں اطلاع فراہم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی سیاسی صحت بہت اچھی ہے، سیاسی شہرت بہت اچھی ہے، آپکی شہرت خراب ہوجائیگی، آپ کو کمیونلزم کی ٹی۔ بی ہوجائیگی اگر آپ نے یہ بیڈ کمپنی رکھی۔ شیام نندن بابو سے بھی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اندرا جی کو ضرور نیچا دکھایئے ان کو یہاں سے نکالئے، یہ الگ سوال ہے کہ ہوائی جہاز میں انہیں کے ساتھ سفر کرتے ہیں، وہ سفر کرنا چھوڑ دیجئے، لیکن غلط طاقتوں کا سہارا لے کر نہیں، جن سنگھ کے کندھوں پر سوار ہوکر نہیں۔ جو جن سنگھ کے کندھوں پر سوار ہوکر جائینگے وہ اس ملک کا ناش کرینگے۔

نومبر ۱۹۷۴ء

میسا قانون
انصاف سے انحراف

شری ایس ۔ اے ۔ شمیم : جناب سپیکر صاحب میں دو بنیادی باتوں کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں ۔ایک بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ فوراً ہی حکمران جماعت کے ممبران کے نوٹس میں آئی ہو کہ کل پرسوں یا آٹھ دن پہلے سے سمگلنگ شروع ہوگئی ہے۔اس لیے ان کی پریشانی اور گھبراہٹ کو جائز سمجھا جائے۔

جناب سپیکر صاحب یہ دھندا پچھلے ۲۷ سال سے چل رہا ہے۔اگر اس کے خلاف کبھی آواز اٹھتی ہے تو وہاں سے نہیں اٹھتی بلکہ یہاں سے اٹھتی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ سمگلنگ کے دھندے میں دو پارٹیز ہیں۔ ایک سمگلر دوسرا جو سمگلنگ الاؤ کرتا ہے۔ وہ بھی اتنا ہی دوشی ہے جتنا کہ سمگل کرنے والا۔ سمگلروں نے خود کہا ہے یہ کاروبار ہم ایک دن کے لیے بھی جاری نہیں رکھ سکتے اگر ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری افسران کا کوآپریشن (cooperation) شامل نہیں ہوتا۔آپ نے سمگلروں کو گرفتار کیا۔سوال یہ ہے کہ دوسرے اکمپلیز (accomplice) جن کی وجہ سے کاروبار ترقی کررہا تھا وہ کہاں ہیں،ان کے اوپر قانون کیوں نہیں لاگو ہوتا؟۔

ہمارے انصاف کی بنیاد جو پرنسپل آف جورسپڈینس (Jurispudence) ہیں وہ کچھ اصول ہیں جن پر وار ہوا ہے۔ اگر ایک آدمی کھلے بازار میں قتل کرتا ہے اور اس دیش میں پچھلے سو سال کا سب سے بڑا واقعہ گاندھی جی کا قتل ہوا ان کے قاتل کو ہزاروں آدمیوں نے دیکھا اور جس نے قتل کیا اس آدمی کو مکمل قانون کا سہارا لینے کی اجازت دی گئی تا کہ کورٹ سے گزرے اور اس کے بعد سزا ہو۔ دوسری بات اگر کوئی شخص خود عدالت میں جا کر کہتا ہے کہ میں نے قتل کیا ہے، صرف اس کی شہادت پر ہی اس کو سزا نہیں دی جا سکتی ، جب تک کہ کوربوریٹری ایویڈینس (corboratory evidence) نہ ہو، اس وقت آپ نے سمگلر کے لیے یہ قانون بنایا۔ کل آپ ہورڈنگ پر لاگو کرینگے پرسوں آپ کہہ دینگے کہ جو وطن کے دشمن سرگرمی کرتے ہیں ان پر یہ لاگو ہوگا اور پھر دھیرے دھیرے اس کا دائرہ شاید سیاسی جماعتوں پر بھی ہو۔ ہم اس خطرہ کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ سمگلروں کو یہ دھندا کرنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیئے ہم مان سکتے ہیں کہ یہ سرکار نیک ہے۔ لیکن ڈیموکریٹک پروسیس میں یہ ممکن ہے کہ ایک غلط قسم کی سرکار برسر اقتدار آئے۔ ہم اصول کی بات کر رہے ہیں قانون کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ بنیادی بات ہے کہ سمگلروں کو اریسٹ کرنے کے بعد آپ نے سمگلنگ کو روکنے کے لیے کیا کیا۔ کورٹس نے کیا فیصلے دیئے جس کے لیے آپ یہ آڈر لائے ؟ کورٹس نے کہا آپ نے جتنے الزمات سمگلرز پر لگائے ان کا تعلق approximate connnection نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک سمگلر نے دس سال پہلے کوئی جرم کیا تو دس سال تک آپ کہاں رہے؟ پہلے اس میں شریک رہے اور اب فیصلہ کرتے ہیں

کہ اس کو گرفتار کرینگے۔ اگر اسی طرح سے کورٹ کے ہر آڈر کو بائی پاس کر کے کبھی پریذڈینشل (Presidential) آرڈر سے، کبھی پول ایکسیز (Poll excesses) پر آرڈر نکال کر، تو پھر کورٹس کی ضرورت کیا ہے، آپ کو اپنے کورٹس پر وشواس نہیں ہے۔ جو چیز آپ کو پریشان کرتی ہے کہ سمگلر چھوٹ نہ جائیں تو یہ بات کیا جج نہیں سمجھ سکتا۔ کیا وہ نہیں سوچتا ہے ؟ پھر آپ اپنے ہاتھ میں یہ اختیار کیوں لیتے ہیں؟ اور کون جانچ کرے گا کہ کون سمگلر ہے......؟۔

یہ ٹھیک ہے کہ دو تین سمگلروں کے بارے میں آپ کے پاس شہادت ہے۔ لیکن چھ مہینے سال بھر یا دو سال کے بعد جب انہیں یہ حق دیا جائے گا وہ عدالت میں جائیں اور اگر کورٹ نے پھر فیصلہ دیا کہ ان کی گرفتاری، نظر بندی ناجائز تھی تب کیا کرینگے آپ؟ بنیادی بات یہ ہے کہ آپ نے کورپشن کو respectabitity دی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک چیف منسٹر کے خلاف باقاعدہ انکوائری کمیشن بٹھایا۔ اس نے کہا اس نے چار کروڑ روپے ایمبزل کیے ہیں کمیشن کی رپورٹ جس تاریخ کو آئی اس تاریخ کے ایک مہینے کے اندر آپ نے اس کو کانگریس کا ٹکٹ دیا اور پارلیمنٹ کے لیے الیکشن لڑوایا۔ یہ الگ سوال ہے کہ اس کو لوگوں نے ہرا دیا۔ ہم آپ کی نیک نیتی پر تب شبہ نہیں کرینگے جب آپ بہت سے ایم۔ پی۔ اور منسٹر جن پر الزام ہیں انکو بھی گرفتار کرینگے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے سمگلر حاجی مستان سے میری ملاقات کن حالات میں ہوئی؟ وہ کانگریس پارٹی کے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سٹی زنز کمیٹی کا جلسہ تھا چونکہ میں بھی ممبر تھا اسلئے میں بھی وہاں اس اجلاس میں موجود

تھا۔ میں نے جب تقریر کی تو سٹیج پر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے گلے میں ہار ڈالے گئے۔ پہلے میرے، اس کے بعد کانگریس کے پریذیڈینٹ کے اور تیسرا ہار حاجی مستان کے گلے میں ڈالا گیا۔ اس نے مجھ سے خود کہا، جو اخباروں میں چھپا ہے، کہ منسٹرات میں مجھ سے پیسے لیتے ہیں۔ کون دعویٰ کرسکتا ہے جس کو پیسہ نہیں دیا۔ آپ میں سے بہت لوگ جو اس وقت چلا رہے ہیں، کون جانتا ہے اس کے پیسے نہ کھائے ہوں۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حقیقت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

نومبر ۱۹۷۴ء

"روپیہ کی کرامات"

شری ایس۔اے۔شمیم (سرینگر)

چیر مین صاحب: آج پریذیڈینشل (Presidential) آرڈر پر جو بحث ہو رہی ہے اس بحث کو خاص طور پر میں نے توجہ سے سنا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ دونوں طرف سے کوشش یہ ہو رہی ہے کہ دوسرے فریق کو یا دوسری جماعت کو دوشی قرار دے کر اپنی بے گناہی ثابت کی جائے۔ لیکن میں اس بحث میں جانے سے پہلے آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس مقدمے میں ایک بہت ہی اہم گواہ پیش ہوا ہے، اور وہ آج پیش نہیں ہوا ہے بلکہ ۱۳۱ مئی کو پیش ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ سدن کے سامنے اصلی مجرموں کی زبان سے اصلی حقیقت آجائے کہ اس سماج میں سمگلنگ جیسی برائیاں کیسے اور کیوں پیدا ہوتی ہیں۔

Shri K.P Unnikrishhan(Badamame)! Is your speech going to be a confession or personal explanation or what it is going to be.

S.A.Shameem: Mr.Unnikrishhan has started feeling guilty he has started protesting now itself.

شری ایس۔اے۔شمیم: میں عرض کر رہا تھا کہ اس سماج میں سمگلنگ جیسی برائیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں اور ان کو پیدا کرنے کی ذمہ داری کن لوگوں

کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ آج حکمران جماعت کے ممبران ایسے پروٹیسٹ کرتے ہیں جیسے پہلی مرتبہ انہیں خبر ملی ہو کہ اس ملک میں سمگلنگ کا دھندا ہو رہا ہے اور جیسے ہی خبر ملی انہوں نے فوراً قانون بنایا۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں حاجی مرزا مستان جس کا نام لیا جا رہا ہے زیادہ دیانتدار ہے، زیادہ قابل اعتبار ہے، حاجی مرزا مستان آپ کے بارے میں کہتے ہیں، اجازت دیجئے آپ کو پڑھ کر سناؤں۔

"اس وقت میری عمر ۱۵ / یا ۱۶ / سال کی تھی اور یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اس دنیا پر صرف پیسے کا راج ہے اور دنیا والے صرف پیسے والوں کی عزت کرتے ہیں۔ ان کا حکم مانتے ہیں اور ان کی راہوں میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ غریب کی محنت، اس کی دیانت اور ایمان داری کی کوئی قدر نہیں، اور جس شخص کے پاس پیسہ نہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے" اور جناب عالی سمگلنگ کا دھندا کیسے اس آدمی نے شروع کیا جو سمگلروں کا بادشاہ بن گیا اس کی کہانی اس کی زبانی سنیے:

"جب ہوائی جہاز جتنی بڑی موٹروں میں بڑے بڑے لوگ سوار بندر گاہ پر آیا کرتے تھے، قلی ان کا ہر حکم بجا لاتے اور انہیں اس عزت و احترام سے رخصت کرتے تھے کہ جیسے وہی ان کے مائی باپ ہوں۔ جہازوں سے آنے والے بڑے بڑے ۴۲۰ مسافر جب منوں اور ٹنوں سامان کے ہمراہ بندر گاہ پر اتر جایا کرتے تھے تو سامان کی تلاشی پر معمور کسٹم کے افسران ان کی خدمت میں اس طرح کھڑے رہتے تھے کہ جیسے وہ کوئی بہت بڑے بزرگ یا مہاتما ہوں، اور وہ سب روپے کی کرامات تھی۔"

یہ بنیاد ہے ہمارے سماج میں، ہماری سوسائٹی میں سمگلنگ کی۔ کیونکہ

ہمارے یہاں جس کے پاس پیسہ ہو تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ پیسہ کس نے لگایا اور کہاں سے لایا۔ اور سمگلنگ کا نام آپ اس لیے رہے ہیں کہ آج آپ نے ان کو بیڈ نام دے کر ۵۰۰ آدمیوں کو گرفتار کیا لیکن میں اس ایوان کو بتانا چاہتا ہوں کہ سمگلنگ میں ۵۰۰ آدمی نہیں ہیں، کم سے کم ۲۵ ہزار لوگ وابستہ ہیں اس دھندے میں، اور اس لیے جن کو آپ نے گرفتار کیا ہے یہ خود بھی سمگلنگ نہیں کرتے۔ ان کی تو باقاعدہ ایجنسیز (Agencies) ہیں۔ آپ نے کس کو پکڑا، آپ کس کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔

ابھی اس ہاؤس میں، میں نے ایک سوال پوچھا تھا، میں نے کہا تھا کہ یہ فلمسٹار جن سے آپ میچ کھلواتے ہیں ان کو بلا کر دو لاکھ روپے کی رقم جمع کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کو تو مہاتما مانتے ہیں۔ ان کے ساتھ تصویر کھچانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ تصویر حاجی مستان مرزا، سب سے بڑے سمگلر کے پیر چھو رہی ہے اور یہ مانیہ آئی۔ کے۔ گجرال کے ہیرو راج کپور کی ہے۔ سبرامنیم جی، جب اس کے بیٹے کی شادی ہوتی ہے تو منسٹروں کی موٹروں کی لائن لگ جاتی ہے۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہم ریسپکٹیبلٹی Respectabilty دے رہے ہیں، ہم رکاگنیشن (recognition) دے رہے ہیں چوروں کو، کفن چوروں کو۔ سوال یہ ہے کہ عیسیٰ نے کہا تھا کہ گناہ گاروں کو کون پہلے پتھر مارتا ہے۔ میں اس ایوان کے ممبروں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے دائیں بائیں کتنے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ آپ کے ان دوستوں میں بڑے بڑے کفن چور، بڑے بڑے سمگلر موجود ہیں، لیکن جو پکڑا گیا وہ سمگلر، جو نہیں پکڑا گیا وہ ہیرو اور اس کی مثال یوں ملتی ہے کہ واجپائی جی نے اس ایشو کو بھی، جو خالص سیکولر ایشو ہے کیونکہ سمگلنگ میں

ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب آپس میں بھائی بھائی، اور واجپائی نے اس کو
بھی خاص عینک سے دیکھا۔ انہوں نے حاجی مستان کا نام دوبار لیا، لیکن باکھیا
کا نام ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ نارنگ کا نام بھی نہیں نکلا۔ انہوں نے کیرل
میں مسجد دیکھی لیکن کتنے بڑے بڑے مندر سمگلروں نے بنائے ہیں، ان کی
طرف ان کی نگاہ نہیں گئی۔

میں کہنا چاہتا ہوں سیاسی جماعتوں کے متعلق اور ان کو فروغ کیسے ملتا ہے
اس کے متعلق میں پھر گواہ پیش کرتا ہوں، وہ گواہ جو جانتا ہے، اور میں نے
آپ سے کہا یہ بڑی بات ہے۔ حاجی مرزا مستان نے اپنی زبان سے وہ بات
کہی، آج نہیں جب آپ نے گرفتاری کا چالان کیا ۳۱ مئی کو، چار مہینے پہلے
کہا جب آپ لوگوں کو خیال آیا کہ اس ملک میں سمگلنگ کا دھندا چلتا ہے۔

''میری اس بات کو مغالطے پر محمول نہ کیجئے بمبئی شہر کی آدھی سے زیادہ
دولت کالی ہے اور اس دولت بنانے میں، اس کی پیداوار میں امیر غریب،
حاکم اور سیاسی جماعت کے نیتا لوگ شامل ہیں۔ میں بہت سے ایسے سیاسی
گداگروں کو جانتا ہوں جو دن کی روشنی میں مجھے گالیاں دیتے ہیں، مجھے
بُرے سے بُرے ناموں سے پکارتے ہیں اور پھر رات کے اندھیرے میں
سب کی نظریں بچا کر ہاتھ میں کشکول لیے مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ الیکشن
لڑنے کے لیے مجھ سے پیسے کی بھیک مانگتے ہیں۔ اس وقت ان کے چہرے
قابل دید ہوتے ہیں اور ان کی شرافت، اخلاقی بلندی اور ان کی ایمانداری کا
بھرم کھل جاتا ہے۔ میں ان کی کشکول میں مقدور بھر خیرات ڈال کر من ہی من
میں ان کی ریاکاری پر مسکراتا ہوں''۔

سب سے زیادہ زوردار انڈائٹمینٹ (indictment) جو اس نظام کے

خلاف ہونا چاہیئے وہ حاجی مستان کی زبانی ہی آپ سنیں۔انہوں نے یہ کہا:

As I became more experienced in business, instead of helping the operators I began to get across my own stuff. This was much more profitable."

" You read every day in the papers that so many smugglers' trucks carrying contraband goods have been seized,so many people arrested.But perhaps you do not know that these operations are staged only to appease the public.Questions are asked in Parliament about the steps Government is taking to check the evil of smuggling. Ministers give you longwinded replies, telling you what they are doing to check smuggling. They merely hood-wink you. The fact is that the highest civil and police afficials are involved with us in the racket. Otherwise we would not be able to operate at all."

"جس نے اس بات کو مانا ہے کہ وہ سمگلنگ کرتا ہے۔اس نے یہ باتیں کہی ہیں۔جس سوسائیٹی میں،جس سماج میں اس بات کی عزت ہو کہ کس کے پاس کتنا پیسہ ہے اور جب تک وہ اپنا یہ سٹگما (stigma) ختم نہ کرے کہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے تب تک آپ کے جو منصوبے ہیں وہ غلط ثابت ہونگے۔پھر چاہے آپ پانچ سو یا ہزار سمگلروں کو بند بھی کیوں نہ کر دیں۔اس

واسطے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ کو سماج کو بدلنا ہوگا۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یوسف پٹیل نام کے سمگلر کو آل انڈیا لائیسنس کس نے دیا تھا بندوق رکھنے کا؟ جو یونین ڈپٹی منسٹر رہ چکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یوسف پٹیل مہاتما معلوم ہوتا ہے..... کیا اس کے بارے میں کسی نے پوچھا ہے، کیا اس ڈپٹی منسٹر نے نہیں دلوایا ہے؟ اٹل جی نے حاجی مستان کا نام بار بار لیا ہے اور ہر شریف آدمی کی پگڑی اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ پبلک میٹنگ میں انہوں نے شیخ عبداللہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ جب وہ بمبئی گئے تھے تو حاجی مستان کے یہاں ٹھہرے تھے۔ یہ بھی انہوں نے کہا ہے کہ حاجی مستان کشمیر گئے تھے اور اس میں بھی دلچسپ بات یہ کہی ہے اور الزام لگایا ہے کہ وہ کشمیر اس لئے گئے تھے کہ شیخ عبداللہ کے ساتھ سمجھوتا ہو رہا ہے اور اس واسطے انکا جانے کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے ساتھ کب سمگلنگ کا کاروبار شروع کیا جاسکے۔ یہ بات ایک مہان جماعت کے مہان نیتا کی زبان سے سننا اور کہنا اچھا نہیں لگا۔ کیا ان میں سے کوئی پوچھنے والا ہے کہ مستان زیادہ برا ہے یا وہ آنند مورتی جس کے یہاں سے سر کی کھوپڑیاں نکلی تھیں؟ جس کو ملنے کے لئے اٹل جی جہاز میں اسکے پاس گئے تھے؟ اس کے یہاں اسکی بیوی نے کہا تھا کہ یہ ان نیچرل آفینس (unnatural offence commit) کمٹ کرتا تھا اور اسکے یہاں سے کھوپڑیاں برآمد ہوئی تھیں۔ انہی کو ملنے وہ ہوائی جہاز گئے تھے۔ کیا اس سے بھی حاجی مستان زیادہ برا ہے؟ آپ نے تو قاتلوں کو ریسپیکٹبلٹی دی ہے۔ کیرل کی مسجد تو آپ کو نظر آئی لیکن بڑے بڑے مندر جو سمگلنگ کے پیسے سے بنے وہ آپ کو نظر نہیں آئے۔ پیور لی سیکولر مسلے کو بھی آپ نے کمیونل رنگ دے دیا ہے، کمیونل لائنز سے دیکھا ہے۔ آپ کی

جماعت کے ہی ایم۔ایل۔اے۔جموں میں سمگلرز کی پردہ داری کرتے ہیں ۔چاول سمگل ہوتا تھا پاکستان اور آپ کی جماعت کے رشی کمار کوشل اس کی پردہ داری کرتے تھے۔ یہ مجھے وہاں کے سٹیٹ منسٹر نے بتایا ہے کہ جب ہم نے سمگلر پکڑے تو رشی کمار جی سفارش لے کر آئے۔چمن لال گپتا کے باپ کو سمگلنگ کے الزام میں پکڑا گیا اور سفارش یہاں سے گئی۔کس پر کیا کیا پتھر پھینکیں گے؟ اگر حاجی مستان مسلم لیگ کو پیسہ دیتا ہے تو ہندو سمگلر جن سنگھ کو پیسہ دیتا ہے اور آپ کی دوکان بھی اسی پیسے پر چلتی ہے۔کس منہ سے آپ اس قسم کی باتیں کہہ سکتے ہیں؟ آپ کا نام بھی لیا تھا، لیکن میں نے چھپا لیا، آپ کی عزت رکھی۔

بنیادی بات کو آپ لیں۔کانگریس کی طرف سے اکثر کہا گیا ہے کہ آپ پردہ داری کرتے ہیں، ذاتی طور پر ملتے ہیں حاجی سے، لیکن میں آپ کی طرح چوری چھپے نہیں ملتا ہوں، کام نہیں کرتا ہوں، مزدوروں کی طرح ملتا ہوں، دن کی روشنی میں ملتا ہوں، رات کے اندھیرے میں ملنے والے اور ہیں۔

کسی کا چہرا دیکھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ایکیوزڈ (accused) ہے۔ پبلک جلسے میں اٹل جی نے شیخ عبداللہ پر الزام لگایا ہے کیا کسی کے ماتھے پر لکھا رہتا ہے کہ وہ سمگلر ہے؟ کیا کسی کے ماتھے پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ وہ قاتل ہے؟ کون جانتا ہے کہ آپ کی جماعت میں بھی کون کون سمگلر ہیں۔ یہ بات تو تبھی ظاہر ہوسکتی ہے جب وہ پکڑے جائیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ سمگلروں کو اس لئے مت پکڑو کہ حکمران جماعت کہتی ہے کہ وہ سمگلر ہیں بلکہ اس واسطے پکڑو کہ آپ کے پاس واقعی ثبوت ہیں جن کی بناء پر انہیں پکڑا جانا ضروری ہے۔

دسمبر ۱۹۷۴ء

◆◆◆

جامع مسجد کا جھگڑا

مسلمانوں کے تئیں سرکار کا دوغلا پن

شری ایس۔اے۔شمیم (سرینگر)

چیئرمین صاحب ، میں سب سے پہلے دو باتیں صاف کرنا چاہتا ہوں ایک یہ ہے کہ جامع مسجد کا معاملہ کوئی سامپردایک معاملہ نہیں ہے اور جامع مسجد کا معاملہ اس لحاظ سے جامع مسجد کے مسلمانوں کا معاملہ نہیں ہے کہ اس ایریا میں بہت سے مسلمان رہتے ہیں یا امام صاحب نے مسجد کے نام پر جھگڑا کر دیا۔ یہ جامع مسجد کے ایریئے میں رہنے والے انسانوں کی دکھ بھری کہانی ہے اور اسے اسی طور پر دیکھا جانا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کا مسلمانوں اور مسائل سے، اُن کی سمسیاؤں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس ملک میں مسلمانوں کو مائینورٹی (minority) کی حیثیت سے بہت سے مسائل اور بہت سی سمسیاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس مسئلے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ دو باتیں کہنے کے بعد میں یہ چاہوں گا کہ اس امامت کے مسئلے میں، مسجد کے مسئلے میں، پولیس نے جو زیادتیاں کی ہیں اس کے ساتھ ملا کر اس ہاؤس کو اور پبلک اوپینین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ امامت کے مسئلے کے سلسلے میں عام مسلمانوں کا خیال کیا ہے؟، وقف بورڈ کا خیال کیا ہے؟

یہ الگ بحث ہے لیکن اس مسئلے کا امامت کے سلسلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس مسئلے کا تعلق جیسا کہ میرے بہت سے دوستوں نے کہا ہے، بنیادی طور پر امام صاحب کی ذات سے ہے، وقف بورڈ اور سرکار کے منتری شری شاہنواز خان کے ایٹیچوڈ (attitude) سے ہے۔

امام صاحب کے متعلق عام لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ مسجد کو سیاسی پروپیگنڈہ کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں اور جب وہ کانگریس کے حق میں اس کو استعمال کرتے تھے تب بھی وہاں جو مسلمان نماز پڑھتے تھے وہ ناراض تھے اور جب انہوں نے کانگریس کے خلاف بولنا شروع کیا تب بھی وہاں پر مسلمانوں کا جو سنجیدہ طبقہ تھا، سوچنے سمجھنے والا طبقہ تھا، وہ ان سے ناراض تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مولانا صاحب مسجد کو غلط طریقے سے استعمال کریں لیکن حکومت کی مولانا صاحب کو شاباشی ملتی رہی۔ اس لئے مولانا صاحب کا حوصلہ بڑھتا رہا وہ مسلمانوں کے لیڈر ہونا چاہتے تھے اور جیسا کہ سنبھلی صاحب نے اشارہ کیا وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتے تھے اور مسجد کو اپنا گھر بنا کر استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن مسلمان یہ نہیں چاہتے تھے۔ اس بیچ میں سرکار کا رول یہ رہا اور سرکار نے بیچ میں ٹانگ اڑا کر، سرکاری وزیر نے بنگلنگ کر کے مولانا کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ مسلمانوں کے ہیرو ہو جائیں اُس علاقے میں۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ مولانا کے متعلق مسلمانوں نے یہ شکایت کی کہ وہ مسجد کو سیاسی پروپیگنڈا کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ شری شاہ نواز خان نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ بات نہیں کہی جو اسحاق سنبھلی صاحب نے کہی کہ وہ مسجد کی آمدنی کھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ وہ وزیر اعظم کے خلاف تقریر کرتے تھے اور کانگریس کے خلاف اور مسلمان

وزیروں کے خلاف تقریر کرتے تھے اور جیسا کہ شری سنبھلی نے کہا کہ اُس کے خلاف کاروائی ہونی چاہئے تھی۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک اور وزیر، منسٹر آف ریلویز، ایک پریس کانفرنس کرتے ہیں کہ اس شریف آدمی کو فوراً رہا کیا جانا چاہئے۔ یہ بہت اچھا آدمی ہے یہ دو بیان ہوئے ہیں۔ ۱۵/اگست کو جب کہ پرائم منسٹر کے جواب میں تقریر کی، اور دوسرے ۲۶/دسمبر کو، جبکہ عید تھی۔ میں بھی سال میں ایک دو مرتبہ نماز پڑھ لیتا ہوں۔ اُس عید کے موقعے پر امام صاحب نے فتویٰ دیا۔ وہاں پر محسن صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ اُس وقت امام صاحب نے تقریر کی اور محسن صاحب کی بہت تعریف کی اور پھر محسن صاحب کو کہا کہ آپ میری تعریف کیجئے۔ محسن صاحب نے وہاں ۱۵ منٹ کی تقریر میں ۱۳ منٹ مولانا صاحب کی تعریف کی، ان کی قبولیت کی تعریف کی اور ۲ منٹ اپنی تعریف کی۔ اب مجھ کو یہ بتائیں کہ شری شاہ نواز خان صحیح کہتے ہیں کہ وہ اینٹی نیشنل مولانا ہے اس لئے اس کو میسا MISA کے تحت گرفتار کیا جانا چاہئے تھا یا مسٹر محسن ٹھیک کہتے ہیں جنہوں نے اُن کی تعریف دو ہزار مسلمانوں کی موجودگی میں کی یا پھر شری قریشی ٹھیک کہتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ویل میننگ پرسن (Well meaing person) ہے اور اُسے فوراً جیل خانے سے سیدھے قریشی صاحب کے گھر بھیج دینا چاہئے۔ اس مولانا نے مسلمانوں کو گمراہ کر کے یہ کہا کہ مسجد پر حملہ ہو رہا ہے۔ ادھر مولانا کے صاحبزادے نے لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ کیا کہ مولانا کا خون ہو گیا ہے اور مولانا پر گولی چلا دی گئی ہے۔ جائز طور پر لوگ مشتعل ہوئے اور ڈیمانسٹریشن ہوا۔ ڈیمانسٹریشن میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہوئی ہیں۔

اب آپ دیکھئے کہ وہ لوگ جیل میں ہیں جن کو گمراہ کرنے والے منسٹر

صاحب کے گھر پر ہیں۔ یہ آپ کس کو قائل کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے مولانا اینٹی نیشنل تھے اوراب پرونیشنل ہو گئے ہیں۔ایک بات طے ہے کہ یہ معاملہ مولانا کا ذاتی معاملہ ہے، اپنے گھر کا معاملہ ہے۔ پہلے مولانا خراب تھے اوراب وہ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ یہاں پر مولانا کی بہت سے لوگوں نے وکالت کی اور بعد میں بھی وکالت کرنے والے ملیں گے لیکن میں وکالت کرنا چاہتا ہوں اُن ۱۷ بھائیوں کی جو کہ پولیس کی گولی سے مرے۔صرف اس لیے کہ کچھ نااہل وزیروں نے، حکومت کے نالائق کارندوں نے ایک معمولی سے ذاتی جھگڑے کو اس طریقہ سے پنپنے دیا کہ وہ مسلمانوں ورسز حکومت کا جھگڑا بن گیا اور اس جھگڑے میں اُن ۱۷ آدمیوں کی جانیں ضائع کر دی گئیں۔ مولانا سے آپ کا سمجھوتا ہو جائے گا اور اخباروں میں وہ شائع ہو جائے گا، لیکن ان ۱۷ نوجوانوں کے ساتھ اُن گھرانوں کے ساتھ، جو کہ اُن غریب لوگوں کے لیے واحد روزی کا ذریعہ تھے، اُن کے لیے آپ کا انصاف کیا کرے گا......؟۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ معقولیت کی حد یہ ہے اور ہم کیا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ ہم تو حکومت سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں کہ ۱۷ نوجوانوں کی طرح ۱۷ سرکاری کرمچاریوں، جن میں کچھ وزیر بھی ہوں، کو گولی مار کر ۱۷ آدمیوں کی جانیں واپس کر دی جائیں۔ یہ تو مشکل معاملہ ہے اور شاید یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ جو گولی چلی تھی اور جو یہ معصوم جانیں جن کو یہ معلوم بھی نہیں تھا، کہ ایشو میں جو انوالو تھا وہ کیا تھا جن کو امام صاحب نے گمراہ کیا اور جو آپ کے سرکاری مہمان ہیں اس کی عدالتی تحقیقات ہو۔ اگر پولیٹیکل لیڈر شپ فیل ہو گئی یا پولیٹیکل لیڈرشپ نے بنگلگ کی تو سزا ان ۱۷ نوجوانوں کو کیوں ملی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی تحقیقات ہو۔ بھگت جی نے، سبھدرا جی

نے کہا کہ جن سنگھ مسلمانوں کا بڑا ہمدرد بنا پھرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انور دہلوی نے کیا کہا ہے۔ ''مدر لینڈ'' مسلمانوں کا ہمدرد بن گیا ہے۔

مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ جن سنگھ کے دل میں بھی مسلمانوں کے لیے درد پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے اور شک بھی پیدا ہوتا ہے جب جن سنگھ کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کا ہمدرد بننے کا اور اس روپ میں دنیا کے سامنے آنے کا۔ لیکن اس وقت پوچھا یہ جانا چاہئے کہ یہ موقع کس نے دیا۔ یہ شرمناک واردات کس نے کی؟ میں سمجھتا ہوں کہ بھگت جی اور سبھدرا جی کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے کہ یہ موقع انہوں نے اس کو فراہم کیا، مامن سنگھ نے کیا، جن سنگھ کو اس واسطے دوش دینے کے بجائے میں دوش دیتا ہوں اس سرکار کو جس نے ذاتی جھگڑے کو لے کر ان کو موقع فراہم کیا اور انور دہلوی و شری اٹل بہاری باجپائی، ملہوترا جی کے دل میں درد پیدا کیا اور وہ مسلمانوں کے حق میں بولے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہوگا اگر آپ عقل سے کام نہیں لیں گے، اگر حکومت کے ہر قدم کی سراہنا کرینگے۔ تب ایسے ایسے ہی نقلی غمخوار پیدا ہوں گے۔ نقلی ڈاکٹر پیدا ہوں گے، اور وہ مریض کو بچانے کی کوشش نہیں کریں گے اور کہیں گے کہ مریض چلا جائے تو اچھا ہے۔ لیکن اس کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی۔

وقف بورڈ کو کیا اختیارات ہیں؟ مسلمانوں کی امامت کون کرے یہ فیصلہ مامن سنگھ کرے؟ دلی پولیس کرے، ملہوترہ کرے کون کرے گا۔؟

میں سمجھتا ہوں کہ کسی کا بھی اس سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں کو ہی طے کرنا ہے کہ وہ کس کے پیچھے نماز پڑھیں۔ میرے خیال میں شاہنواز خاں صاحب اس لیے نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمان منسٹر ہیں، اس لیے ان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے۔ وہ ایک فوجی آدمی ہیں۔ فوجی آدمی سوچتا کم ہے

اور سوچتا بھی ہے تو کام کے بعد سوچتا ہے۔

اب ان کو اس بات کا احساس ہوا ہے کہ انہوں نے غلطی کی ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا دنیا بھر میں مسلمانوں کے سارے مسائل حل ہو گئے ہیں اور جامع مسجد کی امامت کا ہی ایک مسئلہ باقی رہ گیا تھا کہ شاہنواز خان جی نے اپنی ٹانگ اڑانی ضروری سمجھا؟

اس ایک درگھٹنا سے دو باتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ جامع مسجد کا علاقہ ایک شوپیس ہونا چاہئے تھا۔ یہ ہماری ملی جلی تہذیب کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ یہاں ہزاروں لوگ جاتے ہیں، بدیشی جاتے ہیں، بڑی بڑی ہستیاں جاتی ہیں۔ جامع مسجد کی حالت کو آپ دیکھیں۔ دنیا کے بھک منگے، دنیا کی غربت، دنیا کا افلاس وہاں ہے۔ کہاں تھے وقف بورڈ والے، کہاں تھی حکومت، کہاں تھے مسلمانوں کے غمخوار انور علی دہلوی، اٹل بہاری باجپئی جنہوں نے آج تک اس بات کی طرف توجہ نہیں دی اور کیوں نہیں انہوں نے اس علاقے کو ملی جلی تہذیب کی ایک نشانی بنایا، کیوں اسکو غلاظت، کوڑا کرکٹ اور افلاس کی ایک نشانی بنائے رکھا۔ اسے ایک شوپیس بنانا چاہئے تھا لیکن وہ نہیں ہوا۔ امام صاحب کے ساتھ دوکانداری ہوئی کہا گیا کہ تم ہماری مدد کرو۔ اور اس نے کہا کہ یہ خدا کا گھر نہیں ہے، میرا گھر ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی مانتے ہیں کہ خدا کا گھر نہیں ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ کچھ تیرا گھر ہے، کچھ ہمارا گھر ہے، لیکن تو کہتا ہے کہ سارا میرا گھر ہے۔ اسلئے جھگڑا شروع ہو گیا۔

دوسرے اس ایریا میں ممبرانِ پارلیمنٹ کو جانے کا موقع ملا ہوگا۔ سارے علاقے میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں کس قدر غربت اور افلاس ہے۔ اس بات سے ہی یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دلی میں رہنے والے مسلمانوں کی کیا حالت

ہے۔اس واسطے یہ ایک سوشوا کانومِک(Socio-economic) سوال بھی ہے۔اس درگھٹنا سے ہمیں ایسے اہم سوال کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے کہ جب تک اس کمیونیٹی کا اپلِفٹ منٹ(upliftment) نہیں ہوتا، انکے سماجی سدھار کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے، تب تک لاٹھیوں اور گولیوں سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ انکی حالت سدھارنے کی طرف خاص طور سے ہمیں توجہ دینی ہوگی۔ مولانا جن تین سو آدمیوں کو لے کر ہلہ کرنے گئے تھے، ان میں سے ایک بھی میٹرک پاس نہیں تھا، کوئی رکشا والے تھے، کوئی چھاپڑی والے تھے۔ اس طرح کے لوگ آپ کو آسانی سے مل جائیں گے، جن کو مذہب کے نام پر گمراہ کیا جا سکے۔ مولانا صاحب نے اپنا کارنامہ انجام دیا۔ اس کی ذمہ داری کچھ کچھ مولانا پر اور زیادہ تر آپ کے اوپر ہے۔ اب اس مسئلے کا فوری طور پر حل نکالنا چاہئے کہ ایک جوڈیشل انکوائری آپ ہولڈ کریں اور اس میں آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اگر واقعی میں امام صاحب نے زیادتی کی ہے حکومت کا دعویٰ ہے کہ حالت قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس انکوائری سے یہ بات صاف ہو جائے گی اور ہمارے سامنے آجائے گی۔

دوسرے جو لوگ بے گناہ مارے گئے ہیں انہیں بھرپور معاوضہ ملنا چاہئے۔ جامع مسجد کے علاقے کو واقعی میں ایک شوپیس بنانے کے لیے آپ کو قدم اٹھانے چاہیں۔ کم از کم اس درگھٹنا سے آپ کو یہ سبق تو سیکھنا ہی چاہئے۔ انسپاریشن(inspiration) لیناہی چاہیئے تا کہ بہتر طریقے سے اس معاملے کو دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

فروری ۱۹۷۵ء

اقلیتوں کے لیے لسانی کمیشن

بے چاری اُردو

شری ایس ۔اے۔ شمیم : (سرینگر) جناب صدر یہاں مائینارٹی لنگویج کی بات ہوئی ہے ۔لیکن ایک ایسی زبان ہے جو مائینارٹی کی نہ ہونے کے باوجود بھی اس ملک میں شرنارتھی بنائی گئی ہے۔ میرا روئے سخن اُردو زبان کی طرف ہے جس پر ملک کی تقسیم کے بعد یہ الزام لگایا گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے، پاکستان کی زبان ہے، ۱۰ ر سال کے بعد پاکستان نے خود ثابت کر دیا کہ پاکستان میں اُردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ سندھ میں جو جھگڑے ہوئے، پنجاب میں جو فسادات ہوئے اور اُردو شاعروں نے اُردو کے خلاف جلوس نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ اُردو اگر زبان ہے تو ہندوستان کی زبان ہے ۔ اس کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر قسم کی سہایتا کا وعدہ کرنے کے بعد ابھی تک اس زبان کو اپنا کوئی علاقہ نہیں دیا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ کشمیر میں اسے مسلط کیا گیا ہے، لیکن جموں و کشمیر اُردو کا

علاقہ نہیں ہے۔ جموں میں ڈوگری ہے اور کشمیر میں کشمیری ہے۔ یہ زبان یو پی کی زبان ہے۔ مانیہ واجپائی جی کے پردیش کی زبان ہے۔ لیکن واجپائی جی نے انیائے کیا ہے اس زبان کے ساتھ۔ اس لیے اسے کشمیر میں رفیوجی بنا دیا گیا۔ آج بھی اس دیس میں جب مشاعرے ہوتے ہیں، اُردو کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں، جب جب بڑے فنکشن ہوتے ہیں تو اس ملک کے نیتا، جن میں مانیہ واجپائی جی شامل ہیں، اُردو کے مشاعروں کو سننے کے لیے، فیض احمد فیض کے کلام اور جوش ملیح آبادی کے کلام سننے کے لیے دس دس روپے کی ٹکٹ لیتے ہیں۔ لیکن جب اس کو مقام دینے کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ یہاں کی بھاشا نہیں ہے۔ جب کہ آئین میں اس کو زبان کی شکل میں سویکار کیا گیا ہے۔

شری مول چند داگا:- بھاشا کو کسی جگہ بنانے کا سوال نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ الپ سنکھیا کے جو بولنے والے ہیں اس کو پروستاہن دیا جائے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ملک کی زبان بنائی جائے۔

شری ایس۔اے۔شمیم: میں کہہ رہا ہوں کہ اسے آئین میں بھاشا کا درجہ دیا لیکن اس زبان کے لیے کیا کیا۔ جب تک آپ اس زبان کو علاقہ نہیں دیتے اس کو ریکا گنائز (recognise) نہیں کرتے کسی اسٹیٹ میں، اس کو آئین میں سجا رکھنے سے کیا فائدہ ہے؟ جب آپ مشترکہ تہذیب کی بات کرتے ہیں تو اس کا ایک شاہکار اردو ہے۔ آپ اس اردو کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ اس کا نام لیتے ہی بدلتے ہیں، لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ پچھلے ۲۰ سالوں میں اس زبان کے لئے کیا کچھ کیا گیا۔ ابھی میں اس رپورٹ کو پڑھ رہا تھا، یو پی میں جہاں اس نے جنم لیا، پرورش پائی اور مشترکہ تہذیب کو جنم دیا وہاں استادوں کی تعداد بڑھ رہی ہے لیکن اُردو پڑھنے والوں

کی، اردو مکتبوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں، اُردو شاعروں نے جو حصّہ ادا کیا اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج بھی اردو زبان اس ملک میں ایک مشترکہ تہذیب بنانے کے لئے جو رول ادا کررہی ہے اس سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ لنگوسٹک مائینورٹیز کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے پولٹیکل پارٹیز اپنے الیکشن مینفسیٹوز (manifestoes) میں یہ یقین دہانی کرتی ہیں کہ اُردو زبان کے ساتھ انصاف ہوگا، اس کو علاقہ دیا جائے گا اسکو سیکنڈ لینگویج کے روپ میں رکوگنائز کیا جائیگا۔ وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ہم نے یوپی کی حکومت کو ہدایت کی ہے کہ اردو کو پڑھنے کے لئے بنیادی تعلیم کے مکتب قائم کرنے کے لئے سہولیتیں دی جائیں، لیکن یوپی کی حکومت نے انکو وائیلیٹ (violate) کیا ہے۔ پریزیڈنٹ ڈائیرکٹو اشو کرسکتا ہے کہ جہاں ایک خاص تعداد ایک زبان بولنے والوں کی ہو وہاں اس زبان کو پڑھانے کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یوپی میں پانچ ضلعے بھی اردو بولنے والے نہیں ہیں؟ الیکشن کے وقت وعدہ کیا جاتا ہے، لیکن ذہنیت وہی ہے ملک کے حکمرانوں کی جو مانیہ واجپیئی جی کے ذہن میں ہے۔ اردو ایک ایسا معیار ہے جہاں ثابت ہوتا ہے کہ کس کے ذہن میں کون سی بات ہے کون سا جذبہ ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی مختلف شکلیں ہیں، جیسے لال قلعہ، تاج محل۔ اسی طرح اس مشترکہ تہذیب کی نشانی اردو ہے۔ اگر آپ اردو کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو مائینارٹی لنگویج کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ آپ مائینارٹیز کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ اُردو کے لئے جو ناانصافی کررہے ہیں اس کا جو نقصان ہوگا وہ ملک کی مشترکہ تہذیب کے ورثے کو ہوگا۔

اس لئے لنگوسٹک مائینورٹی کمیشن کی رپورٹ کو یا انسٹی ٹیوشن کو ختم کرنے کی بات نہیں ہے۔ بات ہے اپنے دلوں میں، اپنے دماغوں میں آزاد خیالی کی روشنی پیدا کرنے کی۔ میں ڈاگا صاحب اور دوسرے دوستوں سے گذارش کروں گا کہ کبھی لمحے بھر کے لئے اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھلی چھوڑ دیجئے اور اپنے ذہن کی کھلی کھڑکی میں غالب کا کلام، میر کی شاعری اور داغ کی شاعری سننے کی خواہش پیدا کر لیجئے۔ تا کہ پتہ چلے کہ۔

(What you are actually missing)

نومبر ۱۹۷۲ء

ہندوستانی مسلمان...... قربانی کے بکرے

(شری ایس اے شمیم سری نگر)

ڈپٹی اسپیکر صاحب۔ اجازت دیجئے کہ آج میں اس زبان میں تقریر کروں جس زبان کو پچھلے ۲۰ سالوں میں پامال کر کے، نظر انداز کر کے کچھ لوگوں کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ اجازت دیجئے جبکہ آج کچھ ایسی جماعتوں کے دل میں بھی مسلمانوں کا درد ابھرا ہے جو آج تک مسلمانوں سے دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف پرچار کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔ میں کچھ ایسی باتیں کہوں گا جو بظاہر فرقہ پرستی کی باتیں ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ آج مسلمان خودکشی پر کیوں آمادہ ہیں۔ آج مسلمان ان جماعتوں کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں جن جماعتوں نے اس کو نیست و نابود کرنے کا اپنا سیاسی پروگرام بنایا تھا۔ جو پچھلے ۲۰ سالوں سے ان کے خلاف پرچار کر رہے تھے۔ یہ بات اس لئے سوچنے کی ہے کہ اگلے ایک ایسے وقت میں جب مسلمانوں کی سیاسی اہمیت محسوس کی جاتی ہو اس کا بھاؤ بڑھنے لگا ہے۔ شاید اس کے خریداروں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جن سنگھ کی طرف سے خریدار میدان میں آرہے ہیں۔ کانگریس والوں کی طرف سے خریدار میدان میں آرہے ہیں۔ سوتنتر پارٹی کے دل میں درد اٹھ رہا ہے۔ یہ وہی جماعتیں ہیں جن کے خلاف مسلمانوں نے پچھلے ۲۰/سالوں میں ووٹ دئے ہیں۔ آج اگر ۲۰/سال

کے بعد مسلمان شریمتی اندرا جی سے ان کی حکومت سے کانگریسیوں سے مایوس ہوکر ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا ہے جنہوں نے اس سے ہمیشہ دشمنی کی ہے تو میرا خیال ہے کہ اس میں مسلمانوں کا دوش نہیں ہے۔ دوش ان لوگوں کا ہے جن پر مسلمانوں نے اعتماد کیا تھا، جنہوں نے وعدے کئے تھے۔

آپ کو معلوم ہے اردو کا سوال ہو، ملازمتوں کا سوال ہو، علی گڑھ یونیورسٹی کا سوال ہو یا کمیونل رائٹ کا سوال ہو، مرکزی حکومت نے الیکشن کے وقت وعدے خوب کئے تھے، لیکن چناؤ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ وعدے بھلا دئے گئے۔ مسلمانوں کو تجارت کا مال سمجھ کر اسے منڈی میں بیچا گیا، لیکن جب اس کی عزت اور آبرو کا سوال تھا اس وقت بات سنی۔نائی کردی گئی۔

اُردو کے سلسلے میں بہت کچھ کہا گیا۔آج ایک گجرال کمیٹی بھی قائم ہوئی ہے، لیکن ابھی سبھدار جوشی جی کہہ رہیں تھیں کہ اس وقت دور شریمتی سچیتا کرپلانی کا تھا۔آج کملاپتی ترپاٹھی جی مسز اندا گاندھی کے اشارے کی وجہ سے وہاں ہیں۔آج کیا وقت ہے، کیا مشکل ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ ایک اور زیادتی یہ ہوئی کہ علی گڑھ کا مسئلہ ابھارا گیا اور ایسے وقت میں ابھارا گیا جب مسلمانوں کے جذبات کو غلط طور پر استعمال کرنے کے لئے ان ریکشنریوں نے سنگٹھن کیا جو مسلمانوں کے اصلی دشمن ہیں۔ اسی ہاوس میں جب علی گڑھ یونیورسٹی کا بل پاس کیا گیا ہم نے بہ آواز بلند پرائم منسٹر سے کہا تھا کہ اس بل کو اتنی جلدی میں پاس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ہم نے اس ملک کے سارے مسائل حل نہیں کئے ہیں کہ آج ہم علی گڑھ یونیورسٹی کا مقدر سنوار دینگے، لیکن شریمتی اندرا گاندھی کے

دائیں بائیں بیٹھنے والے حاکموں نے ،خوش آمدیوں نے ، چاپلوسیوں نے ان کو گمراہ کیا۔ آج خود مسز گاندھی کی حکومت کو اس بات کا احساس ہے کہ واقعی ایکٹ میں کچھ زیادتیاں کی گئی ہیں۔ اس یونیورسٹی کی اٹانومی کو ختم کر کے وائس چانسلر کو ڈکٹیٹر بنا دیا گیا ہے اور آج یہ احساس اس لئے پیدا ہو رہا ہے کہ یو پی میں انتخابات ہونے والے ہیں اور آج پھر مسلمان کو منڈی میں چڑھانے کے لئے سودا کیا جارہا ہے۔ اسے چند کھلونے دے کر بہلایا جارہا ہے۔ آج جو بات مانیہ فخر دین علی احمد کی سمجھ میں آئی، کرنل نصیر احمد زیدی کی سمجھ میں آئی، یہ بل پاس کرتے وقت کیوں نہیں آئی تھی۔ جب پوری اپوزیشن نے احتجاج کیا تھا کہ آپ علی گڑھ یونیورسٹی بل کو بہت ناجائز طریقے سے، بہت جلدی سے پاس کر رہے ہیں اس وقت الیکشن کا کوئی فوری خطرہ نہیں تھا۔ آج مسلمان لیڈروں نے جب دلی میں سنگٹھن کیا ان لوگوں سے جو اس ملک میں سوشلزم کے دشمن ہیں، تب کانگریسی نیتاؤں کی آنکھ کھلی۔ شاید پانی سر سے گذر گیا ہے۔ کچھ اور بھی شبہات موجود ہیں ہمارے سامنے۔ اس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات سے گھبرا کر ہندوستان کے مسلمانوں نے مسز گاندھی کو اپنا اعتماد بخشا۔ مسلمان یہ سمجھے کہ مسز گاندھی کے روپ میں ایک مسیحا آیا ہے، لیکن مجھے افسوس ہے یہ کہتے ہوئے کہ یہ مسیحا جو ہے، مسیحا ثابت نہیں ہوا، ایک جادوگر ثابت ہوا، یہ ایک مداری ثابت ہوا۔ جو اپنی بازی گری دکھا کر چلا گیا اور ہماری جیب کاٹ کر چلا گیا۔ ہوم منسٹری کی رپورٹ کہتی ہے، کمیونل سچویشن کے متعلق:

The improvement in the communal situation noticed in 1971 continued to be in the evidence

during this year. As against 521 communal incidents in 1970 and 320 in 1972, 240 communal incidents have taken place in the current year, including 12 of serious nature.

۲۴۰ مقامات پر بے گناہوں کا خون بہایا گیا ہے۔ وہاں ان کے گھر لوٹے گئے اور ہوم منسٹری کہتی ہے کہ اسے امپرومینٹ سمجھ لیجئے۔ ہندوستان آج آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ منا رہا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ ۲۴۰ کمیونل انسیڈنٹس کی کوئی حقیقت نہیں۔ میں پنتھ جی کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان کمیونل انسیڈینٹس میں ایک اوور ٹون اور ہے۔ پہلے ہندو اور مسلمان فساد کرتے تھے۔ پہلے فرقہ پسند ہندو اور فرقہ پسند مسلمان فساد کرتے تھے۔ آج مسلمانوں کی شکایت ہندو سے نہیں ہے۔ جن سنگھ سے بھی نہیں ہے، جن کے ساتھ ازلی دشمنی ہے۔ آج شکایت ہے پولیس سے۔ پولیس نے بنارس میں ہتھیا چار کیا، علی گڑھ میں ہتھیا چار کیا، گلبرگ میں ہتھیا چار کیا۔ آج شکایت کا رخ بدل گیا ہے اور آج آپ کہتے ہیں کہ ۲۴۰ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ نے مسلمانوں کے جذبات کا اندازہ نہیں لگایا ہے۔ مجھے معاف کیجئے میں مسلمان ہو کر مسلمانوں کے متعلق کہہ رہا ہوں، میں ایک ہندوستانی کی حیثیت سے یہ کہہ رہا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کبھی زندگی میں قومی دھارے میں اپنا برابر کا حصہ ادا کرنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ اس کی جتنے ذمے دار فرقہ پرست جماعتیں ہیں اس سے کہیں بڑھ کر کانگریس ہے۔ حکمران جماعت، طاقت میں ہوتے ہوئے، اقتدار میں ہونے کے باوجود

جس نے مسلمانوں کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ میں نے علی گڑھ یونیورسٹی پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ لفظ مسلمان اور مسلمان کے جذبات کی وابستگی اس لئے ہے کہ اس ملک میں سیکولرازم کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔ ہر تقریر میں پانچ منٹ کے بعد سیکولرازم کا لفظ دوہرایا جاتا ہے لیکن اس ملک میں واقعی طور پر سیکولرازم کا نظام پیدا نہیں ہوا ہے، قائم نہیں ہوا ہے۔ میری بہن شریمتی سبھدرا جوشی نے کچھ اعدادوشمار پیش کئے۔ میرا کام کچھ ہلکا ہو گیا۔ لیکن انہوں نے صرف ایک حصہ دیا آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں باقی حصہ آپ کے سامنے بیان کروں۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا ہے کہ سینٹرل سیکٹریٹ سروسز میں کل تعداد 14000 ہے۔ مسلمانوں کی تعداد 2، سیکٹریٹ کلاس کی 1، کل تعداد ۳۹۰۔ سیکشن آفیسر ۱۶۶۶ مسلمان ۱۲۔ اسسٹنٹ سینٹرل سیکٹریٹ اور سٹینو گرافر ۴۰۵۷ مسلمان ۱۹۔ سینٹرل سیکٹریٹ سٹینو گرافر سلیکشن گریڈ کل ۱۰۳۔ مسلمان کوئی نہیں۔ گریڈ (۱) ۱۹۰، مسلمان کوئی نہیں۔ گریڈ (۲) ۱۹۹۴ اور کل تعداد میں سے مسلمان صرف ۷۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ مسلمان سے کہتے ہیں کہ قومی زندگی میں اور قومی دھارے میں شامل ہو جاؤ، لیکن قومی دھارے میں شامل ہونے سے پہلے سرکاری ادارے میں شامل ہونے کا موقعہ تو دو۔ اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقعہ تو دو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فرقہ پرست مداری جو اس انتظار میں کہ مسلمانوں کی اس محرومی کا فائدہ اٹھایا جائے، تماشہ دکھا کران کو اپنی طرف بہلاتے ہیں۔ مسلمانوں میں منظم طور پر ایک قسم کا احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔

کشمیر کو دیکھئے آئینی طور پر بہت کچھ کہا جا رہا ہے، لیکن کشمیری مسلمانوں کی ملازمتوں کا کیا حال ہے؟ میں نے ابھی ملک میں مسلمانوں کی پوزیشن کا

جائزہ پیش کیا، لیکن کشمیری مسلمان جس کے لئے بانہال کا درہ ایک دیوار بن گیا ہے، وہاں سے باہر نہیں آسکتا۔ ہندوستان میں کون کون سے پبلک سیکٹر میں اور کون کون سے پرائیوٹ سیکٹر میں کتنے کشمیری مسلمان ہیں، یہ میں جانتا ہوں، دور کیوں جایئے، طعنہ دیا جاتا ہے کہ کشمیری ہی حکومت کررہے ہیں ملک پر، جی ہاں، لیکن کشمیری پنڈت کررہے ہیں۔ پرائم منسٹر کے سیکٹریٹ میں بہت سے اہم عہدوں پر مامور ہیں، لیکن کشمیری پنڈت، پرائم منسٹر سیکٹریٹ میں کام کرنے والے مسلمان کا کوئی پوسٹل ایڈرس بھی نہیں ملے گا۔ آپ اور جگہ کی بات کیا کررہے ہیں اس لوک سبھا کی بات کیجئے۔ یہاں درجنوں کشمیری ہیں، لیکن ترس گئی ہیں میری آنکھیں ایک چپراسی بھی کہیں کشمیری مسلمان نظر نہیں آئے گا، لیکن الزام یہ ہوگا کہ کشمیری مسلمان علیحدگی پسند ہیں۔ وہ نعروں پر اپنا ضمیر کھودیتے ہیں اپنی آواز کھودیتے ہیں۔ انسانوں کو محبت سے اعتماد میں لے کر قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ جانوروں کی طرح، حیوانوں کی طرح ان پر قبضہ کرینگے، تو ظاہر ہے کہ ان کا ردعمل بھی وہی ہوگا۔

مجھے معاف کیجئے ایسی ایسی مثالیں دی جاتی ہیں جن کا اصلی موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اجازت دیجئے میں بھی مثال دوں، اشارہ کروں بمبئی کی طرف جہاں پچھلے چند سالوں میں مسلم لیگ نے غالباً ۹۰ ہزار ووٹ ہتھیا لئے ہیں ایک ہنگامہ بپا ہے۔ اس سے پہلے شیو سینا اور فرقہ پرست جماعتوں نے ووٹ ہتھیا لئے تھے۔ میں مسلم لیگ کا حامی نہیں ہوں اور میرے مسلم لیگ کے دوستوں کو سن کر افسوس ہوگا کہ میں مسلم لیگ کا بھی اتنا ہی دشمن ہوں جتنا جن سنگھ کا، یا کسی اور کا۔ یہ میرے ذاتی تجربے کی بات ہے، لیکن اگر مسلم لیگ نے ووٹ لئے تو اس کے محرکات جاننے کی ضرورت بھی ہے۔ آج

بمبئی میں فساد ہے کہ صاحب مسلمان بندے ماترم گانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں بندے ماترم گانے کے لئے تیار ہوں۔ کوئی بھی گانا گانے کے لئے تیار ہوں لیکن اگر کسی مسلمان کو اعتراض ہو اس کے مذہبی عقیدے کی بناء پر۔

ایک مانیہ سدسیہ: فلمی گانا نہیں ہے بندے ماترم۔

شری ایس۔ اے۔ شمیم:

آپ اس کو قومی گیت نیشنل انتھم کہتے ہیں آپ کی معلومات کم ہیں۔ یہ نیشنل انتھم نہیں ہے۔ یہ میرے لئے مقدس نہیں ہے۔ بندے ماترم کے متعلق جب جواہر لال نہرو نے ٹیگور کو لکھا تو ٹیگور نے کہا کہ میں برہم سماج کا آدمی ہوں، میں نہیں گاؤں گا۔ ٹیگور کو یہ حق ہے لیکن اگر آج مسلمان کہتا ہے کہ کالی پوجا کے وہ الفاظ میں نہیں دہرانا چاہتا جو بندے ماترم میں ہیں، تو اس کو آپ یہ حق نہیں دینا چاہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کا سیکولرازم ان کو مجبور نہیں کر سکتا۔ میں ایک آزاد خیال مسلمان ہوں جو کہیں گانے کے لئے تیار ہوں۔ آج آپ بڑے جوش کے ساتھ بندے ماترم کی بات کہتے ہیں، لیکن کتنے لوگ ہیں جن کو بندے ماترم زبانی یاد ہے۔ جن من گن نیشنل انتھم ہے قبول کیا گیا ہے۔ اس سے کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن مہاراشٹر کی سرکار پوچھتی ہے مرکز سے کہ ان لوگوں کے خلاف کیا ایکشن لیا جائے جو بندے ماترم نہیں گاتے یا گانے پر آمادگی نہیں ظاہر کرتے۔ یہ زیادتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سیکولرازم کی توہین ہے جس پر ہمارے آئین کی بنیاد ہے۔

میں اس پلیٹ فارم سے مسلمانوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مایوس ہو کر جو راستہ اپنالیا ہے وہ خودکشی کا راستہ ہے۔ میں نہیں چاہتا

کہ مسلمان سیکولرازم کے اس بلند اصول سے منحرف ہو جائیں جس سے ملک کی تعمیر کرنی ہے، لیکن فرقہ پرستوں سے بھی میری گذارش ہے کہ مسلمانوں پر الزام لگانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ کہ انہوں نے اس معصوم ذات کے ساتھ کیا کیا ہے۔ ہر طرف فرسٹیشن (Frustation) ہے آج ایک مسلمان کی زبان سے کبھی کبھی یہ آواز اُٹھتی ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی گر چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مارچ ۱۹۷۳ء

ہند پاک تعلقات

(شری ایس۔اے۔شمیم سرینگر)

جناب سپیکر صاحب : میں نے دو تقریریں اس سدن میں بہت غور سے سنی ہیں ایک تقریر شری واجپائی جی کی اور ایک مسز گاندھی کی۔ان تقریروں کے لہجوں اور زبان سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک طرف گوروگولوالکر کی زبان برابر جاری ہے اور دوسری طرف مہاتما گاندھی کی زبان بولی جارہی تھی اور شملہ اگریمنٹ کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہے کہ آج اس ملک میں مہاتما گاندھی کی زبان کو زیادہ عزت حاصل ہوئی ہے، زیادہ اہمیت حاصل ہوئی ہے اور گوروگولوالکر کی زبان کو نہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ مبارکباد دی تھی وزیراعظم کو جب انہوں نے جنگ جیتی تھی۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ دوسروں کی تعریف کرنے کے معاملہ میں کافی کنجوس ہوں، لیکن مسز گاندھی نے ایک اور موقع پیدا کردیا۔انہیں میں دو اور باتوں کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ ایک شملہ اگریمنٹ کو پایۂ تکمیل پہونچانے کے لئے اور دوسری بہترین اور زوردار اور سب سے خوبصورت تقریر کرنے کے لئے جو انہوں نے کل کی۔

واجپائی جی کا ذکر بار بار آئے گا اس لئے کہ واجپائی کسی فرد کا نام نہیں ہے۔ واجپائی ایک علامت ہے۔ سمبل ہے ری ایکشن کی۔ اسلئے جب میں واجپائی کا نام لوں گا تو میں اس میں آچاریہ کرپلانی کو بھی شامل کروں گا اور مجھے معاف کریں گے سمر گوہا کہ ان کے اوپر بھی چھینٹ پڑے گی اس لئے میں

جب نام لوں گا تو واجپائی، اسے میرا مطلب جن سنگھ کے واجپائی سے نہیں بلکہ ان سبھی واجپائیوں سے ہے جو اس ملک میں بکھرے پڑے ہیں۔

کیا ہوا شملہ میں جس پر ناراضگی ہے، جس کی کدورت ہے۔ بھٹو کو ہم نے مضبوط بنایا۔ آپ اس ملک کے اتہاس سے ناواقف ہیں۔ گاندھی جی محمد علی جناح کے سر پر تاج رکھنا چاہتے تھے اگر وہ تقسیم کے مطالبے سے باز آجاتے۔ ہم نے کون سا کارنامہ کیا کہ ہم نے اس ملک کو جس میں ۲۵ برس کے بعد جمہوریت جڑ پکڑ رہی ہے، ہم نے اگر اس کو طاقتور بنانے کے لئے کچھ رعائتیں دی ہیں، ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ گاندھی جی کا دیش ہے جنہوں نے جناح سے کہا کہ آؤ اور پورے ملک پر حکومت کرو، لیکن تقسیم کا مطالبہ مت کرو۔ یہ جناح کی تنگ نظری تھی، غیر دانشمندی تھی، حماقت تھی کہ انہوں نے گاندھی جی کی پیش کش کو منظور نہیں کیا۔ شملہ میں ہوا کیا؟۔ شملہ میں ہزار سال تک جنگ کرنے والا بھٹو امن کی بولی بولنے لگا۔ یہ شملہ میں ہوا ہے اس کو یہ شکست کہتے ہیں تو فتح کس کا نام ہے جو کہتا تھا کشمیر لئے بغیر دم نہیں لوں گا وہ کہتا ہے کہ یہ تو کشمیر کا اپنا معاملہ ہے۔ میں اس کو ایکسپورٹ نہیں کرتا ریولیوشن کیونکہ میرے پاس تو جھوٹ بھی ایکسپورٹ کرنے کے لئے نہیں رہا ریولیوشن کیا اب ایکسپورٹ کروں گا۔ اس سے کسی کو کیا تکلیف ہوئی اگر یونائیٹڈ نیشن میں چیخنے والا، وہاں کاغذ پھاڑنے والا کہتا ہے کہ یواین او سے بھی میرا اعتبار اٹھ گیا ہے، میں ہندوستان سے بات کرکے مسائل حل کروں گا۔ اس کو آپ شکست کہیں گے، تو فتح کس چیز کا نام ہے؟۔

ہم نے کیا کہا تھا، ہم نے پاکستان کو جنگی محاذ پر نہیں آئیڈیولوجیکل فرنٹ پر شکست دی ہے۔ بنگلہ دیش کی کامیابی، بنگلہ دیش کا ایک ملک کے طور

پر وجود میں آنا کچھ لوگوں کے لئے جغرافیائی سوال ہوگا لیکن میں اس کو آئیڈیو لوجکل وکٹری سمجھتا ہوں۔ ہم نے ملک کی تقسیم کا فریب توڑ دیا۔ اور یہ ہماری وکٹری تھی ۔ واجپائی صاحب کہتے ہیں کہ کیوں آپ نے یونیلیٹرل (unilateral) سیز فائر کیا وہاں شکست دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں اس کے پہلے ہی یحیٰی خان کی شکست ہو چکی تھی۔ ہم نے کہا کہ پاکستان کی ایک انچ زمین پر بھی ہماری نگاہ نہیں ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم پاکستان میں جمہوریت کے احترام کے ساتھ ہیں ۔ پاکستان میں جمہوریت قائم ہوئی۔ پاکستانی علاقہ ہمارے پاس آیا۔ اب اگر وہاں جمہوریت قائم ہونے کے بعد بھی ہم کنفرنٹیشن کریں ، وہ امن کی بات کرے اور ہم کنفرنٹیشن (confrontation) کی بات کیا کریں تو دنیا میں ہمارا اعتبار اٹھ جاتا۔ یہ صرف واجپائی کے اعتبار کی بات نہیں ہے یہ گاندھی جی کے اعتبار کی بات ہے اور مجھے یقین ہے کہ گاندھی جی کے بھرم کو رکھنے کے لئے ، ان کے اعتبار کو قائم رکھنے کے لئے اس ملک کے ۵۶ کروڑ عوام قربانی دیں گے۔

واجپائی جی نے ایک سوال پوچھا کہ بھٹو کیوں خوش ہے؟ جب تک کہ دال میں کچھ کالا نہیں ہے۔ میں واجپائی سے پوچھتا ہوں کہ پاکستان کی جماعت اسلامی کیوں ناراض ہے؟ آپ کیوں ناراض ہیں؟ ایک ہی فریکوینسی پر آپ اور وہ پاکستان کے داڑھی والے مُلاّ کیوں بولتے ہیں۔ اگر شملہ سمجھوتہ نہ ہوا ہوتا تو کیا ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ کیا ہوتا، ہوتا یہ کہ کنفرنٹیشن کا مستقل پوسچر ہوتا۔ پرائم منسٹر نے صحیح لفظ استعمال کیا ہے۔

"We would not have been relaxing as we were doing today".

ورڈ ''ریلیکس'' ہے۔ بھٹو جب جنگ کی بات کرتے تھے چاہے وہ جنگ جیتتے یا نہیں لیکن ہندوستان کے ہزاروں غریبوں کی روٹی چھن جاتی۔ انہیں..... دینے کے لئے جو ہمارے پاس اثاثہ ہوتا وہ بندوقیں تیار کرنے میں لگ جاتا۔ بھٹو کی تقریر کا اثر صرف پاکستان کے عوام پر نہیں، اس ملک کے عوام پر پڑتا۔ اس ملک کے جھگی جھونپڑیوں والے سے، اس ملک کے غریبوں اور محنت کشوں سے جس کو ہمدردی ہے وہ جنگ کی باتیں نہیں کرتے۔ کشمیر میں ایک مثل ہے، اپنی پگڑی اس شخص کے قدموں میں نہ ڈال دو جو اس کو اڑا لینے کی اجازت دے۔ جب آپ نے دشمن کی پگڑی کو ہاتھ لگایا اس نے کہا نہیں نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شملہ میں ہم نے یہی کیا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم بھٹو کو کچل کر رکھ دیں گے تو وہ کچلا جاتا، لیکن ہم نے کہا کہ ہمیں پاکستان کے عوام سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور بھٹو آج پاکستان کے عوام کا نمائندہ بن کر آیا ہے۔ ہمارا انٹرسٹ رہا ہے، ہماری اسٹیکس ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت قائم ہو۔ ہمارے پاس ایک آلٹرنیٹو (alternative) تھا کہ پاکستان میں ڈکٹیر شپ قائم ہو۔ ہم نے سمجھوتے پر دستخط کر کے ہندوستان کے اوپر نہیں، پاکستان کے عوام کے اوپر بھاری احسان کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے اندر لوگ اس احسان کو مانتے ہیں۔

میں اس معاملے میں ایک اور نکتے کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں واجپائی کو کیا انٹریسٹ ہے، لیکن میرا ویسٹیڈ انٹریسٹ ہے پاکستان میں پیس ہونے میں، میں ملک کی اس ریاست سے تعلق رکھتا ہوں جہاں ریاست بٹی ہوئی ہے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس جنگ میں میرا ایک چچازاد بھائی لڑ رہا تھا۔ پاکستان کی طرف سے وہ وار پر تھا۔ ہم لوگوں کے

گھر بٹ گئے ہیں۔ واجپائی کا گھر نہیں بٹا ہے۔ سمر گوہا کا گھر نہیں بٹا ہے، لیکن میرا ایک بھائی وہاں ہے، میری ماں ہے، رشتے دار ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ امن ہو اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بھائی چارہ پیدا ہو۔

آپ کو کیا معلوم ہے کہ جب ہندوستان کے بمبار پاکستان پر بمباری کر رہے تھے تو ایک طرف سے میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ ہمارے جہاز سلامتی سے واپس آئیں اور دوسری طرف تشویش تھی کہ شاید وہ بم میرے بھائی پر گر نہ پڑے۔ دل میں ایک کرائسس ہے۔ آپ سرحدی علاقے تک گئے لیکن فوج کی گاڑی میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔ یہ اعزاز میرے لئے ہوتا۔ اس لئے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے شریمتی اندرا گاندھی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی طرف سے ایک بڑی ذہنی کش مکش کو ختم کرنے کے لئے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

کشمیر کا ذکر بار بار آیا ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح سے پاکستان میں کچھ لوگوں کی دکان کشمیر کے نام پر چلتی ہے، اسی طرح اس ملک میں بھی کچھ لوگوں کی دکان کشمیر کے نام پر چلتی ہے۔ میں واجپائی جی اور ان کے ساتھیوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ اکثر جبکہ کچھ تھیلے میں سے نکلتا ہے تو کشمیر کی پڑیا نکالتے ہیں اور کشمیر کا نام لے کر لوگوں کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کشمیر میں کیا ہوا، میں ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ بھٹو صاحب سے ملاقات کرنے سے پہلے شریمتی اندرا گاندھی نے شیخ محمد عبداللہ سے بھی ملاقات کی تھی۔ کشمیر میں یہ ہوا ہے کہ شیخ صاحب جو ابھی تک بند تھے اپنے کچھ مطالبات منوانے کے لئے ان میں سے ایک مطالبے میں انہوں نے یہ ترمیم

کی کہ میں ایکسیشن کی فائینلٹی (Finality) کو ایکسپٹ کرتا ہوں۔
یہ کشمیر میں ہوا ہے۔ کشمیر میں یہ ہوا ہے

The tallest Kashmiri says,"I have accepted the finality of accession. My quarrel is only with the quantum of autonomy." That is what the Tamil Nadu people are saying. No heavens have fallen.

اور کوئی بات نہیں۔ واجپائی جی کو میں ایک بڑی خبر بھی سنانا چاہتا ہوں:

Mrs. Indira Gandhi has something upto her sleeves. She is going to give you another surprise.There will be no Kashmir issue to be discussed at all. That is one of the reason why Mr.Bhutto talks about the people of Kashmir.It is because Mr.Bhutto believes that the people of Kashmir have decided something which is very important.

بہت سے لوگوں نے ناراضگی ظاہر کی ہے۔ بھٹو صاحب نے کہا کشمیر یو اُٹھو، بہادرو اُٹھو، ہم تمہاری مدد کریں گے۔ یہ پہلی تقریر نہیں ہے جو کی گئی ہے اس طرح کی تقریریں کرتے کرتے لیاقت علی مر گئے۔ ایوب خان پرلوک سدھار گئے، یحییٰ خان بھی چلے گئے۔ اس طرح کی تقریریں کرنے سے کبھی انقلاب نہیں آئے۔ ریڈیو پر کی گئی تقریر سے کبھی اپرائزنگ (uprising) نہیں ہوا ہے۔ بنگلہ دیش میں بھی کبھی اپرائزنگ ہوا ہوتا اگر ۵۰ ہزار ریڈیو

سیٹ سے سے سپیچ نہ شروع کی جاتی، یا اپیل کی جاتی، جب تک آبجیکٹو کنڈیشنز آف ریولیوشن (objective conditions of revolution) نہ ہوتب تک ریولیوشن نہیں ہوا کرتا کشمیر میں جب پاکستانی آئے، فوج کی امداد کے بغیر سب سے پہلے وہاں کے لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ شریمتی اندرا گاندھی کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ کل انہوں نے بڑی اعتماد کے ساتھ، جرأت کے ساتھ کشمیریوں کو ڈیفینڈ کیا۔ آج شری بلراج مدھوک کو، اور واجپائی جی کو کشمیر کی فکر لگ گئی ہے۔ کشمیر کا ایک چھوٹا سا پروبلم ہے اور وہ پروبلم پیدا کیا ہوا ہے شرج بلراج مدھوک کا، شری واجپائی کا، شری گول والکر کا۔ شیخ محمد عبداللہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کی ذمہ داری اگر اس ایک باڈی پر ہے تو میں کورٹ کرتا ہوں جواہر لال نہرو کو ان پر ہے۔ پرجا پریشد ایجٹیشن کی حمایت کر کے اگر ایک باڈی نے شیخ محمد عبداللہ کو اپنی راہ سے ہٹایا ہے تو وہ جن سنگھ ہے۔ اپنے ویسٹیڈ انٹریسٹ کو زندہ رکھنے کے لیے آج کشمیر کا نام الاپا جا رہا ہے۔ کشمیر میں قبائلی حملے کی سازشیں منظّم جب ہوئی تھیں اور جب یہ حملہ ہوا تھا اس کے سلسلہ میں شری بلراج مدھوک نے پیچھے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کشمیر کو میں نے بچایا۔ میں کہوں گا کہ آپ نے نہیں واجپائی جی نے بھی بچایا ہو گا۔ ان لوگوں کو کشمیر کا جغرافیہ تک معلوم نہیں یہ تو سارا اپنا وقت ٹیلیفون سننے میں صرف کرتے ہیں اور انہوں نے بتایا تھا: شملہ میں کس نے کس کو ٹیلیفون کیا، چلو کم سے کم ٹیلیفون کے معاملوں میں تو یہ دلچسپی لینے لگے۔

کشمیر میں کیا ہوا، اس کو میں ایک خط سے جو آج مجھے کینڈا سے آیا ہے کو پڑھ کر بتانا چاہتا ہوں کہ اس کو لکھنے والا ایک کشمیری مسلمان طالب علم ہے ڈاکٹر محی الدین، جسے ڈی۔ پی صاحب جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں

کیونکہ ہم دوست رہ چکے ہیں۔ وہ ۶/سال پہلے کشمیر سے بھاگ گئے تھے، اپنے خوابوں کی جنت پاکستان میں۔ تب وہ سرحد پار کر گئے تھے، ایک سال پاکستان میں رہنے کے بعد وہ کینڈا چلے گئے۔ میری ان سے پچھلے سال ملاقات ہوئی تھی اس خط کو پڑھ کر میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں:

My Dear Shamim,

Things have changed quite a bit since you visited Canada last Year. I mean the change in the sub-continent, but not enough.Instead of 2 nations, there are now3.In fact,there are 3 States in one nation.What we needed was a sort of Abraham Lincoln to unite all the warring factions in one single State and nation- the nation of one single India.After a while,all people and all the factions would have rejoiced over the achievement of a once-again united India.There are twice as many Moslems living in India as is in Pakistan. So, what fun is there to have a separate Moslem national home-land in what is left of Pakistan.

کشمیر میں یہ ہوا ہے۔ اسی نوجوان کے دل میں جو ۶/سال پہلے رات کے اندھیرے میں بھاگا تھا اپنے خوابوں کی جنت دیکھنے کے لیے، مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ اس معاہدے کو پارلیمنٹ کے سامنے لانا چاہیئے تھا اور

اس کو ریکٹیفائی کرنا چاہئے تھا لیکن کیا اس معمولی سی فروگذاشت کے لیے میرے دوست اس عظیم ترین اگریمنٹ کی اہمیت کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ ایک لڑکا امتحان میں فرسٹ کلاس پرچے کرتا ہے لیکن دو جگہ وہ سپلینگ مسٹیک کرتا ہے اور کہا جائے کہ اس کو فیل کر دیا جائے۔ مسز گاندھی نے یہ سپلینگ مسٹیک کی ہے کہ اس معاہدے کو پارلیمنٹ سے ریکٹیفائی کروانا چاہئے تھا۔ چاہے کونسٹی ٹیوشن میں اس بارے میں پرووِیژن ہو یا نہ ہو اور انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اتنا بڑا تاریخی کارنامہ ہے کہ اس کے لیے مسز گاندھی اور ہندوستان کے ۶۵ ر کروڑ عوام مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اگست ۱۹۷۲ء

بجلی کا مسئلہ

شری ایس۔اے۔شمیم: میں دو منٹ میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک بات یہ کہ اگر پانی کی کمی کی وجہ سے، کسی ایکسیڈنٹ کی وجہ سے، پاور میں کرائیسس پیدا ہو جاتی تو دلی میں شاید معاف کیا جا سکتا تھا لیکن جن ڈرامائی حالت میں یکا یک پانچ جنریٹروں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔اس نے جائز طور پر شک کا موقعہ دیا ہے۔شکایت کا موقعہ دیا ہے۔یہ بات جب راجدھانی میں ہو سکتی ہے تو آپ اندازہ کیجئے کہ اس دیش میں کہاں کہاں کیا کیا ہو رہا ہوگا۔

دوسری بات میں کہنا چاہتا ہوں۔اگر پاور شارٹیج دلی میں بسنے والوں پر آن پڑی تو اس میں برابر کے سب شریک ہونے چاہئیں۔اخبار نے لکھا ہے کہ جس کا ابھی تک ورودھ نہیں کیا گیا کہ پرائم منسٹر کے یہاں، راشٹر پتی کے یہاں اور نہ معلوم کس کس پتی کے یہاں کل ہی بجلی ریسٹور ہوئی جب کہ دلی کے جنتا بجلی کے ہوتے ہوئے بھی جھلس گئی۔

اس کو پاور کا سنکٹ برداشت کرنا پڑا، تب سوشلزم کے دعوے داروں، غریبی ہٹاؤ کے دعویداروں اور برابری کے وعدے داروں کو شرم نہیں آئی۔اس لیے مجرمانہ غفلت ہے اور میں سمجھتا ہوں منسٹر ہی نہیں پوری سرکار کی یہاں سے چھٹی دینی چاہیئے۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

ترمیمی بل

سب سے پہلے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آج کی بحث کا تعلق صرف علی گڈھ یونیورسٹی سے ہی نہیں، علی گڈھ تحریک سے بھی ہے کیونکہ علی گڈھ یونیورسٹی بجائے خود علی گڈھ تحریک ہی کی پیداوار ہے۔ آیئے سب سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ علی گڈھ تحریک کیا تھی؟ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب ہندوستان کے مسلمان اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر قومی دھارے سے الگ ہو چکے تھے، تو ایک دور اندیش، روشن دماغ اور ترقی پسند مسلمان سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نئی زندگی کے تقاضوں سے روشناس کرنے کے لیے ایک کالج کی بنیاد ڈالی، تاکہ مسلمان انگریزی پڑھیں۔ نئی تعلیم سے فائدہ اٹھائیں اور نئے نئے خیالات اپنائیں۔ یہ جذبہ علی گڈھ تحریک کی بنیاد بھی تھا اور نقطہ آغاز بھی......اور اس مقصد کے لیے کالج کی تعمیر ہوئی۔ اس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے بہرہ ور کرانے کا سر سید کا فیصلہ بے شک ایک دانش مندانہ قدم تھا اور اس کے بغیر وہ ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں مؤثر رول ادا نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ

ہمیشہ کے لیے بہتر تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر آسودہ حال ہندوؤں کے دست نگر رہتے۔

جواہر لال نے جامع انداز میں علی گڈھ تحریک کے مقاصد اور معنویت پر روشنی ڈالی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ علی گڈھ یونیورسٹی کے مسئلے کو بھی اس پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ علی گڈھ یونیورسٹی جس مقصد کے لیے قائم کی گئی تھی کیا وہ مقصد پورا ہوگیا ہے؟ وہ جن حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قائم ہوئی تھی کیا آج وہ حالات بدل گئے ہیں؟ میرے خیال میں نہ وہ مقصد ابھی تک پورا ہوا ہے، اور نہ ہی حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ مسلمانوں میں علی گڈھ تحریک کی ضرورت باقی نہ رہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ترقی پسند، سیکولر اور سوشلسٹ ہندوستان میں یہاں کے مسلمان ترقی پسندانہ رول ادا کریں تو انہیں تاریخی رول کے لیے تیار کرنے کے لیے ایک درس گاہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تعلیم کے میدان میں مسلمان پسماندہ ہیں یا نہیں؟ اقلیت کے علاوہ ایک تہذیبی اقلیت ہیں یا نہیں؟ وہ مذہبی اقلیت کے علاوہ ایک تہذیبی اقلیت ہیں یا نہیں؟ انہیں ایک سیکولر ہندوستان میں باعزت طور زندہ رہنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ ان تمام سوالات کا جواب اگر ''ہاں'' ہے تو علی گڈھ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو نہ سہی لیکن اس کے مخصوص کردار کو برقرار رکھنا ہی ہوگا۔

علی گڈھ یونیورسٹی کا ایک مخصوص اور منفرد کردار ہے اور اسے ختم نہیں کیا جانا چاہئے۔ علی گڈھ کی درس گاہ کی ایک تاریخی اہمیت ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے اور اہم حصے کو اکثریت

کی سطح پر لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی تعلیمی پسماندگی دور کی جائے اور اس مقصد کے لیے انہیں خاص سہولیتیں دی جائیں۔ علی گڈھ یونیورسٹی نے ماضی میں اس ضرورت کو پورا کیا ہے اور کسی حد تک آج بھی پورا کرسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے نام سے فرقہ پرستی کی بُو آتی ہے اور اگر جوشی جی اور سمر گوہا کی بات مان لی جائے تو ''مسلم'' کا لفظ حذف کردینے سے علی گڈھ سے منسوب ساری فرقہ پرستی ختم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن جوشی جی اور سمر گوہا، دونوں یہ بات جانتے ہیں کہ نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرقہ پرستی اصل میں انسان کے دلوں اور ذہنوں میں پرورش پاتی ہے۔ جن یونیورسٹیوں کے ساتھ مسلم کا لفظ وابستہ نہیں بھی ہے وہ بھی فرقہ پرستی اور فرقہ پرستوں کی آماجگاہ ہیں۔ علی گڈھ کے ساتھ ''مسلم'' کا لفظ اس کے تاریخی کردار کی نشان دہی کرتا ہے اور یہ اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے اپنی تعلیمی پسماندگی اور علیٰحدگی پسندی کو ختم کر کے نئی روشنی سے متعارف اور مانوس ہونے کے لیے بنائی تھی۔ علی گڈھ یونیورسٹی، تاج محل، لال قلعہ، قطب مینار اور جامع مسجد کی طرح ایک تاریخی حقیقت اور دور کی نمائندہ ہے۔ آج اگر کچھ لوگ تاج محل کا نام اس لیے بدلنا چاہیں کہ یہ شاہ جہاں نام کے ایک مسلمان بادشاہ نے بنایا تھا تو آپ کیا کہیں گے اور آپ نے سنا ہوگا کہ جوشی جی کی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک مورخ کچھ دنوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تاج محل شاہ جہاں نے نہیں، کسی رام ناتھ نے بنوایا تھا۔ آپ نام بدلنے پر آجائیں تو پھر آپ کو قطب مینار اور لال قلعے کا بھی نام بدلنا پڑے گا۔ یہ تاریخی تسلسل کی حکایت ہے اور جس طرح تاج محل ہماری تہذیب اور ہمارے مشترکہ کلچر کی ایک خوبصورت یادگار ہے اسی طرح علی گڈھ

یونیورسٹی بھی ہمارے مشترکہ تمدّن کی ایک زندہ جاوید یادگار اور نشانی ہے۔
اس کے نام کو اس لیے نہیں بدلنا چاہئے کہ یہ ہماری تاریخ کا حصہ اور ہمارے مشترکہ کلچر کی علامت ہے۔

علی گڈھ یونیورسٹی کے ساتھ ''مسلم'' کا لفظ منسوب ہونا، پروفیسر سمر گوہا اور جن سنگھ کی نظروں میں اس کی فرقہ پرستی کی ناقابل تردید دلیل ہے لیکن اس کے جواز میں اس ملک کی ایک برگزیدہ شخصیت اور صدر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ میری نیت پر شک کرنے والے اس ایوان میں کئی لوگ موجود ہیں لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی نیت اور ان کے سیکولرازم پر کوئی شک نہیں کرسکتا۔ علی گڈھ کے مخصوص کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا تھا:

''ہمارے موجودہ آئین کی رو سے ہماری سیکولر جمہوریہ میں ایک سو فیصد ہندو اور ایک سو فیصد مسلم ادارہ کا ہونا ممکن ہوسکتا ہے ہمارا آئین خالص مسلم یا خالص ہندو ادارے قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا ایک سیکولر جمہوریہ میں ایک ہندو یونیورسٹی اور ایک مسلم یونیورسٹی مرکزی یونیورسٹیوں کی حیثیت سے قائم رہ سکتی ہے کیونکہ ایک سیکولر جمہوریہ ہی دونوں کو قائم کرنے کی وسعت قلبی، رواداری اور بلند نگہی کا مظاہرہ کرسکتی ہے۔''

ذاکر صاحب کے خلاف کوئی یہ الزام تو نہیں لگا سکتا کہ وہ علی گڈھ کو فرقہ پرستی اور فرقہ پرستوں کی آماجگاہ بنانا چاہتے تھے۔ بعض حلقوں کی طرف سے الزام لگایا گیا ہے کہ علی گڈھ سے علیٰحدگی پسندی تحریک اُبھری یا یہ کہ علی گڈھ نے پاکستان نواز لوگوں کو جنم دیا ہے۔ میں اس الزام کی پُر زور تردید کرتا ہوں جس یونیورسٹی نے ذاکر حسین، پروفیسر حبیب، ڈاکٹر سید محمود، مولانا شوکت علی،

مولانا محمد علی اور (اگر آپ بُرا نہ مانیں) شمیم احمد شمیم کو پیدا کیا ہو (قہقہہ) اس پر پاکستان نواز لوگوں کو جنم دینے کا الزام گمراہ کن اور شرانگیز ہے۔ یونیورسٹی کے کردار کا اندازہ کرنے کے لیے تعداد سے زیادہ معیار کا لحاظ کرنے پڑے گا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ جن شخصیتوں نے دنیا میں نام پیدا کیا ہے وہ کہاں سے پیدا ہوئے ہیں۔ علی گڈھ سے کسی کریم، کسی عبداللہ یا کسی زیدی نے تعلیم پا کر چوری یا سمگلنگ کی ہو، تو اس سے علی گڈھ کے کردار، یا اس کے روشن نام پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ بنارس یونیورسٹی نے پچھلے بیس پچیس برسوں میں بڑے بڑے قاتل پیدا کیے، لیکن اس سے نہ ہندو دھرم پر حرف آیا ہے اور نہ بنارس یونیورسٹی پر حرف آئے گا۔

مسلمانوں کو قومی دھارے کے ساتھ ملانے کے لیے ان کی ذہنی سطح کو بلند کرنا ہوگا۔ اتنا بلند کہ وہ کسی قسم کے پروپیگنڈا، چاہے وہ پاکستان سے ہو یا کسی اور سمت سے، سے متاثر نہ ہوں اور وہ غلط قسم کے رجحانات کا مقابلہ کرنے کے اہل ہوسکیں۔ انہیں بہترین تعلیم سے آراستہ کرنے سے ہی ان کے وسوسوں اور تعصّبات کو دور کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں علی گڈھ کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔

مسلمانوں کا علی گڈھ کے ساتھ مسلم لفظ کی وابستگی پر زور دینے کی ایک نفسیاتی وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ جن سنگھ اور جن سنگھی ذہنیت رکھنے والے کچھ لوگ چونکہ اس کو ہٹانے کا مطالبہ کرر ہے ہیں اس لیے مسلمانوں کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوگیا ہے کہ ہونہ ہو مسلم کا لفظ ہٹا کر مسلم تہذیب اور کلچر کو ختم کرنے کی سازش کی جا رہی ہو۔ جن سنگھ اس قسم کے مطالبات کر کے نہ صرف اکثریت کو گمراہ کرر ہا ہے بلکہ بالواسطہ طور مسلمانوں کے مطالبات میں بھی انتہا

پسندی کا عنصر شامل کردیتا ہے۔

علی گڈھ یونیورسٹی صرف ایک ادارے کا ہی نہیں، ایک تحریک کا نام ہے اور اگر مسلمانوں کو نئے ہندوستان میں ایک ترقی پسند اور مثبت رول ادا کرنے کے لیے تیار کرنا ہے تو علی گڈھ کے مخصوص کردار کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

آزادی کے ۲۵ سال بعد بھی ابھی تک مسلمانوں کو اس ملک میں میں تعلیم اور ترقی کے وہ مواقع حاصل نہیں ہیں کہ جن کی ہندوستانی آئین میں ضمانت دی گئی ہے۔

میں مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مطالبہ نہیں کررہا ہوں۔ یہ مطالبہ کرنے والے سیلمان سیٹھ صاحب ابھی میرے بعد تقریر کریں گے۔ لیکن میں علی گڈھ کے مخصوص کردار کو محفوظ کرنے کے حق میں ہوں اور میرا مطالبہ ہے کہ اس کردار کو نہ صرف برقرار رکھنا چاہیئے بلکہ اسے آئینی طور تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ سیکولرازم ہمارا آدرش ہے، ہمارا نصب العین ہے، لیکن اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں کتنے لوگ سیکولرازم کا پالن کرتے ہیں؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی مسلمانوں کے ساتھ تعلیمی اداروں میں داخلے، سرکاری ملازمتوں میں بھرتی اور پرائیوٹ کارخانوں میں کام حاصل کرنے کے سلسلے میں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں سطحوں پر امتیاز برتا جاتا ہے۔

شنکر دیال سنگھ: یہ غلط ہے کہیں کوئی Discrimination نہیں ہوتا۔

شمیم احمد شمیم: میری بات اطمینان سے سنئے میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز کی بات کررہا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں، اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں سیکولرازم ابھی ایک تصور ہے جو حقیقت نہیں بن پایا ہے۔

شنکر دیال: میں آپ کی بات سے ہرگز اتفاق نہیں کرتا۔

شمیم احمد شمیم: آپ مجھے اشتعال دلائینگے تو میں کچھ اور تلخ باتیں کہنے کے لیے بھی مجبور ہوں گا۔ آپ مسلمان نہیں ہیں، آپ کو کیسے تجربہ ہوسکتا ہے، میں مسلمان ہوں اور میں اپنے تجربات کی بات کر رہا ہوں اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ وزیر اعظم بھی کہہ چکی ہیں اور ملک کے بہت سے سرکردہ رہنما بھی۔ اس لیے آپ بادشاہ سے زیادہ وفادار بننے کی کوشش نہ کیجئے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سیکولرازم کے قومی آدرش ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن ہمارے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں اس کا احترام نہیں ہوتا۔ یہ میری ناچیز رائے ہے اور جمہوریت میں ناچیز کو بھی اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق حاصل ہے۔ شنکر دیال سنگھ جی کو شاید علم نہیں کہ نوکریوں کے معاملے میں سرکاری اور پرائیوٹ سطح دونوں پر مسلمانوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے، کالجوں میں داخلے کے سلسلے میں بھی ان سے انصاف نہیں ہوتا، تجارتی اداروں میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

مسٹر بینر جی: پولیس اور فوج میں مسلمان بھرتی نہیں کیے جاتے۔

شمیم احمد شمیم: سمر گوہا اور بعض دوستوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بنگلہ دیش میں ترقی پسند قوتوں کی فتح کے بعد اس ملک میں بھی فرقہ داریت ختم ہوگئی اور تمام مسئلے حل ہوئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا، تو میں سب سے زیادہ خوش ہوتا، کیوں کہ فرقہ داریت سے سب سے زیادہ نقصان میری کمیونٹی کو ہوتا ہے، اقلیتی طبقہ کو ہوتا ہے اور میں فرقہ داریت کے زہر کو مٹانے میں سب سے آگے ہوں، لیکن سمر گوہا کے چاہنے سے حقائق نہیں بدلتے۔ جب تک فرقہ داریت موجود ہے آپ مجھے اس کے وجود سے انکار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ میں اس خیال

سے متفق ہوں کہ علی گڈھ کو ترقی پسند مسلمانوں کی ذہنی تربیت کے لیے ایک بہترین لیبارٹری اور درس گاہ ہونا چاہئے اور اسے فرقہ پرست ملاؤں کے تسلط سے آزاد کرنا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ ہی علی گڈھ میں پڑھنے والے بچوں اور ان کے والدین کو اس بات کا یقین ملنا چاہئے کہ سیکولر اور سوشلسٹ ہندوستان میں انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہیں کہ جو آئین میں درج ہیں اور جو اکثریتی طبقے کو حاصل ہیں۔ علی گڈھ مسلمانوں کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہی نہیں، ان کے درخشاں مستقبل کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ اس لیے میری اس ترمیم کو تسلیم کیا جانا چاہئے کہ ترمیمی بل میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ اس بات کی صراحت کی جائے کہ یہ ادارہ مسلمانوں کا قائم کردہ ہے اور انہیں اس کے انتظام وانصرام میں غیر معمولی دخل رہنا چاہئے۔

۱۹۷۱ء

خارجہ پالیسی میں
تنگ نظری کا رجحان

شری ایس۔اے۔شمیم: ڈپٹی اسپیکر صاحب۔کل سے یہ بحث بڑے غور سے سن رہا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس ملک کے خارجی مسائل پر بحث کرنے کے بجائے ہم کچھ اور ممالک کے خارجی مسائل کے متعلق بحث کر رہے ہیں کہ امریکہ کو کیا کرنا چاہیے، روس کو کیا کرنا چاہئے اور چین کو کس طریقے پر بہیو (behave) کرنا چاہئے۔ یہ ارشادات اور ہدایات اس ایوان سے جاری ہو رہے ہیں لیکن ہمیں کیا کرنا چاہئے اور ہم نے کیا کیا ہے۔اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مقابلے کی دنیا میں ہمارا کہیں وجود نہیں ہے۔ ہم فرینڈ لیس ہیں۔ ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک ملک کے لیے جس کی آزادی کو صرف ۲۴ سال کا عرصہ گزرا ہو اس کا ایک ایسے ملک کے ساتھ مقابلہ کرنا، جس کی آزادی کو ۴۰ سے ۵۰ سال سے زیادہ ہوئے ہوں۔ یقیناً غلط نتائج پیدا کرسکتا ہے۔سوال یہ ہے کہ آپ مقابلہ کرتے ہیں کہ چائنا ایک سپر پاور بن گیا۔ امریکہ ایک سپر پاور بن گیا لیکن اس کے سپر پاور بننے میں جو ایک تاریخ ہے، جو جدو جہد ہے، اس کو آپ نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ مقابلہ کرتے ہیں پاکستان کے ساتھ کہ پاکستان کے بہت سارے دوست ہیں اس کی خارجی پالیسی کامیاب رہی۔آج پاکستان کی خارجی پالیسی کامیاب

رہی ہے۔ اگر اس کی جانبدارانہ پالیسی امریکہ کے ساتھ دوستی اور چائنا کے ساتھ دوستی اُس کو بچا سکتی ہے تو پاکستان آج یہ کرائیس فیس نہیں کرتا ہوتا جس سے کہ آج اُس کا مقابلہ ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں صرف اپنے کو کنڈیم (Condemn) نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے مقابلے اپنے اس ملک میں ہم نے ایک ایسا نظام قائم کیا ہے اور نظام کو قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں جو اس قسم کے پریشر کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ اس ایوان میں دو طرح کی تنقید ہوئی ہے۔ اس ایک حلقے سے لوگوں نے یہ کہا کہ ہندوستان روس کا دست نگر ہے اور دوسری طرف سے یہ کہا گیا کہ یہ امریکہ کا دست نگر ہے۔ دونوں میں سے ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ ملک نہ امریکہ کا دست نگر ہے اور نہ روس کا دست نگر ہے۔ اس ملک کے سامنے کتنی ہی مشکلات ہیں جن سے نپٹنے کی ہم تیاری کر رہے ہیں۔

بنگلہ دیش کا سوال ہمارے سامنے آیا ہے۔ بنگلہ دیش کے سوال کے متعلق اتفاق سے تمام ملک کی ایک آواز ہے۔ اس حد تک کہ بنگلہ دیش کے مجاہدوں کے ساتھ ہماری مکمل ہمدردی ہے انہیں ہماری اخلاقی حمایت حاصل ہے۔ لیکن اس حمایت کو دینے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس ملک کے سامنے اپنی فارن پالیسی کا مقصد ہے کہ ہمیں صرف بنگلہ دیش میں نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جمہوریت کو تکلیف پہنچتی ہے، ڈکٹیٹرشپ کو بڑھاوا ملتا ہے، اس کی ہمیں مخالفت کرنی چاہیئے یہ ہماری فارن پالیسی کا بنیادی مقصد ہونا چاہیئے۔

کہا گیا ہے کہ مستقل دوست بھی نہیں ہوتے اور مستقل دشمن بھی نہیں ہوتے۔ میرے خیال سے ہماری سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ ہم یہاں تقریریں بڑی زوردار

کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ امریکہ نے ہمیں خوش کرنے کے لیے یہ کیوں نہیں کیا۔
عرب دیشوں نے ہمارے ساتھ ہمدردی کیوں نہیں کی This is asking too much.This is expecting too much امریکہ بھی آپ سے ایکسپیٹ کرتا ہے کہ آپ ویتنام میں اس کی پالیسی کی حمایت کریں۔ اگر نہیں کرتے ہیں تو اس کی قیمت دینی پڑتی ہے۔ ہر ملک کو اپنی آزادانہ پالیسی اختیار کرنے کے لیے کچھ قیمت دینی پڑتی ہے اور اس ملک کو بھی قیمت دینی پڑ رہی ہے۔ پاکستان کو ہتھیار مل رہے ہیں، بنگلہ دیش میں نسل کشی کرنے کے لیے۔ امریکہ نے نہ صرف بنگلہ دیش میں بھی نسل کشی کرنے کے لیے پاکستان کو ہتھیار دیئے، بلکہ ویتنام میں بھی نسل کشی کے لیے ہتھیار مہیا کیے ہیں۔

آپ سمجھتے ہیں صرف چین کے ساتھ دوستی کرنے کے لیے امریکہ نے پاکستان کے ساتھ دوستی کی۔ یہ ہماری تنگ نظری ہے۔ امریکہ کی پالیسی گلوبل پالیسی ہے۔ اس کے ذہن میں بہت بڑے بڑے مقاصد ہیں۔ وہ آپ کی اور میری پرواہ نہیں کرے گا اور تب تک پرواہ نہیں کرے گا جب تک ہمارے ملک کے پاس طاقت نہیں ہے۔ وہ طاقت کیسے بنتی ہے، نہ لڑائی سے بنتی ہے، نہ تقریروں سے بنتی ہے، کہ صاحب ہم بہت کمزور ہیں۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، ہماری دنیا میں ساکھ نہیں ہے۔ ہم کو اپنی برائی کرنے کی عادت ہوئی ہے کہ ہم کمزور ہیں۔ اس سے کام نہیں چلنے والا ہے۔

دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ بنگلہ ذیش کے سوال پر آپ نے عرب ممالک سے توقع رکھی امداد کی۔ کل مانیہ واجپائی جی تقریر کر رہے تھے وہ ایک ایسی جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں جنہوں نے صاف طور پر کہا ہے کہ ہم پاکستان کا ڈس انٹیگریشن (Disintegration) چاہتے ہیں اور اس جماعت کی ریپوٹیشن عرب ممالک میں یہ ہے کہ اپنے ملک میں بھی یہ مسلمانوں کے دشمن

ہیں۔ میرا یقین ہے کہ عرب ممالک کی سرد مہری کا جو رویہ تھا اس کا بہت حد تک قصور اس جماعت پر جاتا ہے جس کی ترجمانی مانیہ واجپائی جی کر رہے ہیں۔

کل مانیہ واجپائی جی نے مذہب اسلام کا سرٹیفکٹ پیش کیا کہ انہیں بھی جن سنگھ کی کشمکش سے مسرت ہوئی ہے۔ انہوں نے بھی بنگلہ دیش کے لیے جن سنگھ کی جدو جہد کی تعریف کی ہے۔ میں اُن سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ واقعی بنگلہ دیش کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں، اگر ان کی بنگلہ دیش کے حریت پسندوں کے ساتھ ہمدردی ہے، دلچسپی ہے تو وہ اپنی اس ہمدردی کا اظہار نہ کریں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ انہیں ہمدردی نہ بنگالیوں سے ہے، اور نہ بنگال کے مسلمانوں سے، اور نہ وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ دلچسپی ہے بلکہ پاکستان کی ڈس انٹگریشن کے ساتھ ہے۔ لیکن ہندوستان کی پردھان منتری نے یہ بات کھل کر کہی ہے کہ یہ ملک پاکستان کا ڈس انٹیگریشن نہیں چاہتا ہے۔ پاکستان کا ڈس انٹیگریشن دو ہی آدمی چاہتے ہیں۔ ایک واجپائی جی اور دوسرے جنرل یحییٰ خان۔ مسٹر بھٹو کسی قطار میں نہیں آئے۔ ان دونوں میں اگر کوئی سمبندھ ہے تو ہے اگر نہیں ہے تو پھر غیر شعوری طور پر ان انٹینشنلی، یہ ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔

ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم امن کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں اور اب بھی جمہوریت کو جہاں پر خطرہ پہنچتا ہے، ہمیں کھل کر آواز بلند کرنی چاہیئے اور اُس وقت تک کا انتظار کرنا چاہیئے جب تک ہماری طاقت اتنی بڑھ جائے گی کہ بین الاقوامی معاملات میں ہمارا زیادہ سنجیدگی سے نوٹس لیا جائے گا۔ ابھی اس میں وقت لگے گا لیکن پریشانی کی ضرورت نہیں۔ مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں ملک میں ایک مظبوط سیاسی نظام قائم ہے جو یقیناً ہمیں اس راستے پر لے جائے گا۔

◆◆◆

۱۹۷۱ء

سرکار کی بے حسی

شری ایس ۔اے۔ شمیم : سری نگر۔

سبھا پتی جی ۔ میرے بہت سے اپوزیشن کے دوستوں نے سرکار پر قیمتوں کے بڑھنے کی ذمہ داری ڈالتے ہوئے سرکار کو چلے جانے کا مشورہ دیا ہے۔ میں سرکار سے گذارش کروں گا کہ سرکار سب کچھ کرے لیکن اس وقت چلی نہ جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دو، چار سال کے عرصے میں سرکار نے اس ملک کا ستیہ ناس کر کے رکھ دیا ہے۔ کیا کیا جائے، کسی اور اپوزیشن پارٹی میں طاقت نہیں ہے اس ملک کو سنبھالنے کی ۔ سرکار جائے گی اور یقیناً جائے گی ۔ ۱۹۷۶ء میں اور اس سے جو آمدنی ہوگی، جو سرکاری ممبروں کی ضمانتیں ضبط ہونگی، اس سے غریبی ہٹانے میں کچھ مدد ملے گی۔

یہ بات بہت سے لوگوں نے کہی کہ قیمتیں کیوں بڑھ گئیں، اس کی کیا وجہ ہے۔ امریکہ میں بڑھی ہیں، برٹین میں بڑھی ہیں۔ اس لیے یہاں بھی بڑھی ہیں۔ یہاں بڑی انٹیلیکچول قسم کی بحث ہوئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ بچوں کی پیدائش پر روک لگانی چاہیئے۔ تعلیمی نظام بھی بہت بدل رہا ہے اور بچوں کے پیدا کرنے پر بھی پابندی سرکار نے لگائی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر قیمتیں بڑھ رہی ہیں تو ایک نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ سرکار چلانے والوں کی نیتی اور جس طور

پر یہ چلا رہے ہیں یہ اس میں ناکام رہے اور ملک پر اس وقت کٹھنائی آ گئی ہے تو اس کا برابر کا سب کو حصہ لینا چاہیئے تھا۔ لیکن منسٹروں کے گھروں میں، وزیروں کے گھروں میں، سیکریٹریوں کے گھروں میں، ائرکنڈیشنز پر جتنی رقم خرچ ہو رہی ہے، منسٹروں کی تنخواہوں پر جو خرچ ہو رہا ہے، اور ان کو جو امینیٹیز Amenities مل رہی ہیں۔ اس کا جب لوگوں کو علم ہوتا ہے تو ان پر قیامت گزرتی ہے۔ ملک میں عام لوگوں کے لیے ڈیڑھ روپے روز خرچ کرنے کی طاقت نہیں۔ لیکن ملک میں یہ سفید ہاتھی پالنے کے لیے رقم خرچ کی جاتی ہے۔

مثالیں دی جاتی ہیں، امریکہ اور برطانیہ میں قیمتیں بڑھیں۔ یہ مثالیں اس وقت دی جاتی ہیں جب حکومت اپنی کسی بھول پر پردہ ڈالنا چاہتی ہو۔ امریکہ میں اور بہت سی غلط باتیں ہو رہی ہیں۔ اچھی باتیں ہو رہی ہیں، امریکہ اور برطانیہ کا کوئی پریزیڈنٹ اپوزیشن کو غیر ملکی جاسوسوں کی جماعت نہیں کہتا ہے جب کہ آپ کہتے ہیں۔ وہاں بھی آپ اس سٹینڈرڈ کو قائم رکھیں جو کہ دوسرے ملکوں میں ہے۔ لیکن اس کی نقل نہیں کرینگے۔ جب قیمتیں بڑھتی ہیں تو دوسرے ملکوں کا حوالہ دیتے ہیں اور اس کی سن کر یہاں کا مزدور سوچتا ہے کہ:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندے مزدور کی اوقات

یہ صحیح ہے کہ ڈیویپلنگ اکونامی میں قیمتیں بڑھینگی لیکن کیا وجہ ہے کہ قیمتوں کا دباؤ، ان کا بوجھ صرف ایک طبقہ پر ہی بڑھتا ہے اور وہ ہے فکسڈ انکم گروپ، جس کے پاس ذرائع نہیں ہیں۔ آپ نے کہا ہے رہزار کروڑ روپے کا کالا دھن ہے۔ آپ کو کس نے روکا ہے کہ آپ اس کو حاصل نہ کیجئے۔ لیکن ووٹ حاصل کرنے کے وقت آپ کہتے ہیں کہ غریبی ہٹائینگے اور بعد میں سب بھول

جاتے ہیں۔ میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ۱۹۷۶ء میں آپ یہاں ہوں گے ہی نہیں جس سے شکایت کی جائے۔ کیونکہ جیسے چیف جسٹس کی اپائیمینٹ کے معاملے میں، میسا (MISA) کے معاملے میں آپ نے انیائے کیا ہے اس کو تو لوگ گوارہ کر لینگے لیکن عام آدمی آپ کی بحث نہیں سمجھتا۔ وہ نہ اعداد وشمار سمجھتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ صبح سے شام تک زندگی گزارنا اس کے لیے مشکل ہوگیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ چار بچے پیدا نہ کیجئے۔ معلوم نہیں حضرت کے کتنے بچے ہیں، ہیں بھی یا نہیں۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایک بچہ جس کے پاس ہے کیا وہ آرام سے زندگی گزار سکتا ہے۔ کیا وہ جیون بتا سکتا ہے آرام سے۔ ایک بچے والوں کی بات کیجئے۔ یہ ہم لوگوں کی حالت ہوگی تو عام لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔ اس لیے آپ کو دوست کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ انقلاب آرہا ہے۔ دبے دبے قدموں سے پہلے آرہا تھا۔ اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ آنے والا ہے۔ اگر مجھے اس جماعت پر کوئی فیتھ ہوتا، اگر آپ کو صحیح طور پر ریپلیس کرنے کی طاقت رکھتا، تو میں بھگوان سے پرارتھنا کرتا کہ آپ جگہ خالی کیجئے۔ لیکن ابھی تو مانیہ اٹل بہاری واجپائی کی پارٹی اس خالی جگہ کو نہیں بھر سکتی۔ میں بھلا کر ہی کیا سکتا ہوں۔ اس لیے دیش کی مجبوری ہے کہ آپ ہی جیسے راکھشش کچھ دیر کے لیے اور رہیں۔ اس لیے کہ آپ نے یہ سمسیہ پیدا کی ہے۔ آپ اس سے بھاگ نہیں سکتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں جب بھاگیں گے تو اس وقت جنتا اپنے آپ فیصلہ کرے گی۔ کیونکہ آپ کے خلاف ہمیں مقدمہ چلانا ہے۔ بڑے بڑے ٹریبونل کے سامنے آپ کو پیش کرنا ہے کہ آپ نے ملک کا کیا ستیہ ناس کیا ہے۔ آپ یقین جانیئے کہ جنتا آپ سے انتقام لے گی اور بڑا سخت انتقام لے گی۔

۱۹۷۴ء

اطلاعات ونشریات

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

شری ایس ۔اے۔ شمیم: چیرمین صاحب اس میں کوئی شک نہیں کہ محکمہ انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ روز بروز ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے اور اس ضمن میں اس موجودہ ماحول میں سب سے زیادہ اثر نوجوانوں پر پڑتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ فلمیں اس کا ایک میڈیم ہے۔ لیکن جس طرح لوگوں نے یہاں کہا کہ گجرات اور بہار میں جو واقعات ہوئے ہیں وہ ان فلموں کا نتیجہ ہے، یہ بہت حد تک ایک مبالغہ آمیز بات ہے۔ ایک لحاظ سے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ دنیا کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ لیکن ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ فلموں کا ہمارے نوجوانوں پر اور نوجوان ہی کیوں ہمارے بزرگوں اور بوڑھوں پر بھی بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس لیے فلموں کو ایک پرائیوٹ سیکٹر کے ہاتھ میں دے کر اس پر کسی قسم کا کنٹرول عائد نہ کرنا ایک بہت بڑا خطرہ ہے جو اس ملک کو کسی قیمت پر اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں فلموں پر اور فلموں کے اخلاقی معیار پر نظر رکھنے کے لیے اس ملک میں ایک سنٹرل سینسر بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ لیکن اس کے

باوجود بھی اخلاقی معیار کے خلاف گندی قسم کی فلمیں بنتی ہیں تو یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ یہ ذمہ داری کس کے سر پر عائد کی جاسکتی ہے آپ میں سے بہت سے لوگوں نے فلم بوبی، کو ایک بار نہیں کئی بار دیکھا ہے۔

میں عرض کرر ہا تھا کہ فلموں پر نظر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ فلموں پر جو نظر رکھتے ہیں ان پر بھی نظر رکھی جائے۔ جو لوگ سینسر بورڈ کے ممبر ہیں وہ لوگ کس طرح سے فلموں میں یہ تمیز کرتے ہیں کہ فلاں فلم سینسر کی قینچی سے کٹنی چاہیے اور فلاں فلم کو اجازت دی جانی چاہیئے۔ میں نے بوبی کا ذکر اس لیے کیا کہ اس کے بارے میں اخبارات میں اور فلم انڈسٹری میں یہ شکایت عام پائی جاتی ہے کہ اس فلم کے اشتعال انگیز اور سنیشینل سین ہیں، اس میں راج کپور کے اپنے ذاتی اثر و دخل کا عمل ہے۔ صرف راج کپور جیسے فلم پروڈیوسر ہی اس قسم کی فلم کو سینسر بورڈ کی مداخلت سے بچا سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے مقابلے میں بہت سی معصوم اور بے ضرر فلموں کے اس سے کم سینیشنل سین رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ سینسر بورڈ کی نا قابلیت اور نا اہلیت کا ثبوت ہے کہ وہ اچھی قسم کی فلموں کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

دوسری بات: جس کی طرف سانگھی صاحب نے بھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ فلموں کے پروموشن سے جتنا فارن ایکسچینج ارن Earn کر سکتے تھے اتنا نہیں کیا۔ آج بڑے دنوں کے بعد امپیک کے جانے والے چیرمین جناب علی محمد طارق صاحب شکایت کرر ہے ہیں کہ حکومت کے بڑے بڑے عہدے دار منسٹری آف کامرس ایس۔ ٹی۔ سی اور منسٹری آف انفارمیشن کے بڑے بڑے افسران نے انہیں کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ علی محمد طارق صاحب بدقسمتی سے اس ریاست سے تعلق رکھتے ہیں جہاں پچھلے ۲۷ رسالوں میں بڑے بڑے

کھوٹے سکے بازار میں آکر اصلی سکے کے نام پر چلتے رہے۔ پورے سات سال علی محمد طارق خاموش رہے۔ پورے سات سال فلم پروڈیوسر نے علی محمد طارق کے خلاف الزام لگائے کہ انہوں نے اپنی ذاتی شہرت کے لیے، اپنے ذاتی فائدے کے لیے امپیک کا ستیہ ناس کر دیا۔ فلم پروڈیوسر میرے پاس آئے۔ منسٹر صاحب کے پاس گئے۔ پرائم منسٹر کو انہوں نے میمورنڈم دیا کہ تحقیقات کی جائے کہ علی محمد طارق نے جو امپیک کے چیرمین ہیں فارن ٹور پر کل کتنا روپیہ خرچ کیا اور اپنے آفس کی آرائش پر کتنا خرچ کیا۔ کون سی فلموں کا سودا تجارتی نکتۂ نظر سے کیا اور کون سی فلموں کا سودا ذاتی نکتۂ نظر سے کیا لیکن کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگی۔

لیکن آج گھر کا بھیدی لنکا ڈھا رہا ہے۔ علی محمد طارق صاحب سے کہا گیا کہ اب آپ چیرمین نہیں رہ سکتے ہیں تو انہوں نے سیریس چارجز لگائے ہیں۔ طارق صاحب کیا ہیں کیا نہیں ہیں۔ اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ تین جماعت پڑھے ہوئے آدمی ہیں۔ چوتھی جماعت میں وہ پاس نہیں ہو سکے لیکن ان کو آپ نے پانچ ہزار روپے تنخواہ دے کر امپیک کا چیرمین بنایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس ملک کی بدقسمتی کی وجہ سے وہ راجیہ سبھا اور لوک سبھا میں سدسیہ بن کر آئے لیکن جب وہ ہار گئے تو ان کی نوکری کا سوال آیا۔ نوکری کا جب سوال آیا تو اس ان پڑھ آدمی کو جس نے زندگی بھر صرف ایک تجارتی وینچر کیا ہے اور وہ یہ کہ ایک ہوٹل چلایا ہے، لیکن اس میں بھی گھاٹا ہوا۔ یہ ان کی سیاسی بیک گراؤنڈ ہے۔ اس کو آپ نے امپیک کا چیرمین بنایا۔ آج اس نے آپ کے منہ پر دو تھپڑ مارے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آپ فلموں کی سمگلنگ کے ذمہ دار ہیں۔ منسٹر آف انفارمیشن پر الزام لگایا گیا ہے۔ منسٹری آف کامرس پر الزام لگایا گیا ہے کہ جو فلموں کی سمگلنگ ہوتی ہے اس میں منسٹری انوالو ہے۔

علی محمد طارق کہیں یا کوئی اور کہے لیکن چونکہ امپیک کا چیرمین کہتا ہے اس لیے اس کی تحقیقات ضرور ہونی چاہئے۔ اس کے پہلے جب فلم پروڈیوسرز نے درخواست کی تھی کہ اس شخص کی کارگذاریوں کے خلاف تحقیقات کی جائے اس وقت آپ ٹال گئے چونکہ کانگریس کا وہ سدسیہ رہ چکا تھا، کیونکہ وہ آپ کے چہیتے تھے اور آج چونکہ اس نے بات کی ہے، ان کا کیس بھی مضبوط ہوگیا ہے اس لیے آپ کو چارہ نہیں ہے اس کی تحقیقات کیے بغیر۔ مجھے یقین ہے جب آپ تحقیقات کرینگے تو یہ آج جو کہہ رہا ہے، چور چور، آپ دیکھیں گے اس نے کیسا ستیاناس اس کا کیا ہے۔

تیسری بات: جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ٹی۔ وی کا جو میڈیم ہے وہ فلم کے بعد سب سے بڑا پاوَرفُل میڈیم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں گجرال صاحب کا شکریہ ادا کروں سرینگر کے ٹی۔ وی سینٹر کے پروگرامز کا یا مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا، اس لیے کہ جب تک سرینگر میں ٹی۔ وی سینٹر شروع نہیں ہوا تھا، جب وہاں ٹی۔ وی ٹاوَر تعمیر ہورہا تھا، وہ ٹی۔ وی ٹاوَر جب تعمیر ہوگیا اس کے پورے سترہ دن بعد دھڑام سے زمین پر گرگیا اس کے بعد پاکستان نے اپنے پروگرامز کو ریلے کرنا شروع کیا، چھ چھ گھنٹے کے بعد جب پاکستانی پروگرام ریلے ہونے شروع ہوئے تو منسٹر آف انفارمیشن کو خیال آیا کہ سرینگر ٹی۔ وی سینٹر کو زیادہ افیکٹیو بنانا چاہیے۔ میں اس ایوان کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان نے بہت بڑا آکرمن کیا ہے۔ کشمیر کی وادی پر، جموں میں اور وہ ہیں ٹی۔ وی پروگرام جو دن میں سات سات گھنٹے وادی اور جموں میں ریلے کیے جاتے ہیں۔ میں منسٹر صاحب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ پروگرام ہمارے پروگرامز کے مقابلے میں ٹیکنکلی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں

ان کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ وہ پروگرام بہت دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے جب تک ہمارے یہاں اپنے پروگرامز کی کوالٹی نہیں بنائی جاتی آپ پاکستانی ٹی۔ وی یا پاکستان کے آکرمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح امرتسر ٹی۔ وی نے پاکستان میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بہت حد تک پاکستان کے ٹی۔ وی نے کشمیر میں یہی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اس لیے سرینگر ٹی۔ وی کو زیادہ پاوٗر فل بنانا چاہیے۔

ایک بات اور عرض کرونگا۔ بہت سے دوستوں نے سنسکرتی کی بات کی ہے۔ تہذیب کی بات کی ہے اور روایات کی بات کی ہے۔ ٹی وی کا میڈیم جو ہے وہ گلمیر کا میڈیم ہے۔ سرینگر جیسی چھوٹی جگہ میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ ٹی وی سینٹر ہو یا ریڈیو اسٹیشن ہو وہ ہمارے کلچرل سینٹرز کا کام کرے۔ ان پر سبھی کی نگاہ ہوتی ہے۔ میں منسٹر صاحب کے نوٹس میں یہ بات لا چکا ہوں اور آج بھی لانا چاہتا ہوں کہ سرینگر ٹی وی سینٹر جو ہے وہ کورپشن کا بہت بڑا مرکز بن گیا ہے۔ سرینگر چھوٹی سی جگہ ہے۔ وہاں شہر میں جتنی اِل فیم ILL Fame کی لڑکیاں مل سکتی تھیں ان کو سلیکٹ کر کے ٹی وی سینٹر میں لایا گیا ہے۔ اخبارات میں چرچا ہوئی ہے کہ ٹی وی کے بڑے بڑے ادھیکاری ٹی وی کے بڑے بڑے افسروں کا ان بُری شہرت رکھنے والی لڑکیوں کے ساتھ سمبندھ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں ٹی وی اسٹیشن پر جانے سے ہچکچاتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹی وی سینٹر کے نام پر فاحشوں کے اڈے قائم نہ کیے جائیں کیونکہ اس سے نہ صرف منسٹری کی ریسپیکٹ کا سوال ہے بلکہ کلچرل سینٹرز کا تقدس اور عزت بھی وابستہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح سے ہندوستانی فلموں میں صرف اِل فیم کی لڑکیاں جاتی تھیں۔ ٹی۔ وی سینٹرز

میں بھی وہی ہوگا۔ اس لیے میں منسٹر صاحب سے گذراش کرونگا کہ وہ اپنے کان کھول کر سنیں اور جو بات ان کے نوٹس میں لائی جائے اسے مذاق میں نہ ٹالیں، اسے نظر انداز نہ کریں۔ کیونکہ ایک سرینگر ٹی وی سینٹر سے پوری سرکار کی عزت اور شہرت وابستہ ہے۔

آخر میں اس لحاظ سے کہ میں خود ایک پتر کار ہوں، ایک اخبار نویس ہوں میں یہ کہنا چاہتا ہوں، اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ چھوٹے اخبارات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ خیال کیسے رکھا جاتا ہے، کن معنوں میں رکھا جاتا ہے، مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ نہیں ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ چھوٹے اخبار بڑے اخبار کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ چھوٹے اخباروں کی ریڈرشپ مخصوص ایریا میں ہی ہوتی ہے لیکن وہ انٹینسو ہوتی ہے۔ آپ کے قومی اخبار جو انگریزی میں چھپنے والے بڑے بڑے اخبار ہیں ان کی پرسینٹیج ڈھائی پرسنٹ سے زیادہ نہیں۔ چھوٹے اخباروں کو زیادہ وائیبل بنانے کے لیے ان کو مستحکم بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اشتہارات کی تقسیم جو ہے وہ صرف مساوی نہ ہو بلکہ خاص طور پر ان کا خیال رکھا جائے کیونکہ یہی وہ اخبار ہیں جو دیہات میں پڑھے جاتے ہیں۔

آخر میں گذارش کرونگا کہ ٹی۔ وی کے بارے میں، میں نے جو کچھ کہا ہے اور امپیک کے سلسلے میں جو مطالبہ آج خود علی محمد طارق نے کیا ہے ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ اس بات کی کوشش کرینگے کہ اپنے خوبصورت چہرے سے، اپنی خوبصورت پیشانی سے یہ جو بدنما داغ ہیں ان کو دھوڈالیں جس کے لیے پوری قوم کی مدد ان کو حاضر ہے۔

مارچ ۱۹۷۴ء

دلی میں فرقہ دارانہ تناؤ

شری۔ شمیم احمد شمیم : سبھاپتی جی اس ملک کی اور اس ہاؤس کی بدقسمتی یہ ہے کہ ریل کا معاملہ ہو یا تیل کا معاملہ ہو، فسادات کا معاملہ ہو یا شبہات کا معاملہ ہو، ہم لوگ بہت کم پارٹی بازی سے اوپر آتے ہیں۔ اگر آج کا فساد اس ملک کا آخری فساد ہوتا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کہ چلو یہ اس ملک کا آخری فساد ہونا تھا۔ اگر اتنی بڑی قیمت دی تو کوئی بات نہیں۔ کم سے کم اس کے بعد تو اس ملک کی فضا، اس ملک کا ماحول سدھر جاتا۔ لیکن سخت بدقسمتی یہ ہے کہ فسادات کا یہ سلسلہ پچھلے ۲۴ سالوں سے جاری ہے اور آج اس فساد نے پھر ایک بار دل کو دہلا دیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ۱۰۰ آدمی مارے گئے اور ۱۰۰ مکان جلے بلکہ اس لیے کہ ابھی تو ہزاروں آدمیوں کو مرنا ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں مکانوں کو جلانا ہے۔ اس بات نے بے چین کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کی توجہ اس طرف دلانے کے لیے ہم نے اس ایوان میں بحث کا آغاز کر دیا ہے۔

میں نے واجپائی جی اور سنت جی کی تقریروں کو، حکمران ممبروں کی تقریروں کو بڑی دلچسپی سے سنا۔ واجپائی جی کی تقریر کے ایک بھی شبد سے مجھے اعتراض نہیں ہے، بڑی معصوم تقریر انہوں نے کی۔ واجپائی جی کی تقریر کے بعد میں اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ رہا تھا، کہ ملک کے ایک بہت بڑے نیتا، جن کے پیچھے ایک جماعت ہے، یہ وچار رکھتے ہیں، یہ خیال رکھتے ہیں تو پھر

اس قسم کی درگھٹنائیں کیوں ہوتی ہیں۔ واجپائی جی نے پوچھا، رنجیت سنگھ کی ماں نے اور یوسف کی ماں نے ہم سے یہ سوال کیا ہے کہ ان کے بیٹے کیوں مارے گئے۔ اگر اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوتا تو ہم سمجھتے کہ چونکہ اس کا کوئی جواب نہیں ہے اس لیے اس سوال کا جواب دینا ہمارا فرض بھی نہیں ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس سوال کا جواب موجود ہے۔ واجپائی جی بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں، آپ سب جانتے ہیں کہ کیوں وہ معصوم مارے جاتے ہیں، جن کی صرف یہ خطا ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک خاص گھرانے میں جنم لے کر ایک خاص کام اپنے اوپر لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دو رس پلانے والے آپس میں لڑ پڑے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سائیکل والے اور تھیلے والے ٹکرا گئے، اس وجہ سے خون خرابہ ہو گیا۔ فسادات کرانے پر سینکڑوں لوگوں کو پاگل بنانا پڑتا ہے۔ انہیں وائیلنیس، ظلم اور رشوت کی شراب پلانی پڑتی ہے اور اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اس ملک میں ابھی اس فضا کو ختم نہیں کیا ہے، جس میں وائیلنیس فرقہ وارانہ وائیلنیس خاص طور سے پرورش پاتی ہے۔ یہ تو ایک بہانہ ہے کہ حکومت نے کوتاہی کی ہے۔ حکومت سے غفلت ہوئی ہے، لاپرواہی ہوئی ہے۔ فسادات کو بروقت روکا جاتا تو شاید ۳۰ر آدمی نہ مرتے۔ پانچ یا دو آدمی مرتے۔ لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہم حکومت کو دوش دیتے ہیں اس کی نااہلیت، غفلت اور لاپرواہی کو دوش دیتے ہیں لیکن میں حکومت کو بددیانتی کا دوش نہیں دیتا۔ کیونکہ اس ساری درگھٹنا سے ملک کی شہرت پر دھبہ لگ چکا ہے اور سب سے زیادہ رسوا اس ملک کی حکومت ہوئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس حکومت میں ایسے حکام موجود ہیں، جو صرف اپنے دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے چہرے پر کالک مل لیں۔ اس ملک میں

اس حکومت میں، اس قانون کے تحت ایسے لوگ موجود ہیں جو فضا تیار کرتے ہیں۔ جس طرح کھیتی میں فساد کے بیج ڈال دیئے جاتے ہیں تو فساد کی پوری فصل تیار ہو جاتی ہے۔

واجپائی جی! آپ نے کہا ہے کہ مسجدوں اور مندروں کا غلط استعمال نہیں ہونا چاہئیے۔ کون کہتا ہے کہ ہونا چاہئے، آپ نے کہا ہے کہ ہندوستانی مرے ہیں اور اس ملک کے ماتھے پر کلنک لگا ہے۔ لیکن یہاں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم پارلیمنٹ میں ایک زبان بولتے ہیں اور جب ہمارے پاس مہذب audience ہوتے ہیں تو دوسری زبان استعمال کرتے ہیں۔ ہماری زبان میں بڑی معصومیت ہوتی ہے۔ میں اس کے لیے آپ کو دوش نہیں دیتا۔ لیکن کیا آپ اپنی پارٹی کے اخبار پڑھتے ہیں۔ کیا آپ کی پارٹی کا اخبار مدر لینڈ بھی یہی بات کہتا ہے؟۔ اس ملک میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ایک ہیں۔ کیا یہ اخبار ایسا کہتا ہے؟۔ مسجدوں اور مندروں کا غلط استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ کیا یہ اخبار ایسی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ میں باقاعدہ ان اخباروں کا مطالعہ کرتا ہوں اور اس لیے کرتا ہوں کہ زہر کی بنیاد کو جاننا چاہتا ہوں۔ یہاں سیٹھ صاحب موجود ہیں۔ انہوں نے بھی بڑی پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کیا سیٹھ صاحب اپنی پارٹی کے اخبارات پڑھتے ہیں۔ میں بھی ان کے اخبار پڑھتا ہوں۔ میں سیٹھ صاحب کو دوش نہیں دیتا ہوں۔ دوش اس حد تک دیتا ہوں کہ پارلیمنٹ میں خوبصورت بھاشن کرنے سے، معصوم باتیں کرنے سے یہ حکومت کے وکلا حکومت کی وکالت کرنے سے کیا اس فتنہ کو ختم کر سکتے ہیں، جس نے اس ملک کا بٹوارہ کیا اور جو آج بھی ہمارے دلوں کا بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہندو مرا، کون کہتا ہے کہ مسلمان مرا۔

میں نہیں جانتا کہ ان کا مذہب کیا تھا۔ لیکن اتنی بات جانتا ہوں کہ انہوں نے کوئی قصور نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ آپ نے رنجیت سنگھ کی بات کی، یوسف کی بات کی وہ تو مر گئے۔ ان پر فاتحہ پڑھ کر مطمئن ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ بچے جنہیں ابھی ماؤں سے جنم لینا ہے۔ جو ماؤں کی کوکھ میں پل رہے ہیں۔ اُن کو قتل کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں، اُن کو ملیا میٹ کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ اس کی فکر کر لیجئے۔ ہم اپنے بچوں کو کون سا مستقبل دیں۔ اس کی فکر کیجئے۔ یہ کہنے سے بات نہیں بنے گی کہ حکومت نے بروقت کارروائی کی، پولیس وہاں پر پہنچ گئی تھی اور اس کے بعد وردھی دل کا غلط الزام ہے۔ یہ بات ان لوگوں نے کی ہے جن کے لخت جگر اس فساد کی آگ میں جھلس گئے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ پولیس وہاں پہنچی یا نہیں پہنچی۔ آپ لوگ ائر کنڈیشن ایوان میں بیٹھ کر فیصلہ دیتے ہیں۔ آپ اپنے ضمیر کی عدالت کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھیں، کہیں کوتاہی ضرور ہوئی ہے، کہیں ضرور کوئی غفلت ہوئی ہے اور جو کچھ ہوا اس سے صرف یہ سبق حاصل کر لیجئے کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔ آپ نے بات کی یوسف کی، آپ نے بات کی رنجیت سنگھ کی۔ ایک بات ہم بھول جاتے ہیں ایک ماں کے چار بچوں کو دہکتی آگ میں جلایا گیا تھا۔ ہماری کوتاہی یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں کو، اپنی بزدلی کو، ہم اپنی غداری کو بھول جاتے ہیں۔ اگر ہر لمحہ ہمارے سامنے اس بے گناہ عورت کے معصوم بچے رہتے تو ہمارے ہاتھ سے کبھی ایسا حادثہ نہیں ہوتا۔ مجھے یہ واقعہ شریمتی سبھدرا جوشی جی نے بتلایا۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں جب اس دلی میں خاص طور سے فرقہ دارانہ فساد ہو رہے تھے تو وہ اور بہت سے لوگ گاندھی جی کے پاس گئے۔ ان سے کہا کہ گاندھی جی دلی کی حالت بہت خطرناک ہے۔

مسلمانوں پر سخت ظلم ہو رہے ہیں۔ مسلمان مارے جا رہے ہیں۔ تو گاندھی جی نے پوچھا اُن کو بچانے کے لیے کیا کر رہے ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ بہت کچھ کر رہے ہیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ بتاؤ مسلمانوں کو بچانے کے لیے کتنے ہندو مارے گئے۔ اب یہ سوال پوچھنے والا اس ملک میں کوئی نہیں رہا۔ اب یہ پارلیمنٹ ہے۔ یہاں پر ایک طرف الزام لگتے ہیں کہ اس نے حماقت کی، اس نے غداری کی اور دوسری طرف یہ الزام لگتے ہیں کہ قصور آپ کا ہے۔ گاندھی جی کی طرح یہاں پوچھنے والا کوئی نہیں ہے کہ تم جو پارلیمنٹ کے ائر کنڈیشنز ایوان میں تقریر کر رہے ہو، تم میں مسلمان کو بچانے کے لیے کتنے ہندو مرے اور ہندوؤں کو بچانے کے لیے کتنے مسلمان مرے۔ یہ سوال پوچھنے والا اب اس دیش میں کوئی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آخری فساد نہیں ہے۔ میں جس بات پر توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ فساد ہوا، اس کی اہمیت ہے۔ لیکن میں اس ایوان کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں ابھی اور فسادات ہونگے۔ اس لیے اس کی فکر کیجیے۔ اگر دیانتداری سے آپ محسوس کرتے ہیں، ہم نے، ہماری لیڈر شپ نے، ہمارے تعلیمی اداروں نے، ماس میڈیا نے، سیاسی جماعتوں نے جو ایک زبان آپ پارلیمنٹ میں بولتے ہیں اور ایک زبان سے محلے والوں کے جو جلسے ہوتے ہیں ان میں تقریر کرتے ہیں۔ ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم ایک دل اور ایک زبان سے جو محسوس کرتے ہیں اگر واقعی دیانت داری سے محسوس کرتے ہیں تو ہندو، مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو بجائے اس کے کہ سیکولرازم کا سہارا لیں، بجائے اس کے کہ ریاکاری سے کام لیں، یہ کہیں کہ نہیں، نہیں ہم اس دیش میں ایک ساتھ رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کا بڑا کرم ہوگا۔ اگر کھل کر آئیں اور کہیں کہ نہیں ہندو مسلمان اس دیش میں ایک ساتھ

نہیں رہ سکتے۔

بہت سی باتیں کہی گئیں، بنگلہ دیش کی اور امریکہ کی، جس طرح سے کچھ لوگ ریل کی درگھٹنا کو روکنے کے لیے غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے مسئلے کو ایک پہلو دیتے ہیں اسی طرح کچھ لوگ اصل واقعہ سے توجہ ہٹانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی، ایران کی اور پاکستان کی، ریل تیل سے ان کا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ اس وقت سوال ہے کہ اس ملک میں ہر سال اگر سینکڑوں اموات ہوتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ابھی تک ایک قاتل کو بھی پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھایا گیا۔ جس نے ایک بے گناہ انسان کا گلا کاٹا۔ کیونکہ جب ایسے قاتل کو معلوم ہوگا کہ اس کا ہر عمل جیل ہی نہیں، پھانسی کے تختے پر اس کو لٹکائے گا تبھی اس کے دل میں خوف پیدا ہوگا۔ اگر ایک آدمی کسی کا قتل کرتا ہے تو اس کو آپ پھانسی کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن جب سو آدمی مل کر ایک ہزار قتل کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انکوائری کمیشن اپنی رپورٹ سبمٹ (submit) کر رہا ہے۔ انصاف اور قانون کے یہ تقاضے جو ہیں وہ یقیناً اس ملک کے لیے نیک فال کا حساب نہیں رکھتے ہیں۔ ہمیں سوچنا ہوگا اور کھل کر سوچنا ہوگا کہ ہم فرقہ پرست طاقتوں کو روکنے کے لیے ان کے اثر کو کیسے زائل کریں۔ (گھنٹی بجنے پر) دس منٹ کی تقریر کے لیے میں نے ساڑھے تین گھنٹے کی تقریریں سنی ہیں۔ میں دو منٹ اور چاہتا ہوں۔

میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں اس ملک کی لیڈر شپ بحیثیت مجموعی یہ فیصلہ کرے کہ ہمیں فرقہ پرست جماعتوں کو نہیں بلکہ دلوں میں پرورش پانے والی فرقہ پرستی کو ختم کرنا ہے۔ ابھی واجپائی جی نے مذاق میں ششی بھوشن جی سے کہا تھا آپ تو کانگریسی جن سنگھی ہیں۔ ششی بھوشن جی کے سیکولرازم پر

مجھے بڑا وشواش ہے...... لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس جماعت میں بھی آپ کی طرح سوچنے والے موجود ہیں۔ ہمیں اس ملک کی سیاست کو اخلاقی بنیادوں پر قائم کرنا ہوگا۔ جب اس ملک میں گاندھی جی جیسا کوئی آدمی یہ پوچھے، بتاؤ فسادات روکنے کے لیے کیا کچھ کیا تو نے۔ کچھ ایسے بھی مولوی اور پنڈت ہیں اس ملک میں جو فسادات کی مبالغہ آمیز لذیز کہانیاں سنا سنا کر لہو گرم کرتے ہیں۔ میں نے ایسے مولوی صاحب کو سنا جو فرضی کہانیاں سنا سنا کر لہو گرماتے ہیں۔ وہ جو کہانیاں سناتے ہیں ان کہانیوں کو سنانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اخبارات زہر پھیلاتے ہیں اور ہمارے اندر کمار گجرال صاحب کہتے ہیں کہ میں بالکل غیر جانب دار ہوں۔ فرقہ دارانہ زہر پھیلانے والے اخبارات کو میں اشتہار دیتا ہوں اور سیکولرازم پھیلانے والے اخبارات کو بھی اشتہار دیتا ہوں۔ ہماری داد دو کہ میں کتنا غیر جانبدار ہوں۔ ہمیں اس ملک کی راہ مقرر کرنی ہے کہ اسے گاندھی جی کے راستے پر چلنا ہے یا گوڈسے کے راستے پر چلنا ہے۔ اس لیے آج جو ہوا ہے اس لیے ہوا ہے کہ ہم نے احمد آباد کی حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ ہم نے جل گاؤں، بھیونڈی، رانچی کی حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ششی بھوشن جی نے کہا اس دیش میں اقلیتیں محفوظ ہیں۔ کسی حد تک میں ان سے متفق ہوں۔ اس ملک میں ۵۵ ر کروڑ کی آبادی میں ۵۰ کروڑ ہندو ہیں۔ یہاں اگر ۵ کروڑ مسلمان زندہ ہیں تو اس لیے زندہ ہیں کہ ۵۰ کروڑ ہندوؤں کی نیت ٹھیک ہے، ان کا کردار ٹھیک ہے، لیکن کالے کوے کہاں نہیں ہوتے؟ وہ مسلمانوں میں بھی ہیں اور ہندوؤں میں بھی۔ ان غنڈوں کا جیسا شیخ صاحب نے کہا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ انہوں نے اکبر کی طرح اپنا ایک مذہب ایجاد کیا ہے۔ اس مذہب کا مطالعہ کیجیے وہ اگر ان

کے اپنے مفاد کی چیز ہے تو وہ یک بیک جن سنگھی ، کانگریسی اور کمیونسٹ کہلاتے ہیں ۔ آپ غنڈوں کے مذہب کا مطالعہ کر کے غنڈوں کے خلاف یلغار کیجئے ۔ وہ کسی مذہب کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے ۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ایک گینگ کا لیڈر رام دین ہے تو دوسرے کا اللہ رکھا ۔ جس وقت انہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا اس وقت وہ نہ ہندو رہتے ہیں اور نہ مسلمان ۔

میرا آخری جملہ یہ ہے کہ جب تک یہ ہاؤس اپنے قول وفعل میں جو کچھ وہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں اس میں ہم آہنگی نہ کرے ہماری لچک دار تقریروں سے کچھ نہیں ہوگا ۔ ہوم منسٹر صاحب آپ کی قابلیت اپنی جگہ مسلم ہے ، لیکن جو کچھ ہوا اس کے لیے بھگوان کے یہاں آپ کا حساب و کتاب ہوگا ۔ لیکن جو کچھ ہونے والا ہے اس کی فکر کیجئے ۔

مئی ۱۹۷۴ء

قیمتوں میں اضافہ

سرکار کی بے حسی

شری ایس۔اے۔شمیم : میں وزیرخزانہ کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں میں کچھ بھی غصّے میں کہنے نہیں جارہا ہوں اور اپوزیشن ممبروں کی طرف سے کیے گئے مطالبے کی حمایت بھی میں نہیں کررہا ہوں کہ آپ حکومت چھوڑ کر بن باس لے لیجئے۔میری درخواست یہ ہے کہ غلط ملط جیسا بھی آپ چلائے اپوزیشن میں اس بھاؤ کو اُٹھانے کا سلیقہ نہیں ہے۔ ہاچ پاچ اپوزیشن میں کوئی ایسی قدر مشترک بھی نہیں ہے کہ یہ آپ کو نکال کر آپ کی جگہ سنبھال سکیں۔اس لیے میری بات کو آپ دھیان سے سنیں۔ میں آپ کی گدی چھیننا نہیں چاہتا ہوں لیکن آپ کی بنیادیں جو ہل رہی ہیں، ان کو آپ مضبوط کریں۔سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارا ملک جس ایک خطرناک بحران اور کرائیسس سے گزر رہا ہے اس کا صحیح طور پر حکمراں جماعت کو احساس نہیں ہے۔اس کی وجہ سے آپ کو بھی اور ہمیں بھی پریشانی ہونی چاہیئے۔جب آگ لگ جائے تو کچھ لوگ اس کی توجیہہ کریں، کوشش کریں جسٹی فائی کرنے کی کہ یہ آگ کیوں لگی اور اس کے بعد بے نیاز ہو کر اس کو برداشت کریں تو عام لوگوں کا وشواش اس سسٹم سے اٹھ جاتا ہے، جس کو آپ ڈیموکریسی کہتے ہیں۔کل پرائم منسٹر نے اتنے دنوں کے بعد یہ کہا کہ ملک واقعی خطرناک خطرے سے دوچار ہے اور یہ

خطرہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا جارہا ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے۔ یہ احساس ہونے کے باوجود حکمران جماعت سے وابستہ ممبر یا وزیروں کے لائف اسٹائل میں کیا آپ کوئی فرق دیکھتے ہیں؟ طرزِ زندگی میں، رہائش کے طریقوں میں کوئی فرق آپ کو دکھائی دیتا ہے، تاکہ عام جنتا بھی یہ محسوس کرے کہ اس پر بھی مصیبت آپڑی ہے اور اُسے برداشت کرنا چاہئے؟ عام جنتا کو یہ پتہ چلے کہ حکمرانوں کو اُس کی تکلیفوں کا، مصیبتوں کا احساس ہے۔ آپ کا ائرکنڈیشینگ کا خرچہ، موٹر کا خرچہ وغیرہ سب خرچے تو ویسے ہی چل رہے ہیں لیکن مختلف سٹیٹس (States) میں حکمران جماعت جس قسم کے ڈرامے کھیل رہی ہے، وہاں جارہے ہیں، لاکھوں روپیہ خرچ ہورہا ہے، برباد ہورہا ہے اس سب سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو یہ احساس نہیں ہے کہ ہم ایک خطرناک دور میں سے گزر رہے ہیں۔ میری شکایت ہے کہ ایک بازاری ڈاکٹر کی طرح ہر بیماری کا ایک ہی کارن بتادیا جاتا ہے کہ بنگلہ دیش کی وجہ سے قیمتیں بڑھی ہیں۔ وہ بڑھی ہونگی اور بھی اس کے کارن ہونگے جن میں سے کچھ جائز کارن بھی ہیں۔ بنگلہ دیش بھی جائز کارن ہے۔ لیکن کیا آپ نے ملک کو کانفیڈنس میں لیا ہے اور اس کو بتایا ہے کہ ہر چیز مہیا کرنے کے باوجود بنگلہ دیش میں اس ملک کے خلاف ایک زبردست جذبہ کام کررہا ہے۔ وہاں اس ملک کے خلاف ایک خطرناک پروپگنڈا ہورہا ہے؟ اخبارات پڑھنے کا مجھے موقعہ ملا ہے اور یہ ایک سچائی ہے کہ اتنی بڑی قربانی دینے کے باوجود بنگلہ دیش کے لوگ آج ہم سے خوش نہیں ہیں۔ کیا قصہ ہے، کیا آپ نے ملک کو کانفینڈنس میں لیا ہے؟ اتنا بڑا اکال ہے لیکن آپ ۹۵ / ہزار جنگی قیدیوں کو پال رہے ہیں۔ آپ میں آج بھی ہمت نہیں ہے کہ آپ

اعتراف کریں اس بات کا کہ دو سال سے آپ ۹۵/ ہزار آدمیوں پر جو خرچ کر رہے ہیں وہ ملک کی بھوکی جنتا پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پرزنرز آف وار کیا کوئی انڈے دینے جا رہے ہیں اور آپ ان انڈوں سے ملک کی غریب جنتا کا پیٹ بھرینگے ؟ ہماری پالیسیاں فیل نہیں ہوئی ہیں ، میں سمجھتا ہوں کہ ان پالیسیوں کو امپلیمنٹ کرنے والی جو مشینری ہے اس نے ہمیں فیل کیا ہے۔

میں جہاں سے آتا ہوں وہاں کی بات میں آپکے سامنے رکھتا ہوں۔ یہاں ایک چیز کے دام ایک روپیہ بڑھ جاتے ہیں تو میری ریاست میں جسے جموں و کشمیر کی بدقسمت ریاست کہا جاتا ہے ، دام دس روپے بڑھتے ہیں ، جموں تک ایک کائنات ہے ، ایک دنیا ہے ، لیکن جموں سے آگے سری نگر کی طرف جائیں ، تو دوسرے حالات نظر آتے ہیں۔ حکومت کی سوچ میں ، اس کے اندازِ فکر میں ، کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ سرینگر میں ہر سال نہ جانے کتنی کانفرنسیں ہوتی ہیں ، جن پر کم سے کم ۲۷/ لاکھ روپے خرچ ہوا ہوگا اور یہ کانفرنسیں ہر سال سرینگر میں کیوں ہوتی ہیں؟ گرمی سے دور بھاگنے کے لیے ، عشرت کرنے کے لیے ، سرینگر کی ٹھنڈی ہواؤں میں کانفرنس ہونی چاہیئے کیونکہ وزیروں ، اور ان کے عزیزوں ، افسروں کو دلی میں گرمی ستاتی ہے۔ اس طرح کے خرچ میں کمی کرنے کے لیے بھی حکومت نے ملک کو تیار نہیں کیا ہے۔

قلت کی بات میں مان سکتا ہوں لیکن جب چیزیں ہی مہیا نہ ہوں ، تو حکومت کے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ انفلیشن ہے ، روپیہ ہے ، لیکن کاغذی روپیہ کا کیا کیا جائے جب کہ چیزیں ہی مہیا نہیں ہیں؟ کشمیر میں کوکنگ گیس نہیں ملتی ہے۔ وہاں کوکنگ گیس صرف بازاروں ، کانگریسی حکمرانوں یا ان کے رشتہ داروں کو ہی ملتی ہے۔ پیٹرول ملک میں ہے اس کے

دام بھی بڑھا دیئے گئے ہیں۔ لیکن سرینگر کو پچھلے مہینے ایک ہفتہ بغیر پیٹرول کے رہنا پڑا۔ کیروسین غریب کی ضرورت ہے لیکن وہ بھی نہیں ملتا ہے۔ بنگلہ دیش اور پاور کرائیسس کا کیا تعلق ہے؟ حکومت کے جنریٹر اور اچھے اچھے کار خانے فیل ہو رہے ہیں۔ اس سے بنگلہ دیش کا کیا تعلق ہے؟

ہم نہیں کہتے کہ کانگریس پارٹی حکومت چھوڑ دے۔ ایک تو وہ ویسے ہی حکومت کو نہیں چھوڑے گی، کیونکہ اس کا چسکا بہت سخت ہوتا ہے، دوسرے جس مصیبت میں اس نے ملک کو لا کر کھڑا کیا ہے، اس میں کس کی ہمت ہے کہ یہ بوجھ سنبھالے۔؟ خاص طور سے ہمارے یہاں ایسی اپوزیشن ہے، جس نے ابھی یہ فیصلہ ہی نہیں کیا ہے کہ اس کی آلٹرنیٹو فلاسفی کیا ہوگی۔ میرے دوست شری پیلو مودی اس وقت یہاں نہیں ہیں انہوں نے پرائم منسٹر سے کہا تھا کہ اگر آپ حکومت نہیں کر سکتیں تو مجھے اقتدار دے دیا جائے۔ خدا بچائے، اگر اقتدار ان کی طرف چلنا شروع کرے تو ہمارے جن سنگھی دوست ان کی تِکا بوٹی کر کے رکھ دینگے اور اگر جن سنگھ کے پاس پاور جائے گی تو سوتنتر پارٹی کے سارے ڈیل ڈول والے لوگ اُس پر اُمنڈ پڑیں گے اور اس ملک میں ایسی خانہ جنگی ہوگی جو آج تک نہیں ہوئی ہے۔

اس سنکٹ کا یہ علاج نہیں ہے کہ کانگریس پارٹی حکومت کو چھوڑ دے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ یا آپ کے صاحبزادے کو کیو میں کھڑا ہونے کے باوجود تین دن بعد بھی چیز نہ ملے تو کیا کیا جائے؟ ایک اخبار میں ایک اچھا کارٹون بنا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ اب فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں ہے، اب تو پانچ کے بجائے دس بچے ہونے چاہئیں۔ ایک بچہ ایک کیو میں کھڑا ہوگا، دوسرا بچہ دوسری کیو میں کھڑا ہوگا اور اس طرح کم سے کم ایک ہفتے کا راشن تو

آ جائے گا۔ حکومت نے اپنی لاپرواہی کی وجہ سے ملک کو ایک بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ ہم نے جمہوریت کا راستہ اپنایا ہے تا کہ ملک میں خونی انقلاب نہ ہو۔ میں چیتاونی دیتا ہوں کہ آپ عوام سے اتنی دور ہٹ گئے ہیں کہ آپ کو معلوم نہیں ہے، لاوا اُبل رہا ہے اگر وہ لاوا صرف آپ کو ڈبوتا تو ایک جشن منانے کی ضرورت تھی لیکن وہ لاوا ہم سب کو ڈبو دے گا۔ اس لیے جب ہم آپ کو بچانے کی فکر کر رہے ہیں تو دراصل ہم اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر رہے ہیں۔

مئی ۱۹۷۴ء

"سیلاب کی تجارت"

شری۔ایس۔اے۔شمیم: (سرینگر)

اس کالنگ اٹینشن کا مقصد حکومت سے ان حالات کے بارے میں تمام اطلاعات فراہم کرنا تھا جو حالیہ سیلاب میں تمام ملک میں بالعموم اور ریاست جموں وکشمیر میں بالخصوص پیدا ہوئے ہیں۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ منسٹر صاحب کے جواب میں وہ اطلاعات بھی نہیں ہیں جو عام طور پر اخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر بھروسہ افواہوں پر کیا گیا ہے۔زبانی بات چیت پر کیا گیا ہے اور ریاستی حکومت سے تفصیلی اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی ہے۔اس بات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ پرائیوٹ طور پر میں نے اس سلسلے میں اس سے کہیں زیادہ اطلاعات فراہم کی ہیں جتنی جناب منسٹر صاحب نے ایوان کے سامنے دی ہیں۔مثلاً اس سلسلے میں دیکھنے کی بات جو تھی وہ یہ تھی کہ کس قدر نقصان ہوا ہے۔سڑکوں کا نقصان ہوا ہے، مکانات کا نقصان ہوا ہے اور فصلوں کا نقصان ہوا ہے کتنا نقصان ہوا ہے۔لیکن اس بیان کے پڑھنے سے کہیں بھی اس بات کی اطلاع نہیں ملتی ہے کہ نقصان کا کیا اندازہ ہے۔بلکہ اس میں غلط بات کہی گئی ہے کہ سب سے زیادہ نقصان اننت ناگ میں ہوا ہے اور بارہمولہ کو بھی

اس میں شامل کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقصان سب سے زیادہ اننت ناگ اور سرینگر کا ہوا ہے اور خوش قسمتی سے بارہمولہ کا علاقہ محفوظ رہا۔ منسٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کتنا رقبہ کتنی کلٹیوٹیڈ لینڈ سیلاب کے نیچے آگئی ہے اور اس سے کتنی تعداد میں فصل کو نقصان ہوا ہے۔ میں ان کی اطلاع میں اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ دس ہزار ایکٹرز مین سیلاب کے نیچے آئی ہے اور اس میں ۸۰ فیصدی اریگیٹیڈ لینڈ ہے اس کو نقصان پہنچا ہے اور تمام سٹینڈنگ کراپس ختم ہوگئی ہیں۔ تباہ ہوگئی ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ ۱۹۰۳ء کے بعد یہ سب سے خطرناک سیلاب تھا اور اس سے جتنا نقصان ہوا ہے آج تک اتنا نقصان نہیں ہوا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ بیان میں یہ بھی نہیں کہا گیا کہ اس سے کتنے گاؤں زیرِ آب آگئے ہیں جموں کشمیر میں۔ میں ان کی جانکاری میں اضافہ کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ خبر اخبارات میں چھپی ہے اور چیف منسٹر نے بھی ایک اخباری کانفرنس میں کہا ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ گاؤں پانی کے نیچے آگئے ہیں۔ منسٹر کے بیان کے مطابق ابھی تک صرف ۶۴ جانوں کا نقصان ہوا ہے لیکن میری اور اخبارات کی اطلاع کے مطابق وہاں تعداد ۸۰ تک پہنچ چکی ہے۔ ریاست کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ سیلاب آنے سے پہلے پورے چار دن بارش ہوتی رہی۔ حکومت کو اس بات کی اطلاع مل چکی تھی اور اس کا یہ اندازہ بھی تھا کہ یہ خطرناک باڑھ ہوگی۔ اس کے باوجود بھی ۸۰ لائیوز کا لاسٹ ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ باڑھ کو روکنے کے لیے جو اقدامات ہونے چاہئیں تھے نہیں ہوئے۔ خطرے سے لوگوں کو بچانے کے لیے کوئی توجہ یا دلچسپی نہیں دکھائی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق جو اخباری کانفرنس

میں بتایا گیا ہے، بارہ ہزار مکانات کونقصان پہنچا ہے اور پچاس ہزار خاندان اس وقت تک بے گھر ہو گئے ہیں۔ جن کے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کچھ نقصان کا اندازہ بھی نہیں کیا گیا لیکن سرکاری اطلاعات کے مطابق اور میری اطلاع کے مطابق فصلوں اور مکانات کو پانچ کروڑ کا نقصان ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں جو سیلاب آیا تھا وہ جولائی میں آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس بار آئی باڑھ کا مقابلہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ چونکہ اس بار اگست میں سیلاب آیا ہے اور تمام لوگ جو سیلاب کی زد میں آئے ہیں ان کے پاس خوراک کا ذخیرہ پہلے ہی ختم ہو گیا اور اب آئندہ چھ مہینوں تک کے لیے ان کے پاس خوراک کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ایک زبردست خطرہ پیدا ہو گیا ہے ان علاقوں میں۔ آپ نے یہ نہیں بتلایا کہ آپ اس خطرے کا کیسے مقابلہ کرنے جا رہے ہیں۔ منسٹر صاحب نے وہاں کی حکومت کی کوششوں کی سراہنا کی ہے۔ میں ان کی اطلاع میں اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ سیلاب سے کہیں زیادہ نقصان ہوتا ہے، اگر فوج اور عام لوگ مل کر سیلاب کے خطرے کو روکنے کے لیے ہمت اور حوصلے سے کام نہیں لیتے۔ سرکاری مشینری نے کس طرح سیلاب کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور مصیبت زدہ لوگوں کو سہایتا پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے متعلق میں کچھ تھوڑا سا اخبار ''نیوڈیو'' جو اگست کا ہے اس میں پڑھ کر آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس میں بھی سیاست کو رواں رکھا گیا ہے جہاں کہ ایم۔ ایل۔ اے تھے یا منسٹر تھے وہاں ریسکیو ٹیمز کو فوراً رش کیا گیا، سپلائز کو رش کیا گیا۔ اس طرح حکومت کی تعریف کر کے منسٹر صاحب کا جو مقصد تھا وہ تو پورا ہو گیا لیکن سیلاب کے خطرے کو کم کرنے کے

لیے حکومت کی مشینری سے زیادہ یقیناً عام لوگوں نے کام کیا۔ جن کی تعریف میں منسٹر صاحب نے کچھ نہیں کہا ہے۔ آرمی نے تو بہت شاندار کام کیا ہے۔ اس کو میں تسلیم کرتا ہوں۔ خوراک کی ریاست میں پہلے ہی سے کمی تھی تمام ایفیکٹیڈ ایریاز میں جہاں لوگوں کو پہلے سبسڈائزڈ ریٹس پر راشن مل رہا تھا اب ان کے پاس پرچیزنگ کیپسٹی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ ختم ہو چکی ہے۔ وہ سبسڈائزڈ ریٹس پر بھی چاول یا گیہوں نہیں خرید سکتے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان کے لیے کیا کیا جا رہا ہے۔ دیش کو ہر سال سیلاب کا خطرہ پیدا رہتا ہے۔ فلڈ پروٹیکشن ورکس کا خرچہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فلڈ پروٹیکشن ورکس جو ہوتے ہیں وہ کارگر ثابت نہیں ہوتے ہیں۔ ان میں اروجن (Erosion) ہوا ہے یا جو فنڈز الاٹ ہوئے تھے وہ صحیح استعمال نہیں ہوئے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے بارے میں آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔

نقصان کا اندازہ میں نے بتا دیا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ریاست کی طرف سے حکومت کے پاس ریلیف کی کوئی درخواست آئی ہے یا نہیں۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے نقصان کو پورا کرنے کے لیے مرکزی سرکار کی طرف سے ریلیف کے واسطے کتنا روپیہ دیا جا رہا ہے۔

سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ جہاں پانچ کروڑ کا نقصان ہوا ہے وہاں وزیراعظم نے اپنے ریلیف فنڈ میں سے صرف ایک لاکھ رقم دی ہے۔ غالباً وزیراعظم کو معلوم نہیں ہے کہ اس دور میں ایک لاکھ کی قیمت ایک ہزار رہ گئی ہے۔ پانچ کروڑ کا نقصان ہوا ہے اور ایک لاکھ روپیہ دیا جانا افسوناک ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کے پاس خطرے کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔

جموں کے علاقے میں سیلاب کی وجہ سے کروڑوں روپیہ کی لکڑی پاکستان بہہ کر چلی گئی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کا اندازہ کیا ہے کہ کتنی لکڑی پاکستان بہہ کر چلی گئی ہے اور پاکستان سے اس لکڑی کو وصول کرنے کے لیے کوئی اگریمنٹ، کوئی انڈرسٹیڈنگ یا کوئی بات چیت ہو رہی ہے یا نہیں۔؟

فلڈ پروٹیکشن کی کون سی سکیمیں آپ کے پاس ہیں، کوریل کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مختلف علاقوں میں جہاں بارشوں کا خطرہ رہتا ہے وارننگ مشینری استعمال کرنی چاہیئے اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یقیناً جموں کے علاقے میں ۸۰ آدمی نہیں مارے جاتے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں ان علاقوں میں جہاں فوری طور پر سیلاب آنے کا خطرہ رہتا ہے کون کون سے اقدام کیے گئے ہیں اور وارننگ مشینری کو استعمال کرنے کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔

اگست ۱۹۷۳ء

صدارتی خطبے پر شکریہ کی تحریک

احساسِ ذمہ داری کا فقدان

چیرمین صاحب! پارلیمنٹ میں میرا جو تجربہ رہا ہے اس کی بناء پر مجھے یہ احساس ہورہا ہے کہ پارلیمنٹ کا انسٹی ٹیوشن، پارلیمنٹری سسٹم اور پارلیمنٹری طریقہ کار اس ملک میں رفتہ رفتہ اروبلیوینٹ بنتا جارہا ہے۔ میرا یہ احساس راشٹر پتی کا ایڈریس سننے کے بعد اور زیادہ مضبوط ہوگیا۔ کل جب نئے دور کے مہاتما ڈاکٹر کرن سنگھ یہاں تقریر کررہے تھے موریلٹی، سپیر چولزم (Spiritualism) اور ویلیوز پر تو میرا یہ وشواس اور زیادہ مضبوط ہوگیا کہ اس ملک کی جنتا سے پارلیمنٹ کا تعلق اس کا رشتہ کٹتا جارہا ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ ایک ناٹک کرتے ہیں۔ سرکاری دل ایک بات کہتا ہے اور اپوزیشن اس کا درودھ کرتی ہے اور اپوزیشن کوئی بات کہتی ہے تو سرکار کو اس کو مخالفت کرنی چاہیئے۔ یہ ہمارا رول رہا ہے۔ اب لوگوں کا اعتقاد رفتہ رفتہ پارلیمنٹری سسٹم پر سے اٹھتا جارہا ہے۔

یہاں پر اکثر یہ بات کہی گئی کہ گجرات میں جو کچھ ہوا یا اس وقت ملک میں اہنسا کا جو دور چل رہا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ کچھ اینٹی سوشل ایلمینٹ اس سچویشن کو ایکسپلائیٹ کررہے ہیں۔

یہ جاننے کی بات ہے کہ کیوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ قانون توڑ کر

گولیاں کھانے کے لیے آتے ہیں۔ کرفیو توڑتے ہیں۔ فوج کا مقابلہ کرتے عیں۔ اس کا کارن کیا ہے۔ یہ کوئی شوق کی بات نہیں ہے۔ تماشہ کرنے کی بات نہیں ہے اور جب نوجوان ہمارے پارلیمنٹری سسٹم پر وشواس کھو کر اس کے بعد سینہ تان کر گولیاں کھانے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو اس کو آپ اپوزیشن کا کارنامہ کہہ کر اپوزیشن کو کریڈیٹ دے رہے ہیں۔ جس کام کا اہل اپوزیشن نہیں ہو آپ اس کو وہ تمغہ دے رہے ہیں۔ اگر واقعی اس ملک میں اپوزیشن آج اتنی سٹرونگ ہے کہ وہ گجرات میں ایک خاموش نہیں طوفانی انقلاب پیدا کر سکتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر تو کانگریس کو یہاں سے اٹھ کر چلے جانا چاہیے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان میں کانگریسی بھی ہیں۔ بدقسمتی سے ان کا پارلیمنٹری انسٹیٹیوشن سے وشواس اٹھتا جا رہا ہے۔ اس میں دوش کس کا ہے۔ میں دوش صرف حکمران جماعت کو نہیں دینا چاہتا۔ میں اس بات کو کہنا چاہتا ہوں کہ جمہوریت کی قدرون کو پامال کرنے کے لیے پارلیمنٹری انسٹیٹیوشن پر وشواس ختم کرنے کے لیے اگر سرکاری جماعت ملزم ہے تو اپوزیشن بھی برابر ملزم ہے۔ ہم سب نے مل کر اتنے بڑے انسٹیٹیوشن کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج سب سے زیادہ contempt کا مرکز جو ہے وہ لیجسلیٹر ہے۔ پارلیمنٹرین ہے، چاہیے وہ اپوزیشن کو بلانگ کرتا ہے، چاہیے سرکاری جماعت کو۔ لیکن یہ کہنے کے بعد یہ بات بہت ضروری ہو جاتی ہے کہ اس میں سب سے زیادہ دوش کس کا ہے۔ سب سے زیادہ گالی کس کو ملنی چاہیے سب سے زیادہ سزا کس کو ملنی چاہیے۔ ۲۷ رسال اس ملک میں کی حکومت آپ کے ہاتھ میں رہی۔ آج اگر گجرات کے لوگوں کا لاوا اتنے زور سے ابلنے لگا، آج اگر مہاراشٹر میں بے چینی ہے، تو سوال ہے کہ

اس کا دوش کس کو جائے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ بھاکڑا ہم نے بنایا۔ بوکارو ہم نے بنایا، اس ملک میں ہم نے اتنی ترقی کی اس کے لیے آپ داد چاہتے ہیں۔ تالیاں چاہتے ہیں۔ لیکن ہر بات کے لیے تالی مل سکتی ہے تو اور جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے اہنسا ہو رہی ہے۔ بھکمری ہے، اس کے لیے آپ کو گالی بھی ضرور ملنی چاہیئے۔ آپ یہ کہہ نہیں سکتے کہ میٹھا میٹھا ہڑپ، اس کے لیے تالی بجاؤ۔ لیکن اگر کوئی برا کام ہو رہا ہے تو وہ اپوزیشن کے سر پر تھوپیں۔

سب سے بڑی بات ویلیوز کی ہے۔ سب سے زیادہ باتیں اس معاملے میں ڈاکٹر کرن سنگھ نے کہیں۔ ویلیوز کی باتیں ہیں۔ گاندھی جی اس ملک میں تھے، جواہر لال نہرو اس ملک میں تھے، اس ملک میں کورپشن اس وقت بھی تھی بھوک اس وقت بھی تھی، اس ملک میں بے کاری اس وقت بھی تھی لیکن ایک وشواس تھا کہ گاندھی جی ایک آئیڈیل ہیں۔ جواہر لال جی ایک آئیڈیل ہیں۔ یہ کوئی ایسا سمجھوتا نہیں کر سکتے یا کوئی ایسی کاروائی نہیں کر سکتے، جس سے جنتا کا وشواس ختم ہو جائے۔ لیکن اب سب سے بڑی بات جو ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ لوگ اس ملک پر حکومت کر رہے ہیں وہ ۲۷ برسوں سے کر رہے ہیں۔ اس بدقسمت ملک کے ایوان پر۔ آپ ہمارے آئیڈیل نہیں ہیں۔ آپ کی کوتاہیوں کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ الگ ایک بات ہے، اس وقت ملک میں اکنومک سفیر (sphare) میں بڑی گھمبیر سچویشن ہے یہ گھبرانے کی ضرور بات ہے۔ ملک میں اس وقت بے چینی ہے۔ یہ گھبرانے کی ضرور بات ہے۔ لیکن سب سے زیادہ خطرہ جو اس وقت ہے، سب سے بڑی مشکل جو اس وقت ہے وہ یہ ہے کہ ان حالات کو پیدا کرنے میں حکمران جماعت اور اپوزیشن مل کر ایک ماحول تیار کر رہی ہیں جس میں سب سے زیادہ فائدہ اس

ملک کے فرقہ دارانہ کمیونل ایلیمینٹس کو ہو رہا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست مسلم لیگ کے محمد کویا نے، مسلم لیگ کے قائد اعظم شری سلیمان سیٹھ یہاں نہیں ہیں۔ وہ یہاں ہوتے تو میں ذرا کھل کر بات کرتا کہ حکمران جماعت کی ناکامیوں سے فائدہ اٹھا کر اس ملک میں ایک بار پھر ۱۹۴۵ اور ۱۹۴۷ء کا سا ایٹموسفیر پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ محمد کویا صاحب نے کل کہا کہ وہ مسلم کمیونٹی کو ریپریذنٹ کرتے ہیں اور صرف وہ یہ حق رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی باتوں کو کہیں۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں نے محمد کویا کو یہ حق دیا ہوتا تو آج مسلمانوں کا اس ملک میں وجود بھی نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کا سات کروڑ کی تعداد میں یہاں رہنا اس بات کی ضمانت ہے کہ انہوں نے وشواس کیا ہے اس ملک کی اکثریتی جماعت پر، اس ملک کے ہندوؤں پر، ان سیکولر عناصر پر، جنہوں نے ۱۹۴۷ کے خونی ڈرامے میں بھی کہا کہ چاہے پاکستان اپنا ملک اسلامی آدھار پر بنائے لیکن ہندوستان سیکولر ارادے پر قائم رہے گا۔ اور ہندوستان کو سیکولر آئین دیا۔ اس وقت مسلم لیگ کے یہ قائد اعظم جو آج سبز پرچم لے کر مراد آباد، حیدر آباد اور یو پی میں پھر رہے ہیں، اس وقت ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ مجھے یو پی کے حالیہ انتخابات میں کچھ علاقوں کا دورہ کرنے کا موقعہ ملا۔ لوگوں نے برائی کی سرکار کی کہ انہوں نے شوسینا کے ساتھ سمجھوتا کیا ہے۔ لیکن میں الزام لگاتا ہوں میرا چارج ہے اس سرکار پر کہ اس ملک میں اس حکومت نے کیرل میں مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتا کر کے اس ملک کی ایکتا کو، سیکولر فورسز کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شری سلیمان سیٹھ کی آج یہ ہمت پڑی، انہیں آج یہ حوصلہ ہوا کہ وہ اپنا منصوبہ ریلیز کرتے وقت یہ کہیں کہ ہم سیکولر

ہیں۔ہم محترم ہیں اس لیے کہ ہم نے کانگریس کے ساتھ سمجھوتا کیا ہے۔ مجھے ان کی سیاست سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن I Think he has a point۔ان تمام طاقتوں کو میں چلینج کرتا ہوں ان پر الزام لگاتا ہوں کہ انہوں نے اس قسم کی جماعت کو مہان ساہتیا دی۔اس کے ساتھ ناجائز سمجھوتا کر کے مسلم کمیونزم کو Respectability بخشی۔نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے یو۔پی میں وہ تقریریں کیں وہ زہریلی تقریریں کیں کہ مجھے حیرت نہیں ہے اگر انتخابات کا یہ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد یو۔پی میں فرقہ دارانہ تناؤ پہلے سے زیادہ بڑھ جائے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اقتصادیات میں آپ ڈراوٹھ (drought) کا سہارا لے سکتے ہیں۔آپ یہ سہارا لے سکتے ہیں کہ ساری دنیا میں گلوبل پر اسکیٹو اکنومک کا بڑا خراب ہے۔میں آپ کو شک کا فائدہ دے کر رہا کرونگا، میں آپ کو معافی دونگا۔لیکن آپ مجھے یہ بتایئے کہ مسلم لیگ اور شوسینا کے ساتھ کانگریس (o) کے ساتھ سمجھوتا کرنے میں کون سی قیامت تھی، کون سی مجبوری تھی، یہی تھی کہ آپ ایک اسٹیٹ میں حکومت نہیں بنا سکتے۔کیا کانگریس جس کے پیشوا گاندھی جی رہے ہیں، جس کے پیشوا مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو رہے ہیں صرف ایک سٹیٹ میں پاور میں رہنے کے لیے ان قاتلوں کے ساتھ سمجھوتا کرتے جنہوں نے ملک کا بٹوارہ کیا ہے۔مسلم لیگی لیڈر رہیں یا جن سنگھی دوست۔یہ دونوں اس ملک کے بٹوارے کے ذمہ دار ہیں۔آپ ان میں سے ایک کو بُرا کہتے ہیں اور دوسرے کو گلے سے لگاتے ہیں۔آپ قاتلوں کے ساتھ سمجھوتا کرتے ہیں۔جن کے ہاتھوں سے خون کی بو آتی ہے اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج یو۔پی میں خون پینے والے یہی خون

بہانے والے سبز پرچم لے کر مسلمانوں کو بہکانے کے لئے جاتے ہیں کہ ہم تمہاری آواز کو پارلیمینٹ میں اٹھائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سسٹم قابل قبول نہیں جہاں اس قسم کے زہر پھیلانے والے پارلیمنٹ کے ممبر بن کر پارلیمنٹ کے فورم کو استعمال کریں اور یہ کہیں کہ ہم اس ملک میں تمہاری آواز اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں مسلمان ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اگر فرقہ دارانہ فساد ہوں تو مجھ سے میری آئیڈیولوجی پوچھے بغیر میرا قتل ہوسکتا ہے، لیکن یہ ذاتی معاملہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو سٹیجوں پر چڑھ کر ہاتھ میں قرآن اور سبز پرچم لے کر مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ ہندو تمہارا دشمن ہے ہندو کو ووٹ مت دو۔ میری جن سنگھ سے بہت پرانی لڑائی ہے۔ یہ بڑے موذی لوگ ہیں۔ موذی کا مطلب ہے بڑے ظالم، لیکن اگر ان موذیوں کو سہائتا ملی ہے تو وہ پرووائیڈ کی ہے شری سلیمان سیٹھ نے مسلم لیگ کے نئے قائد اعظم شری سلیمان سیٹھ نے جنہوں نے مسلمانوں کی لاشوں کا سودا کر کے یوپی میں چند انتخابی سیٹیں جیتنے کے لئے مسلمانوں کو کہا کہ تم سبز پرچم کو ووٹ دو۔ آج اردو کا رونا رونے والے سلیمان سیٹھ کو میں چلینج کرتا ہوں......

شری ابراہیم سلیمان سیٹھ: آپ کس کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

شری ایس اے شمیم: میں ترجمانی کر رہا ہوں ان بے زبان مسلمانوں کی جن کو آپ نے سبز پرچم دکھا کر یہ بتلایا کہ ہم تمہاری نجات چاہنے والے ہیں۔ آپ یہ بھول گئے کہ وہی مسلم لیگ جس نے پاکستان بنایا.........

شری ابراہیم سیٹھ سلیمان: یہ وہ مسلم لیگ نہیں ہے میں ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، یہ گمراہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

شری ایس اے شمیم: اگر یہ وہ مسلم لیگ نہیں ہے۔.........

شری ابراہیم سیٹھ سلیمان: میں کہہ سکتا ہوں کون سی مسلم لیگ ہے۔ آپ کیا جانتے ہیں۔آپ اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔آپ کس کی نمائیندگی کرتے ہیں۔

شری ایس۔اے۔شمیم: میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ شری سلیمان سیٹھ کے کہنے سے میں یہ بات نہیں مانتا۔

MR. CHAIRMAN:I request you, Mr Sulaiman Sait,not to interrupt him your party member had a chance.Please do not interrput him now.Let us keep order in the House.You will get the chance and when your turn comes,you may say what you want to say.Till then,you don't interrput him,Please keep the order in the House.

Shri S.A.Shamim: Shri Sulaiman Sait had one month's chance to poison the entire atmosphere in U.P.

اس پانچ منٹ کی سپیچ میں وہ پوائزن دور نہیں ہوسکتا ہے لیکن بات کہنے کی اجازت ہونی چاہیئے اور چونکہ آپ یہاں موجود ہیں اس لیے میں آپ سے پوچھتا ہوں، میں نے آپ کی تقریروں کو پڑھا ہے۔آپ نے کہا ہے کہ یہاں مسلمانوں نے ہندوؤں کو سبق سکھلایا ہے۔آپ کے بنات والا نے کانپور میں تقریر کرتے ہوئے کہا مسز اندرا گاندھی اس لیے یہاں موجود ہیں کہ مسلمان اس ملک میں موجود ہیں۔ورنہ وہ بھی فیروز گاندھی کے ساتھ ستی ہو

گئی ہوتیں۔آپ نے مسلمانوں کے سینٹیمینٹس (Sentiments) کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔مسلمانوں کا خون کرنے کے لیے میدان ہموار کیا ہے۔یو پی میں انہوں نے کچھ کہا ہے وہ کسی سے چھپا نہیں ہے۔آپ چونکہ یہاں آ گئے اس لیے مجھے کچھ باتیں کرنی پڑیں۔آپ مسلمانوں کی لیڈری کا دعوی کرتے ہیں،آپ کے سپیکر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے ہم بولیں گے پوری پارلیمنٹ میں ڈھائی ممبر ہوں،اور سات کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دم بھرتے ہوں۔یاد رکھو یو۔پی میں تمہاری ضمانتیں ضبط ہو جائینگی۔آر۔ایس۔ایس۔کو میں گوارا کر سکتا ہوں۔اس لیے کر سکتا ہوں ہندو جن سنگھ کی ایک آئیڈیولوجی ہے۔وہ اس ملک میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔تم کس کا راج چاہتے ہو۔کیا چرن سنگھ کا راج قائم کرنا چاہتے ہو۔اگر تم جیت بھی جاؤ۔یو۔پی میں تمہارے اور امیدوار جیت جائیں۔لیکن تم کو پھر بھی اکثریت نہیں ملے گی۔جب تک کہ تم کو دوسروں کا اعتماد حاصل نہیں کرتے۔ہم اس ملک میں تب تک زندہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ سیکولرزم کو سرنڈر نہ کر دیں۔جب تک ہندوؤں کا اعتماد حاصل نہ کریں۔آپ کانگریس کا ساتھ نہ دیں۔لیکن ملک میں اور بھی سیکولر جماعتیں ہیں جن کا ساتھ دے سکتے ہیں۔مسلمانوں کو کمیونل پلیٹ فارم پر جمع کرنا مسلمانوں کے لیے خطرہ پیدا کرنا ہے۔میں جذبات کی رو میں بہہ کر یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں۔اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے یو پی میں بڑا ہولناک نظارہ دیکھا ہے۔۱۹۴۶ء میں اس ملک کا بٹوارا کروانے والی جماعت کے لیڈران نے مسلمانوں سے کہا کہ ہندوؤں پر وشواش نہیں کیا جا سکتا۔قرآن کی آیتوں کے ساتھ جلسے شروع ہوتے۔سبز پرچم لہرایا جاتا اور کہا جاتا کہ پتہ نہیں یہاں پر پارلیمنٹری سسٹم کیسے قائم ہے۔

میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔اکثر مثالیں دی جاتیں ہیں کہ دنیا کے ممالکوں میں مہنگائی بڑھی ہے۔ دنیا کے ممالکوں میں کورپشن ہے۔ مثال انگلینڈ کی دی جاتی ہےاور امریکہ کی دی جاتی ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان مثالوں کو یہاں تک کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ان ممالکوں میں کچھ پارلیمانی قدریں ہیں۔ پارلیمانی روائیتیں ہیں۔جن کا وہ پالن کرتے ہیں۔ابھی حال ہی میں گریٹ برٹین میں سٹرائیک ہوئی تھی۔ بڑا ماینر ایشو تھا۔ یہاں تو روز ہی سٹرائیکیں ہوتی ہیں۔لیکن وہاں صرف اس ایشو کے لیے وطن کی گورنمنٹ نے ریزائن کر دیا اور کہا کہ الیکشن ہوں گے۔لیکن آپ تو یہاں پوری گدی کے مالک ہیں۔اس کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ گجرات میں ایسی ستیتھی پیدا ہوئی ہے۔وہاں سرکار کو کہا گیا کہ جاؤ، مہنگائی کے لیے ہمارے لیے برٹین کی مثالیں لاتے ہو، امریکہ کی مثالیں دیتے ہو تو ان کی طرح روائیتیں کیوں قائم نہیں کرتے تاکہ لوگوں میں وشواس ہو جائے کہ یہ حکمران گدی پر قابض ہونے کے لیے کین (Keen) نہیں ہیں۔آپ نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی قیمت پر حکومت نہیں چھوڑینگے۔اگر آج آپ نے مسلم لیگ کو گلے لگایا ہے، ایک سانپ کو گلے لگایا ہے تو کل معلوم نہیں کس جانور کو گلے لگائینگے اور مجھے خطرہ ہے کہ ایک دن ان موذیوں کو بھی گلے لگائیں گے۔ کچھ قدروں کا پالن کرو، خدا کے لیے، انصاف کے لیے ان قدروں کا پالن کرو۔شکریہ

فروری ۱۹۷۴ء

ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ

۲۶ / مارچ ۱۹۷۱ء کو جب بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں نے بنگالیوں کے جذبۂ آزادی اور ان کے ذوقِ بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنے اسلحہ خانوں کے دہانے کھول دیئے تو سب سے پہلے ہندوستانی پارلیمنٹ نے ظلم و تشدّد اور نسل کشی کی اس مذموم کاروائی کے خلاف احتجاج کیا۔ یحییٰ خان کی فرعونیت اور ٹیکا خان کی چنگیزیت کے خلاف پارلیمنٹ کے جن ممبروں نے اپنی دھواں دھار تقاریر کے ذریعے شدید غم و غصے کا اظہار کیا، ان میں یہ خاکسار بھی شامل تھا۔ میں جانتا تھا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی کے خلاف نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنے والے بہت سے لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں ہے ، اور وہ دراصل بنگالیوں سے ہمدردی کے پردے میں پاکستان کے تباہ ہونے پر خوش ہو رہے ہیں لیکن بنگلہ دیش میں پاکستانی افواج کے مظالم کی داستانیں اس درجہ ہولناک تھیں کہ کوئی باضمیر ، دیانت دار اور ذی شعور انسان ان پر افسوس اور احتجاج کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ بنگال میں پاکستانی حکومت ظلم و تشدد پر آنسو بہانے والوں میں کچھ مگر مچھ بھی شامل ہیں پارلیمنٹ کے اندر اور باہر یحییٰ خان کی فوجی آمریت کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ جوں جوں پاکستانی فوجوں کی بربریت اور بہیمیت بڑھتی گئی ، میرے احتجاج کی لے بھی بلند ہوتی گئی۔ دلی

میں سرکاری اہتمام سے منعقد کیے گئے اور اخبار نویسوں کے ایک سیمنار میں تقریر کرتے ہوئے میں نے ہندوستانی مسلمانوں سے یہ شکوہ کیا کہ اُنہوں نے بنگلہ دیش کی تحریک آزادی سے اس درجہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جتنا انہیں کرنا چاہیے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو نے میری اس تقریر کو خوب اُچھالا، اور اخبارات نے خصوصی طور پر اس کا ذکر کیا۔ پھر سری نگر میں بنگلہ دیش پر ایک سیمنار منعقد ہوا، جس کی صدارت ریاست کے گورنر بھگوان سہائے نے کی۔ اس میں میرے علاوہ ڈاکٹر آغا اشرف علی، دینا ناتھ نادمؔ اور سید میر قاسم نے تقریریں کیں۔ تقریب کے اختتام پر گورنر سہائے اور سید میر قاسم دونوں نے مجھے مبارکباد دی کہ میری تقریر سب سے بہتر تھی۔ مسٹر سہائے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں نے بنگلہ دیش کے موضوع پر اتنی عمدہ تقریر پہلی بار سُنی ہے۔ ریڈیو کشمیر کئی دن تک میری اس تقریر کا ریکارڈ بجاتا رہا۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ بنگلہ دیش کے سوال پر میرے موقف سے میرے حلقہ انتخاب یعنی سری نگر کے عوام بالخصوص اور کشمیری عوام بالعموم مجھ سے خوش نہ تھے۔ بہت سے دوستوں اور دشمنوں نے کھل کر اپنی ناراضگی اور بیزاری کا اظہار بھی کیا۔ لیکن ہر شخص کی زندگی میں بعض ایسے لمحات آجاتے ہیں کہ جب وہ مصلحت کی سطح سے بلند ہوکر حق بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چاہے ایسا کرتے ہوئے اس کی اپنی عافیت ہی خطرے میں کیوں نہ پڑ جائے۔ یہ میرے ضمیر کی پاکیزگی اور میری اخلاقی جرأت کا امتحان تھا اور میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میں اس امتحان میں کامیاب رہا۔ انسانی ہمدردی اور اخلاقی تقاضوں کے علاوہ مجھے بنگلہ دیش کی تحریک آزادی سے اس لیے بھی دلچسپی تھی کہ اس سے مجھے کشمیر میں جمہوریت کی بحالی اور اندرونی خود مختاری کا مطالبہ کرنے کا ایک مضبوط سیاسی

اور اخلاقی جواز مل گیا تھا۔ بنگلہ دیش پر تقریر کرتے ہوئے کئی بار میں نے ہندوستانی لیڈروں کو یاد دلایا کہ وہ مشرقی بنگال میں جمہوریت کے قتل پر آنسو بہاتے وقت یہ نہ بھولیں کہ کشمیر میں پچھلے پچیس برسوں سے جمہوریت اور بُنیادی حقوق کا قتلِ عام ہورہا ہے۔ حکمران جماعت کے اکثر لیڈروں کو میری یہ ''یاددہانی'' ناگوار گزرتی تھی۔ لیکن بحیثیت مجموعی بنگلہ دیش کے متعلق چونکہ میرے اور ان کے مؤقف میں مکمل ہم آہنگی تھی اس لیے عام طور پر میری تقریروں کو اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے خوب اُچھالا گیا۔ ۳/دسمبر کو جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی اور ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا، تو ایک محبّ وطن ہندوستانی کی طرح میں بھی اس جنگ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ ۴/دسمبر کو جب پارلیمنٹ میں ہنگامی حالات کا اعلان کرنے والے صدر کے فرمان پر بحث ہو رہی تھی تو وزیر اعظم شریمتی گاندھی نے خصوصی طور پر مجھے پیغام بھیجا کہ میں بھی تقریر کروں۔ میں نے ان کا پیغام ملنے سے پہلے ہی سپیکر کو اپنا نام بھیج دیا اور پارٹی لیڈروں کی تقریروں کے بعد جب میرا نام پکارا گیا تو میں نے ایک بڑی زوردار تقریر کی۔ میرے ایک ایک جملے پر بڑے زور کی تالیاں بجیں، اور تقریر کے اختتام پر بہت سے وزیروں اور سرکردہ لیڈروں نے مجھے مبارکباد دی۔ میں نے اپنی تقریر کے آغاز میں وزیر اعظم سے مخاطب ہو کر کہا کہ مجھے، میرے حلقۂ انتخاب اور میری ریاست کو آپ سے اور آپ کی حکومت سے ایک نہیں، ایک ہزار شکایات ہیں۔ لیکن اس وقت جب کہ ملک کی سالمیت، عزت اور آبرو پر دشمن نے حملہ کیا ہے میں ان تمام شکایات کو بھول گیا ہوں، اور مجھے صرف ایک ہی بات یاد ہے اور وہ ہے ہندوستان کی عزت، اور اس

عزت کو بچانے کے لیے آپ جو بھی قدم اٹھائیں گی، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔
پارلیمنٹ میں اس تقریر کے بعد میں سب کی نظروں میں چڑھ گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میری عزت، میرے رتبے اور میرے قد و قامت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ میرا نام کئی سلیکٹ کمیٹیوں میں آ گیا، اور مجھے کئی بار ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر انٹرویو دینے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ۱۶ر دسمبر کو جب پاکستان نے ہتھیار ڈال دئے تو ملک بھر میں خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا، اور پارلیمنٹ میں بھی اس موقع پر خاصا ہنگامہ ہوا، میں اس روز ایوان میں موجود نہ تھا۔ پھر چند دن بعد لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبروں نے وزیر اعظم کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جس میں مخالف جماعت کے لیڈروں نے مسز گاندھی کی قیادت کو سراہتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ جن سنگھ اور سوتنتر، کمیونسٹ اور ڈی۔ ایم۔ کے، سبھی جماعتوں کے لیڈروں نے شریمتی گاندھی کی شان میں قصیدے پڑھے، اور آخر میں میرا نام پکارا گیا، میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مسز گاندھی سے شدید سیاسی اختلاف کے باوجود اس دن میں نے خلوص دل سے ان کی تعریف کی۔ ان کی قابلیت، دور اندیشی اور صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو سراہا۔ میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے صرف تاریخ ہی نہیں بنائی ہے، ایک نیا جغرافیہ بھی وضع کیا ہے۔ اخبار نویسوں اور ممبران پارلیمنٹ نے میری اس تقریر کی اتنی تعریف کی کہ میں خود اپنی خطابت سے مرعوب ہو گیا۔ مقربین خاص کے ذریعے معلوم ہوا کہ ملکہ اندرا بھی میری تقریر پر بہت خوش ہیں۔ میں نے اپنی تقریروں میں جو کچھ کہا تھا کسی کو خوش یا ناراض کرنے کے لیے نہیں، اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے

کہا تھا۔ ان خیالات کے اظہار پر نہ مجھے اس وقت کوئی شرمندگی تھی، اور نہ اب کوئی ندامت ہے۔ اگر خدانخواستہ ملک کو پھر ایسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے تو "پاکستانی ایجنٹ" کہلانے جانے کے باوجود میں وہی کروں گا اور کہوں گا جو اس سے پہلے کر اور کہہ چکا ہوں۔

اندرا جی کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد میں نے اپنی تقریر کا خاتمہ ان الفاظ کے ساتھ کیا تھا۔ "آج جب کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بندی کا اعلان ہو گیا ہے ایک اور جنگ بندی کا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔ حزب مخالف کی طرف سے آپ کے اور ہمارے درمیان جو جنگ بندی کا معاہدہ طے ہوا تھا، وہ آج سے ختم ہے، اور آج کے بعد سے ہم آپ کی مخالفت میں ایک بار پھر کمر بستہ ہیں۔" دسمبر کی جنگ کے بعد جب اس سال مارچ میں پارلیمنٹ کا بجٹ اجلاس شروع ہو گیا، تو میں نے ۲۲ر مارچ کو عام بجٹ بحث میں حصہ لیتے ہوئے وہ تقریر کی کہ جس کی مفصل روداد آپ اس اخبار کی ۱۵ر جون والی اشاعت میں پڑھ چکے ہیں۔ اس تقریر پر پارلیمنٹ میں بڑے زور کا ہنگامہ ہوا۔ کانگریسی وفاداروں نے چلا چلا کر میری آواز کو دبانا چاہا، میری تقریروں پر زور زور سے تالیاں بجانے والے آج میرا گلا دبانے پر آمادہ نظر آتے تھے اور میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں کشمیر کے لیے جمہوریت اور انصاف کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ایک دوسرے ملک میں جمہوریت بحال کرنے کی غرض سے ہماری فوجیں ایک عالمی جنگ کا خطرہ مول لے سکتی ہیں تو اسی ملک کے ایک حصے میں جمہوریت بحال کیوں نہیں کی جاتی۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران یہ ناگفتنی بات بھی کہہ دی کہ اگر کشمیر میں جمہوریت بحال نہیں کی جاتی تو میں یہ سمجھوں گا کہ بنگلہ دیش میں جمہوری

اقتدار سے آپ کی دل چسپی محض ایک فراڈ تھی۔ میری زبان سے یہ "گالی" سن کر کانگریسی محبانِ وطن اس درجہ سیخ پا ہو گئے کہ انہوں نے میری تقریر کو ایوان کی کاروائی سے حذف کرنے کا مطالبہ کیا۔ ہندوستانی جمہوریت کا نازک آبگینہ میرے ایک کنکر پھینکنے سے چور چور ہو گیا تھا اور میری اس تقریر کے بعد کانگریسی ممبران پارلیمنٹ اور اراکین حکومت کا رویہ میرے تئیں یکلخت بدل گیا۔ مجھے آنکھوں پر بٹھانے والے مجھ سے آنکھیں چرانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے میں دوست سے دشمن اور برہمن سے اچھوت بن گیا۔ چوبیس برس تک کشمیری ممبران پارلیمنٹ کی مدح سنتے سنتے ہندوستانی حکمران کشمیر کے متعلق کوئی سچی بات سننے کی صلاحیت کھو چکے ہیں اور اب جب چوبیس برس بعد یہ بندۂ گستاخ کبھی کبھی حق بات کہنے کی جسارت کرتا ہے تو پارلیمنٹ کے در و دیوار ہلنے لگ جاتے ہیں۔ میری اس معصوم تقریر نے کانگریسی گناہ گاروں کی معصیت کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا۔ ایک دن پارلیمانی امور کے نائب وزیر میری طرف سے گزرے تو میں نے مذاقاً کہا "اب کی بار میں کسی سلیکٹ کمیٹی کا ممبر نامزد نہیں ہوا؟" تو انہوں نے بڑی صفائی کے ساتھ کہا کہ "آپ نے بجٹ پر اپنی تقریر سے یہ حق کھو دیا ہے۔ وزیر موصوف کے ایک جملے سے میری نظروں میں ہندوستانی جمہوریت کا کھوکھلا پن اور واضح ہو گیا۔

۳۱ مئی کا پارلیمنٹ کا بجٹ اجلاس ختم ہونے سے دو دن پہلے میں نے اسپیکر سے یہ شکایت کی کہ محکمۂ سراغ رسانی کا عملہ میری اور میرے گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔ میرے ہاں آنے جانے والوں اور مجھ سے ملنے والوں کو تنگ کیا جا رہا ہے، اور اس طرح مجھے اپنی پارلیمانی ذمہ داریاں نبھانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرے پاس مرکزی محکمۂ سراغ رسانی کے

خلاف یہ الزام ثابت کرنے کے لیے کافی شہادت اور ثبوت موجود ہے اور پارلیمنٹ میں حزب مخالف کے سبھی لیڈروں نے میری شکایت کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ لیکن ارباب حکومت مسکراتے رہے اور بات ٹل گئی۔

پھر اسی دن شام ''پوسٹروں کے معاملے'' پر بجٹ کے دوران میں نے وہ تقریر کی کہ جس نے مجھے ''ہندوستانی ایجنٹ'' سے پاکستانی ایجنٹ بنا دیا۔

اصل بات کہنے سے پہلے میں نے قدرے تفصیل کے ساتھ اس کا پس منظر پیش کیا ہے۔ ان بظاہر بے ربط اور غیر متعلق واقعات کے بیان سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کانگریسی لیڈروں اور ممبران پارلیمنٹ کے ذہنوں میں سیکولرازم اور جمہوریت کی صحیح تعریف کیا ہے اور وہ مسلمانوں سے کس قسم کی وفاداری اور حبُ الوطنی کی توقع رکھتے ہیں۔ محمد شفیع قریشی دس سال تک پاکستان نواز پولیٹکل کانفرنس کے نائب صدر رہے اور پاکستان کا نمک کھاتے رہے پھر ایک دن ان کو یکلخت ہندوستان سے عشق ہوگیا اس عشق کے صلے میں انہیں نائب وزیر بنا دیا گیا۔ اپنی نائب وزیری کے تحفظ کے لیے وہ حکومت کے ہر ناجائز قدم کی حمایت کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک اندرا جی کا قصیدہ پڑھتے ہیں اور جن سنگھیوں سے زیادہ کشمیری عوام کے جذبات اور ان کی امنگوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ اس لیے وہ کانگریسیوں کی لغت میں سب سے بڑے محبّ وطن اور قوم پرست قرار پاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان سے میری وابستگی کچھ اصولوں اور آدرشوں کی بنیاد ہے اور میں مصلحتاً نہیں اعتقاداً جمہوریت اور سیکولرازم پر یقین رکھتا ہوں اور جب کبھی ان اصولوں کے ساتھ انصافی ہوتی ہے۔ تو میں احتجاج کرتا ہوں اور ایسا کرتے ہوئے چونکہ میں کبھی کبھی کانگریس اور اندرا جی کی شان میں گستاخی کر جاتا ہوں، اس لیے میں

کانگریسیوں کی نظر میں ناپسندیدہ ہی نہیں، گردن زدنی قرار پایا ہوں۔ میں بنگہ دیش میں جمہوریت کا مطالبہ کروں تو قوم پرست اور کشمیر میں جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کروں تو پاکستانی ایجنٹ۔ میں پاکستان کی مخالفت میں تقریر کروں تو ترقی پسند اور عوام دوست کہلاؤں۔ کشمیری عوام سے انصاف کا مطالبہ کروں، تو فراڈ اور غدار......اور دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ صرف میرا نہیں، ہندوستانی مسلمانوں کا بالعموم اور کشمیری مسلمانوں کا بالخصوص المیہ ہے۔ انہیں ہر لیڈر قومی دھارے میں شامل ہونے کی نصیحت کرتا ہے۔ ملکی مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی اپیل کرتا ہے اور اپنے ملک کے تیئں وفادار رہنے کا درس دیتا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ قومی دھارے، ملکی مزاج اور وفاداری کی تعریف کے معنی یہ متعین ہوئے ہیں کہ مسلمان حکومت کا، حکمران جماعت کا اور وزیر اعظم کا تابعدار، فرمانبردار اور اطاعت شعار بنے۔ وہ حکومت کی ہر پالیسی کی تائید کرلے، وقت بے وقت پاکستان کو گالی دے اور مسلمانوں کے مفادات کی کبھی بات نہ کرے۔ جب تک مسلمان اس معیار پر پورا اترتا ہے وہ ملک کا وفادار ہے۔ وہ نائب وزیر، وزیر، نائب صدر، صدر سب کچھ بن سکتا ہے لیکن اگر وہ حکمران جماعت کا مخالف ہے یا وزیر اعظم کی شان میں قصیدے نہیں پڑھتا تو وہ نہ صرف یہ کہ وفادار نہیں بلکہ پاکستانی ایجنٹ ہے اور مسلمان کو پاکستانی ایجنٹ قرار دینا اس ملک میں سب سے آسان سیاسی مشغلہ ہے۔

میں اپنا ایک اور ذاتی تجربہ بیان کر کے اس مضمون کو ختم کروں گا اور اگلی اشاعت میں اپنی وہ ساری تقریر شائع کروں گا کہ جس کی پاداش میں مجھے ششی بھوشن جیسے ترقی پسند کانگریسی نے بھی پاکستانی ایجنٹ قرار دیا۔
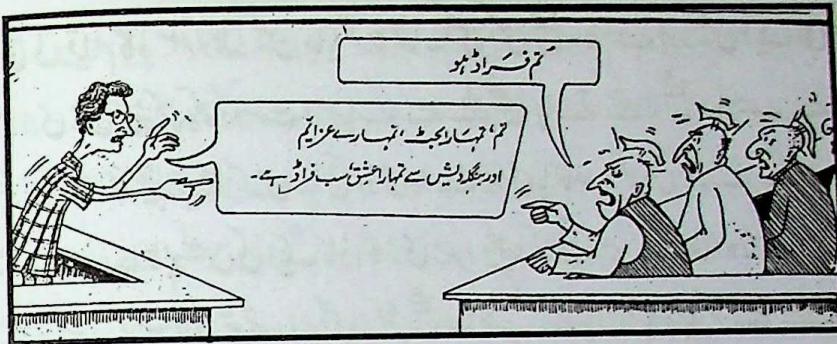
میں دلی میں اپنے قیام کے دوران ہر شام شیخ صاحب سے ملنے کے لیے

ان کی قیام گاہ ۳ر کوٹلہ لین جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی شیخ صاحب اور میں ایک ہی گاڑی میں بیٹھ کر کچھ دوست واحباب سے ملنے بھی جاتے تھے۔ شیخ صاحب سے اس قربت کا نتیجہ یہ نکلا کہ سی۔ آئی، ڈی والے میری باقاعدہ نگرانی کرنے لگے اور میں جہاں جاتا پولیس کی ایک کالی گاڑی میرا پیچھا کرتی۔ میرے علاوہ راجیہ سبھا میں کشمیر کے ممبر لالہ تیرتھ رام بھی اکثر شیخ صاحب کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ لالہ صاحب نے کئی بار شیخ صاحب کو اپنے ہاں کھانے پر بھی مدعو کیا لیکن ان سے کسی نے آج تک کوئی باز پرس نہیں کی اور کسی پولیس والے نے ان کا پیچھا نہ کیا۔ اگر شیخ صاحب کے ساتھ مراسم رکھنا یا ان کے ہاں آنا جانا ''دشمنانہ سرگرمی'' تصور کیا جاتا ہے تو پھر صرف شمیم احمد شمیم پر ہی کیوں نگرانی کی جاتی ہے۔ لالہ تیرتھ رام پر کیوں نہیں؟۔ شیکسپئر نے تو کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ لیکن ملکہ اندرا کے دور میں نام کی بڑی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

مارچ ۱۹۷۱ء

جمہوریت، کشمیر اور بنگلہ دیش

جناب ڈپٹی سپیکر! میں شروع میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں بجٹ کا ماہر نہیں ہوں اور میں خالص تکنیکی نکتۂ نگاہ سے بجٹ پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ بجٹ کے مختلف پہلوؤں پر میرے بہت سے فاضل دوست روشنی ڈال چکے ہیں کچھ نے اسے ایک ناکام بجٹ کہا ہے اور کچھ نے ساکت و جامد بجٹ کے نام سے یاد کیا ہے میں اسے Statusquo بجٹ کا نام دونگا۔

وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر کے آغاز میں بنگلہ دیش کا ذکر کیا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سارے بجٹ پر بنگلہ دیش چھایا ہوا ہے اور ایسا ہونا حق بجانب بھی ہے، کیونکہ بنگلہ دیش کا وجود ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس نے جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم سے ہماری وابستگی کو ایک نئی سمت عطا کی ہے اور جمہوریت سے اس نئی گہری وابستگی کو میں اپنی ریاست کے لیے ایک نیک فال تصور کرتا ہوں!

جہاں تک مرکزی رقوم کا تعلق ہے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں یہ

نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں مناسب امداد نہیں مل رہی ہے بلکہ میری شکایت یہ ہے کہ ہمیں اپنے خرچ کرنے کی استطاعت سے بھی زیادہ رقوم مل رہی ہیں، مگر اہم ترین سوال یہ ہے کہ یہ روپیہ جو ہندوستان کا ٹیکس دہندہ، جمہوریت سے وابستگی Commitment اور اس کی بقاء کے لیے کشمیر اور بنگلہ دیش کو مہیا کر رہا ہے اس کا استعمال کیسے ہو رہا ہے۔

کشمیر میں جمہوریت کی بقاء سے ہماری گہری وابستگی بہت پُرانی ہے اور یہ ۱۹۴۷ء میں شروع ہوئی تھی۔ میں اس ایوان کو بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں تک جمہوری اقدار اور سوشلزم کا تعلق ہے، پچھلے پچیس برسوں، ہم نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ کشمیر کے وزیر اعلیٰ نے ابھی حال ہی میں کہا ہے کہ حالیہ انتخابات ریاست کے سب سے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات تھے۔ یہ دعویٰ بجائے خود اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ اگر آزادانہ ترین Fair انتخاب تھا، تو اس سے پہلے کے انتخاب کم آزادانہ یا بالکل آزادانہ نہ تھے۔

دوسری بات یہ کہ کشمیر میں کس قسم کے آزادانہ انتخابات کرائے جاتے ہیں۔ اگر جمہوریت سے ہماری دلچسپی اور وابستگی اتنی گہری ہے کہ ہماری فوجیں جمہوریت کو بچانے کے لیے بنگلہ دیش میں داخل ہو کر پاکستان سے جنگ کا خطرہ مول لے سکتی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے ملک میں ہمیں جمہوری اقدار کے تحفظ کا اس سے زیادہ خیال ہونا چاہیے لیکن آئیے دیکھیں کہ دراصل کشمیر میں کیا ہو رہا ہے۔ پہلے جو کچھ ہوا ہے اس کو تو چھوڑ دیجیے تازہ ترین انتخابات، جن کے متعلق چیف منسٹر کا دعویٰ ہے کہ وہ آزادانہ تھے، اس وقت منعقد ہوئے کہ جب تمام سرکردہ سیاسی رہنما جیل میں ہیں یا جلاوطن کر دیئے گئے ہیں۔

ڈپٹی سپیکر:۔انتخابات کا بجٹ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

شمیم احمد شمیم:۔ بجٹ میں بنگلہ دیش ٹیکس کا جہاں تک تعلق ہے وہ مجھے بھی ادا کرنا ہے اور اس لیے......

ڈپٹی سپیکر:۔ آڈر، آڈر۔ میں آپ کی زبان بندی نہیں کرر ہا ہوں م میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ خیالات ظاہر کرنے کے لیے دوسرے مناسب مواقع ہو سکتے ہیں مگر بظاہر آپ کی تقریر کا بجٹ سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔

جیوتر موئے باسو:۔ اگر آپ نے گذشتہ تین دنوں کے دوران اس ایوان کے موضوع پر کی گئی تقریریں سنی ہوتیں، اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا، تو میں مسٹر شمیم سے اس قسم کے الفاظ کہنے سے پہلے تین بار سوچتا۔

ڈپٹی سپیکر:۔ایوان کی کارکردگی کو صحیح سمت میں...... چلانا میرے فرائض میں شامل ہے۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں مقدور بھر بجٹ میں صرف متعلق باتیں کہنے کی اجازت دوں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ انتخابات آپ کے لیے اہم ہوں تو ہوں، مگر ان کا بجٹ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

شمیم: میں ایک بات عرض کروں!

پروفیسر مدھو دندوتے: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ بجٹ سے متعلق ہونا چاہیے، مگر بدقسمتی سے ایک روایت بن گئی کہ بیرونی معاملات کے پالیسی مسائل، انتخابات اور دوسرے موضوعات، جو صدر جمہوریہ کے لیے شکریہ کی تحریک کے تحت اٹھائے جانے چاہیے تھے بجٹ کی بحث میں اٹھائے گئے ہیں۔

ڈپٹی سپیکر: جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکے گا میں اس قسم کے طرز عمل

میں پارٹی نہ بنوں گا۔

شمیم: بجٹ سے میری باتوں کا براہ راست تعلق یہ ہے کہ اس بجٹ میں جو روپیہ میری ریاست کے لیے مخصوص ہے وہ ٹھیک طرح سے خرچ نہیں ہو رہا ہے۔ ماضی میں بھی یہ صحیح طریقے پر خرچ نہیں ہوا ہے اور یہی میری شکایت ہے۔ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ انتخابات بجٹ کے تحت نہیں آتے ہیں میں اس سے متفق نہیں ہوں، وزارتِ خارجہ سے لے کر انتخابات تک ہر موضوع بجٹ کی ذیل میں آتا ہے اور اس پر بحث ہوسکتی ہے ابھی حال ہی میں مسٹر نکسن اور مسٹر چاؤ نے اپنے مشترکہ بیان میں کشمیر کا ذکر کیا تھا، میں بجٹ کے موضوع پر بولتے ہوئے اس کا ذکر کرسکتا ہوں اور میں اس کا ذکر کرنا بھی چاہوں گا۔

میں حکومتِ ہند اور وزیر اعظم کے اس موقف سے بالکل متفق ہوں کہ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے کسی بیرونی طاقت کو خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، دخل در معقولات دینے کا حق نہیں ہے۔ کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ ہے اور اس کا ایک حصہ بنا رہے گا۔ مگر ایک ہندوستانی کی حیثیت سے مجھے یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قومی مفادات کے حق میں ہے یا منافی۔

میرے فاضل دوست شری کے منوہرن نے کل اندرونی خودمختاری کے اس مطالبے کا ذکر کیا کہ جس کے لیے ان پر علٰحیدگی پسندی کی تہمت عائد کی جارہی ہے انہیں کل اس ایوان میں اپنی اور اپنی جماعت کی پوزیشن واضح کرنے کی اجازت دی گئی اور آج میں یہاں کشمیری عوام کی صفائی پیش کرنے کے لیے کھڑا ہوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ان پر علٰحیدگی پسندی کا الزام ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے۔ اس کا مقصد ان کو ملک کے قومی دھارے سے

الگ رکھنے کے سوا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشن جیسی برگزیدہ شخصیت نے کہا ہے کہ اگر کشمیر کے متعلق واقعی کوئی تنازعہ ہے تو وہ کشمیر اور ہندوستان کے عوام کے درمیان ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن کہتے ہیں۔

''جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی بیرونی طاقت کو ہمارے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے تو ہم اس وقت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کشمیر میں کچھ بے چینی یا مشکالات ہیں تو یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم کشمیر کے لوگوں کو مطمئن کر کے ان کی مشکلات کو حل کر دیں''۔

میں ہندوستانی آئین اور اس ملک کے جمہوری اداروں کا نام لے کر اس بات کا دعویدار ہوں کہ کشمیر کے لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ میں صرف شیخ محمد عبداللہ ہی کے لیے جمہوری حقوق کا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں۔ ریاستی عوام کے لیے انصاف چاہتا ہوں، حالانکہ ایک فرد کی حیثیت سے شیخ عبداللہ کے حقوق بھی آئینِ ہند میں معین ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ نے بنگلہ دیش کو ظلم و تشدد اور پاکستان کی فوجی آمریت سے آزاد کرایا ہے تو کشمیر کو بھی اس مفادِ خصوصی کے تسلط سے آزاد کیجئے کہ جو وہاں صرف آپ کے سہارے قائم ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی ٹیکس دہندہ کا پیسہ کشمیر میں میرے ملکی مفادات کے خلاف استعمال ہو رہا ہے اور یہ وہ مفادِ خصوصی کر رہا ہے کہ جسے مرکزی لیڈروں نے کشمیر پر مسلط کر دیا ہے کہا جا رہا ہے کہ کشمیر میں آزادانہ انتخابات ہوئے ہیں اور وہاں ۶۰ رفیصد سے زائد لوگوں نے ووٹ ڈالے، میں ایک بار پھر ہندوستان کے ایک اور سرکردہ رہنما سردار پٹیل کے بیان کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ سردار پٹیل کہتے ہیں:

''معلوم ہوا ہے کہ مستقبل قریب میں ریاست میں انتخابات ہو رہے

ہیں میرا خیال ہے کہ اس وقت تک ریاست میں اسمبلی کے لیے انتخابات کرانے سے کوئی فائدہ یا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ بہت سے وہ لوگ جنہیں اسمبلی میں ہونا چاہیے تھا جیلوں میں بند ہونے کی وجہ سے انتخابات میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوں''

یہ سردار پٹیل کا خط ہے! کس کے نام؟ وزیراعظم کشمیر کے نام......اور کب لکھا گیا؟ ۲۸/اگست ۱۹۴۶ء کو۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس خط کا آج کے حالات پر اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح آج سے ۲۴/برس پہلے ہوتا تھا۔ آپ نے انتخابات میں ۶۰ فیصد کو چھوڑ کر ۹۲ فیصد ووٹ ہی کیوں حاصل نہ کئے ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ آپ نے کن طریقوں سے حاصل کئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کم از کم انتخابات کے معاملے میں قومی یک جہتی کا پروگرام آگے بڑھ رہا ہے۔ پہلے صرف کشمیر میں انتخابات میں فراڈ اور بے ایمانی ہوتی تھی مگر اب مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اب میرے ساتھ جیوتی موئز باسو اور مدھو دندوتے کو بھی شکایت ہے کہ ۱۹۷۲ء کے عام انتخابات......آزادانہ اور غیر جانبدارانہ نہ تھے، قومی یک جہتی مکمل ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ پہلے کشمیر، اب مغربی بنگال اور کل بہار اور دوسری ریاستیں،

میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جب شیخ محمد عبداللہ نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملایا ہے اور یہ کہ وہ الحاق کو حتمی سمجھتے ہیں اور ان کا جھگڑا صرف الحاق کی مقدار یا اندرونی خودمختاری کی حدود سے ہے اور اسی طرح محاذ رائے شماری کے صدر مرزا افضل بیگ نے بھی اسی طرح کا بیان دیا ہے تو پھر ان رہنماؤں کے ساتھ مکالمہ شروع کیوں نہیں کیا جاتا۔ آپ ناگاؤں کے ساتھ بات چیت پر تیار ہیں، آپ نکسلائٹس تک

سے مکالمہ شروع کرنے پر آمادہ ہیں تو شیخ عبداللہ سے بات کرنے میں کونسی دیوار حائل ہے۔

ڈاکٹر کیلاس: ان سے سو بار بات چیت ہو چکی ہے۔

شمیم: جمہوریت میں مکالمہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ فوجی آمریت کا اصول ہے کہ وہ گفتگو کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ جمہوری نظام میں مکالمہ ایک مسلسل عمل ہے، میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹر کیلاس کس مکالمے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ کافی بزرگ ہیں اور انہوں نے جب شیخ صاحب سے بات کی ہوگی تو میں شاید پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں آج کی اور آج کے حالات کی بات کر رہا ہوں کہ جب میں سیاسی اکھاڑے میں موجود ہوں۔

شری چیلنا نڈو بھٹاچاریہ: وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا بجٹ سے اتنا ہی تعلق ہے کہ جتنا اونٹ کی قیمت کا مزدور طبقہ کے معیارِ زندگی سے۔

شمیم: میں ان میں سے ہر ایک کی بات سننے کے لیے تیار ہوں، اور یہ لوگ ڈپٹی سپیکر کے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔

ڈپٹی سپیکر: مجھے ان کی تقریر کا صرف یہ حصہ بجٹ سے متعلق لگ رہا ہے کہ مرکز کی طرف سے کشمیر کو ملنے والی رقوم کا کتنا حصہ واپس لے کر ملک کے دوسرے حصوں میں خرچ کرنا چاہیے۔

شمیم: یہ خاصا طویل مسئلہ ہے اور اس پر میں وزیرِ خزانہ سے بعد میں بات کروں گا، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم کشمیر میں پہلے ہی کروڑوں روپیہ برباد کر چکے ہیں۔ کشمیر کے لوگوں سے ہمارا یہ عہد و پیمان تھا کہ ہم یہاں جمہوری اقدار اور نظام کی حفاظت کریں گے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ کشمیر کے علاوہ ملک کے ہر حصے میں جمہوری نظام قائم ہے اور کشمیر میں کس طرح کا نظام

چل رہا ہے؟ اس کی قلعی خود وزیرِ اعلیٰ نے حالیہ انتخابات کو ''سب سے آزادانہ'' قرار دے کر کھول دی ہے۔ کشمیر کے انتخابات کو صرف میں ہی ڈھونگ نہیں کہتا ہوں، ۱۹۶۷ء میں اس ایوان کی تمام مخالف جماعتوں نے کشمیر کے انتخابات کو فراڈ کہا تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ دوہرے معیار کیوں استعمال کرر ہے ہیں؟ ایک معیار اپنے ملک میں اور دوسرا معیار دوسرے ملک میں! میں پوچھتا ہوں کہ کون ہیں وہ لوگ جو کشمیر کو ہندوستان کا ناقابلِ تنسیخ حصہ نہیں سمجھتے ہیں یا وہ جو کشمیر کے ساتھ امتیازی سلوک کرر ہے ہیں۔ کشمیر میں مجھ جیسے نوجوان فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے لیکن خود اس ملک کے اس حصے میں جمہوری نظام کہاں؟ میری ریاست میں ہندوستان کی شبیہ اتنی مسخ کر دی گئی ہے......

شری بی پی موریہ: آپ کیسے کہتے ہیں کہ انتخابات آزادانہ اور غیر جانبدارانہ نہ تھے؟ کیا آپ بھی ناجائز طور پر منتخب ہوئے ہیں؟

شمیم: جی ہاں! مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا، میرے فاضل دوست نے یہ سوال پوچھ کر میرے دعویٰ کی تصدیق کی ہے، میں جس جگہ سے بول رہا ہوں یہاں شیخ محمد عبداللہ کو ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے جب انہیں انتخابات لڑنے سے روکا، تو میں ان کی جگہ آیا، اور اس اعتبار سے میں صحیح طور منتخب نہیں ہوا ہوں، صرف میں ہی نہیں، آغا سید احمد اور محمد شفیع قریشی کو بھی اس ایوان میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ لوگوں نے عوام کے صحیح نمائندوں کو اس ایوان میں ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے سے باز رکھا ہے آپ نے کشمیر کے عوام کے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ آپ کا بجٹ بھی فراڈ ہے۔ اور آپ کے سبھی ارادے فراڈ ہیں۔ جب تک آپ کشمیر کو جمہوریت نہ دیں مجھے بنگلہ دیش سے آپ کی

وابستگی اور دل چسپی بھی فراڈ نظر آتی ہے۔ جب تک کشمیر میں جمہوریت بحال نہیں کی جاتی، آپ بنگلہ دیش کی بات نہیں کر سکتے۔

کئی ممبر (بیک وقت) آپ خود فراڈ ہیں۔

شیر بھٹاچاریہ جی: یہ سب ممبروں کی توہین کر رہے ہیں۔

شمیم: (بآوازِ بلند) میں نے بہت برداشت کیا ہے اور اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔

ڈپٹی سپیکر: آڈر، آڈر۔

بی۔ پی۔ موریہ: کیا بنگلہ دیش کو فراڈ کہنا مناسب ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ خود فراڈ ہے۔

شمیم: میں بنگلہ دیش کو نہیں، بنگلہ دیش سے آپ کے عشق کو فراڈ کہتا ہوں۔ یہ مت بھولیے کہ میں ہندوستانی پارلیمنٹ میں بول رہا ہوں اور یہاں بولنا میرا آئینی حق ہے۔

ڈپٹی سپیکر: میرا خیال ہے کہ آپ نے اپنی تقریر ختم کی ہے میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بجٹ سے متعلق نہیں ہے۔ اب آپ مہربانی کر کے اپنی تقریر ختم کر دیجیے۔

شمیم: میں کہتا ہوں کہ جب میں اس پارلیمنٹ میں بولتا ہوں، تو اس لیے نہیں بولتا، کہ حکمران جماعت نے مجھے بولنے کا حق دیا ہے میں اس لیے بولتا ہوں کہ بولنا میرا پیدائشی اور آئینی حق ہے۔

ڈپٹی سپیکر: مجھے اس بات سے اتفاق ہے اور اسی لیے میں نے آپ کو اجازت دی ہے۔

سپریم کورٹ پر کانگریسی گوریلوں کا شب خون!

مسٹر چیئرمین! میں وزیر فولاد مسٹر موہن کمار منگھلم کو ان کی اس شاندار ڈرامائی تقریر پر مبارکباد دیتا ہوں، کہ جو انہوں نے ۲ مئی کو اس ایوان میں ارشاد فرمائی۔ وزیر قانون مسٹر گھوکھلے کے مقابلے میں انہوں نے زیادہ دیانت، صاف گوئی اور راست گفتاری سے کام لیا، وہ ایک مشہور فوجداری CRIMINAL وکیل ہیں اور میں نے سنا ہے کہ بحیثیت وکیل کے وہ بہت سے قاتلوں کو بری کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حکومت نے اپنے جرم کی سنگینی اور سنجیدگی کے پیش نظر ہی ایسے قابل اور شہرت یافتہ وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں، لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ قتل کے اس مقدمے میں کمار منگھلم مجرموں کو بری کرانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ کیونکہ دوران بحث وہ یہ بھول گئے کہ وہ کسی بورژوا یا رجعت پسند عدالت کے سامنے نہیں، عوامی عدالت کے سامنے بحث کر رہے ہیں اور اس عدالت میں خوبصورت انگریزی، عمدہ اداکاری اور پیچیدہ دلائل کی بجائے ملزم کی نیت پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ ان معنوں میں مسٹر کمار منگھلم نے بحث جیتنے کے باوجود مقدمہ ہار دیا ہے۔ ملزم نے صاف لفظوں میں اقبال جرم کیا ہے، اس

لئے اب بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہیے اور اس مختصر سے وقت میں، میں یہی کرنے جا رہا ہوں!

میں حکومت کے اس حق کو چیلینج نہیں کرتا کہ اسے چیف جسٹس منتخب کرنے، دوسرے ججوں کو ناامید کرنے اور اس ملک کے عوام پر ہر قسم کی ناانصافی روا رکھنے کا اختیار ہے۔ ہر ملک کے عوام کو وہی حکومت ملتی ہے کہ جس کے وہ مستحق ہوں اور موجودہ حکومت کو چونکہ اس ملک کے عوام نے بھاری اکثریت سے اپنے اوپر مسلط کیا ہے، اسلئے انہیں اس وقت تک اس کے بوجھ تلے دبے رہنا ہوگا کہ جب تک وہ اسے پھینک نہ دیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ آئین کی دفعہ ۱۲۴ اور ۱۲۶ کی رو سے صدر اور حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چیف جسٹس کو منتخب کریں، لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اس اختیار پر ایک روایت CONVENTION کی شکل میں ایک پابندی عائد کی گئی تھی۔ اس روایت کی پابندی یا احترام اس ملک کے عوام کے ساتھ اس نامہربان حکومت کی طرف سے کوئی رعایت نہیں تھی کہ جسے اب حکمرانوں نے واپس لے لیا ہے، یہ ایک قاعدہ تھا، ایک اصول تھا، اور اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ چیف جسٹس کے تقرر اور انتخاب میں حکومت کی نیت، اس کے عمل دخل اور اسکے ارادوں پر شک وشبہ یا بے جا تنقید کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ اس روایت کو ختم کر کے مسز گاندھی کی حکومت نے ایک ادارے کو ختم کرنے کی شروعات کی ہیں اور میں جب آج ماتم کرتا ہوں تو روایت کی موت کا نہیں، اس اصول اور ادارے کی موت کا ماتم کر رہا ہوں کہ جس کی وجہ سے عوام کے اعتماد اور اعتقاد میں ایک زبردست بحران پیدا ہو گیا ہے۔ اس کنونشن کا مقصد کیا تھا۔ مشہور قانون دان ایچ، ایم، سیروائی کے الفاظ میں سنئے:

''اس اصول CONVENTION کی بنیاد اس نکتہ نظر پر قائم ہے، کہ

بحیثیت مجموعی عدلیہ کے مفادات کا تحفظ انتخاب کرنے والوں کی مرضی اور من مانی کے امکانات کو ختم کرنے میں ہی مضمر ہے، نہ کہ بہترین آدمی، کی تلاش میں لا محدود اختیارات دینے سے۔''

آج سماجی تبدیلی، انقلابی نکتہ نگاہ، اور سیاسی فلسفے پر تین ناپسندیدہ ججوں کو چھٹی کر دی گئی ہے، لیکن مستقبل قریب میں جب مسز گاندھی اور کمار منگھلم کی مہربانی سے سپریم کورٹ کے سبھی جج ''ترقی پسند'' پیش بین FORWARD LOOKING اور سیاسی اور سماجی فلسفے کے اعتبار سے ''پسندیدہ'' ہوں گے، تو اس وقت چیف جسٹس کے انتخاب میں کون سا معیار بتایا جائے گا؟ اس وقت صرف ایک ہی معیار ہوگا اور وہ ہے منتخب کرنے والے کی ذاتی پسند یا اس کا ذہنی تعصب اور اس طرح سپریم کورٹ کی آزادی اور خود مختاری سے وابستہ تصور ختم ہو جائے گا اور یہ موقع اس لئے گریہ و ماتم کا ہے۔ میرے ذہن میں ایک اور صورت بھی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا، کہ اس مخصوص صورت حال میں کیا ہوگا؟ فرض کیجئے کہ ایک جج ترقی پسند بھی ہے اور آگے کی جانب دیکھنے والا بھی، لیکن بدقسمتی سے قانون کی تشریح، توضیع اور تفہیم میں زیادہ سدھ بدھ نہیں رکھتا اور اس کے مقابلے میں ایک جج نسبتاً کم ترقی پسند ہونے کے باوجود قانونی معاملات میں بے حد تیز اور معاملہ فہم ہے۔ ان دو ججوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے گی؟ یہ کوئی خیالی مسئلہ نہیں، بلکہ ایک حقیقی خطرہ ہے اور میں وزیر قانون سے اس سلسلے میں وضاحت چاہوں گا۔

مسٹر پیلو مودی: مسز اندرا گاندھی کو بھی supersede کیا جائے گا۔

شمیم احمد شمیم: لیکن معاف کیجئے، اسے آپ نہیں میں Supersede کروں گا۔ (قہقہہ)

جناب والا! کہا جاتا ہے کہ پندرہ برس قبل لاء کمیشن نے یہ سفارش کی تھی، کہ

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے انتخاب میں صرف سینیارٹی ہی نہیں، قابلیت، انتظامی صلاحیتیں اور رہنمایانہ اوصاف کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ مجھے ذاتی طور پر لاء کمیشن کی اس سفارش سے اتفاق ہے، لیکن کیا یہ صحیح نہیں، کہ اس سفارش کی رو سے یہ ہدایت بھی کی گئی تھی، کہ اس اصول اور کنونشن کو توڑنے سے بہت پہلے اس بات کا اعلان ہونا چاہئے کہ آئیندہ سے چیف جسٹس کا انتخاب صرف سینیارٹی کی بناء پر نہیں ہوگا، لیکن صرف نئے چیف جسٹس کا انتخاب یک لخت طور ایک ایسے ڈرامائی انداز میں ہوا ہے کہ اس پر فلسطینی مجاہدوں کے حملے اور الفرڈ ہچکاک کی کسی پراسرار فلم کا گمان ہوتا ہے۔ یہ سارا ڈراما اس طرح رات کی تاریکیوں میں کھیلا گیا، کہ جس طرح نئی کانگریس نے رات کے بطن سے جنم لیا تھا۔

مجھے چیف جسٹس مسٹر اے۔ این۔ رے سے کوئی پرخاش نہیں اور جسٹس ہیگڑے سے کوئی خاص اُنس نہیں۔ خاص طور پر کل جب میں نے پبلک جلسے میں ان کی تقریر سنی، تو مجھے ان سے وحشت ہونے لگی، وہ نہایت بھونڈے مقرر ہیں، لیکن میں یہ جاننے کا حق رکھتا ہوں کہ جسٹس رے پر کون سے ایسے تجربے اور ٹیسٹ کئے گئے تھے کہ جس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ سپریم کورٹ کے موجودہ ججوں میں چیف جسٹس بننے کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ مسٹر رے کے متعلق مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ میرے فاضل دوست پروفیسر ہیرن مکرجی کی معرفت معلوم ہوا ہے، کہ جنہوں نے کل اپنی تقریر میں ان کی بڑی تعریف کی، لیکن مجھے یہ بتایئے کہ مستقبل میں چیف جسٹس کی قابلیت، اہلیت اور صلاحیتوں کے بارے میں مجھے کہاں سے اطلاع ملا کرے گی، کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر مکرجی 1976ء میں انتخاب نہیں لڑیں گے اور بدقسمتی سے 1976ء میں ہی نئے چیف جسٹس کا انتخاب ہونے والا ہے۔ میرے

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ساری دنیا کو یہ معلوم ہونا چاہیئے، کہ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بننے کے لئے کس قسم کی شخصیت، اہلیت اور صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ کیا مہاراجہ کرن سنگھ اور کانگریس پارٹی کے دوسرے مہاراجوں نے بھی اسے تسلیم کیا ہے؟ اس مرحلے پر فیض کا ایک شعر پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے۔

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی مصنف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

اور ہاں مشہور اُردو شاعر آنند نرائن ملا کے بھی دو شعر یاد آرہے ہیں، کہ جو انھوں نے ہائی کورٹ جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے وقت کہے تھے۔

یہ ہمت مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے
طاقت کی رعونت کے مقابل بہ لبِ عدل
یوں حرفِ حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے

یہ وہی آنند نرائن ملاّ ہیں، کہ جنھوں نے اپنے ایک فیصلے میں پولیس کو ''بدمعاشوں اور ڈاکوؤں'' کا سب سے منظّم گروہ قرار دیا تھا۔ آج یہی ملاّ صاحب مسز گاندھی کے فیض بے پایاں سے مسحور ہو کر یہ مشورے دے رہے ہیں، کہ چیف جسٹس کا تقرر ان ہی بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں دیا جانا چاہیے۔

بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا!

مئی ۱۹۷۳ء

شمیم احمد شمیم

''پاکستانی ایجنٹ''

آج کی ساری بحث میرے لیے بڑی دلچسپ کا باعث تھی، اور اسے سن کر مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے وقت میں بہت سے لوگ ایک عورت کو سنگسار کرنے کے لیے لے جا رہے تھے، کہ رستے میں حضرت عیسیٰؑ ملے اور انہوں نے پوچھا، کہ کیا معاملہ ہے، لوگوں نے جواب دیا کہ یہ عورت اپرادھی ہے اور ہم اسے سنگسار کریں گے، حضرت عیسیٰؑ نے کہا، ٹھیک ہے اسے سنگسار کرو، لیکن تم میں سے پہلا پتھر وہی شخص مارے گا، کہ جس نے کوئی اپرادھ نہ کیا ہو۔ سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور کچھ دیر بعد وہ عورت بالکل اکیلی رہ گئی۔

اس بحث کے دوران جب مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ ممبران کی طرف سے ایک دوسرے پر طعنے بازی ہو رہی تھی تو اس سے صرف یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس ایوان میں اِس طرف بھی اور اُس طرف بھی اپرادھی بیٹھے ہوئے ہیں، اور اگر کسی کو پہلا پتھر مارنے کا حق ہے تو اس کا نام شمیم احمد شمیم ہے۔ کیوں کہ نہ اس جانب سے اور نہ اُس جانب سے کسی نے اس پر کسی مونوپلی ہاؤس، یا غیر ملک سے روپیہ حاصل کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔ اس بحث کے دوران جو دلچسپ انکشافات ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوا ہے کہ

حکمران جماعت ہی نہیں، مخالف سیاسی جماعتوں نے بھی انتخابات کے لیے سرمایہ داروں سے روپیہ بٹورا ہے، اور مجھے اقبال کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ اگر چہ میرے کانگریسی دوستوں کو شعر سننے کا کم ہی شوق ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ اس شعر سے ضرور محظوظ ہوں گے۔

خداوندا یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

چھ گھنٹے کی اس بحث کے دوران ایک بھی کانگریسی ممبر نے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر یہ نہیں کہا کہ ہاں اس الزام کی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ اگر بدقسمتی سے میں حکمران جماعت سے وابستہ ہوتا، تو میرا پہلا مطالبہ ہوتا کہ میری جماعت کی عزت، آبرو اور شہرت کو بچانے کے لیے اس الزام کی عدالتی تحقیقات ہونی چاہیئے کیونکہ حکمران جماعت کانگریس کے لیے بدنامی سے بچنے کا اور کوئی باعزت ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن تحقیقات کا مطالبہ کرنے کے بجائے حکمران جماعت کے اکثر مقرروں نے مخالف جماعتوں پر جوابی الزامات عائد کیے۔

چوری جب چھپ چھپ کر یا رات کی تنہائیوں میں کی جائے تو وہ چوری ہوتی ہے، لیکن جب چور دن دھاڑے، سب کے سامنے چوری کا ارتکاب کرے تو قانونی اصطلاح میں یہ ڈاکہ بن جاتا ہے اور میرے لیے یہ بات تشویشناک ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے کلکتہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کھل کر اس بات کا اعتراف کیا کہ ’’ہاں ہم سرمایہ داروں سے پیسہ لیتے ہیں‘‘۔ جب ملک کی وزیر اعظم اس ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جرم کا اقبال کریں تو میں سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ چوری اب ڈاکے کے سرحدوں

میں داخل ہوگئی ، اور میں سرمایہ داروں کی دولت کے سہارے غریبوں کے ووٹ لوٹنے والے سبھی لوگوں سے گذارش کروں گا کہ وقت آگیا ہے کہ وہ کسی جے پرکاش نرائن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ بار بار جرم کرنے سے مجرم کا ضمیر مردہ ہوجاتا ہے اور اسے جرم کا احساس بھی نہیں رہتا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران اب پیشہ ور مجرم Hardendcriminals بن گئے ہیں اور انہیں اب اس بات کا بھی احساس نہیں رہا ہے کہ دُنیا میں ان کی امیج کیا ہے؟

حکمران جماعت نے اب ہر سوال کا ایک انوکھا جواب وضع کیا ہے اور وہ ہے میسو منڈیٹ Massive mandate۔ ہم کہتے ہیں کہ اس ملک میں کورپشن بڑھتا جارہا ہے، تو جواب ملتا ہے کہ ہمارے پاس Massive mandate ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ناگروال نے سٹیٹ بلیک سے کس لیے ۶۰ لاکھ روپے نکالے، جواب ہے۔ Massive mandate یعنی ہر سوال کا جواب ہے میسو منڈیٹ۔ بحث اس سے نہیں ہے کہ آپ کے پاس Massive mandate ہے یا نہیں اس میں تو کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا، اور آپ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر کس کافر کو آپ کے میسو منڈیٹ میں شبہ ہوسکتا ہے۔ لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ اس میسو منڈیٹ کے پیچھے Massive Money ہے، روپے اور وہ بھی سرمایہ داروں کے روپے کی طاقت ہے۔

مسز اندرا گاندھی کمیونسٹ (مارکسٹ) پارٹی کو، سوتنتر پارٹی اور دوسری جماعتوں کو بار بار یہ یاد دلاتی ہیں کہ پارلیمانی انتخاب میں انہوں نے ان کو چاروں شانے چت کردیا ہے۔ یہ دلیل ان کو مرعوب کرسکتی ہے، لیکن مجھے مرعوب نہیں کرسکتی، میں نے تو آپ کے لاڈلے کو ہرایا ہے اور ایک نہیں

پورے اٹھاون ہزار ووٹوں سے ہرایا ہے اور باوجود اس کے کہ آپ نے انتخابات میں کتنی ہی چوریاں کیں۔

ایک ممبر: مسٹر شمیم نے ہم پر چوری کا الزام عائد کیا ہے۔ یہ غیر پارلیمانی ہے، اور اسے حذف کرنا چاہیئے۔

شمیم احمد شمیم: میں اُردو میں تقریر کر رہا ہوں، اور انتخابات میں چوری کے لیے انگریزی ترجمہ Rigging ہے اور یہ غیر پارلیمانی ہے؟

سپیکر: میں شائد اُردو آپ سے زیادہ پڑھا ہوں۔

شمیم: تو پھر میری وکالت کیجئے۔

رام دھن: تم پاکستانی ایجنٹ ہو۔

شمیم: ہاں، ہاں میں نے مسلمان ہونے کا جرم کیا ہے، اس لیے میرے پاکستانی ایجنٹ ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

شیام نندن مصرا: میں اس کے خلاف احتجاج کرتا ہوں، افسوس کی بات ہے کہ آنریبل ممبر پر حکمران جماعت کے ایک رکن کی طرف سے ایسا الزام عائد کیا جائے۔

رام دھن: یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس ایوان میں اس سے پہلے بھی کئی بار آنریبل ممبروں نے ایک دوسرے کو امریکی، روسی اور چینی ایجنٹ کہا ہے۔

شمیم: لیکن مجھے پاکستانی ایجنٹ صرف اس لیے کہا گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔

راج بہادر: مسٹر شمیم اپنے مسلمان ہونے کا ذکر کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو بدظن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے اس الزام کو ایوان

کی کارروائی سے حذف کرنا چاہیے۔

شمیم: میں اپنے اس دعوے پر اب بھی قائم ہوں کہ مجھے صرف اس لیے پاکستانی ایجنٹ کہا گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں، لعنت بھیجتا ہوں تمہارے سیکولرازم اور سوشلزم پر۔

شیام نند مصرا: میں مسٹر شمیم کے اس خیال سے سو فیصدی متفق ہوں کہ انہیں صرف اس لیے پاکستانی ایجنٹ کہا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ انہیں روسی یا امریکی ایجنٹ کیوں نہیں کہا گیا، اور مجھے اور پیلو مودی کو کسی نے پاکستانی ایجنٹ کیوں نہیں کہا۔

اٹل بہاری واجپائی: کیا شمیم صاحب صرف اس لیے پاکستانی ایجنٹ بن گئے کہ ان کی تقریر نے حکمران جماعت کو بدحواس کر دیا ہے۔ کیا کانگریسیوں کو حب الوطنی کی اجارہ داری ہے؟

جیوتی باسو: مسٹر شمیم کی تقریروں پر تالیاں بجانے والے کانگریسیوں کی نظروں میں مسٹر شمیم اب اس لیے پاکستانی ایجنٹ بن گئے ہیں کہ انہوں نے کچھ تلخ باتیں کی ہیں۔ حکمران کانگریس کی نظروں میں وہ سب مسلمان پاکستانی ہیں جو ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ یہ انتہائی شرمناک رویّہ ہے۔
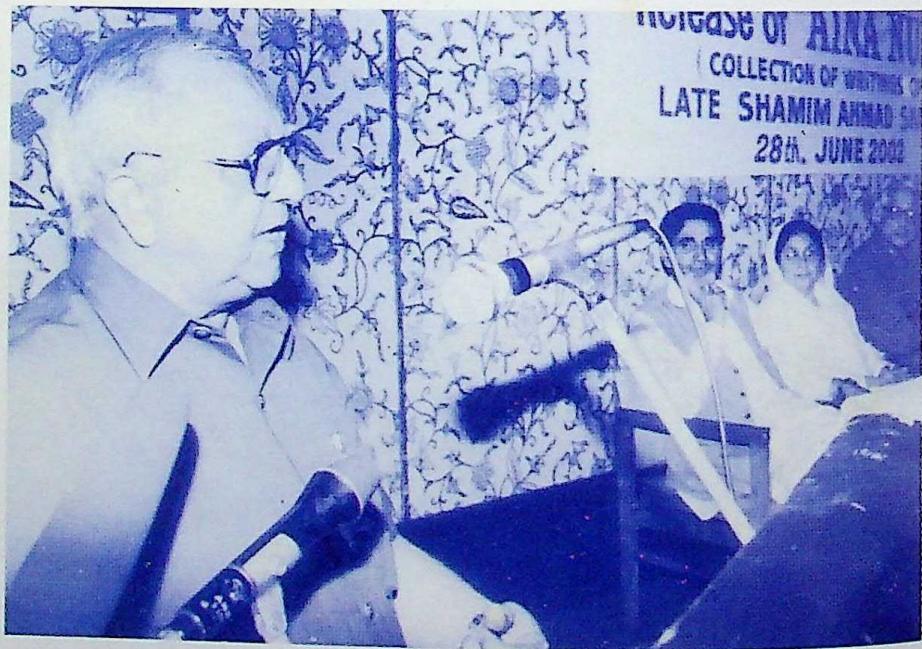
بھگت جھا آزاد: مسٹر شمیم نے اپنی تقریر میں ہم سب کو چور اور ڈاکو کہا ہے اور ان کے یہ الفاظ ایوان کی کارروائی سے حذف کرنے چاہئیں۔

۱۹۷۱ء

آئینہ نما کے دوسرے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

آئینہ نما کے دوسرے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

آئینہ نما کے دوسرے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

AINA-NUMA

VOL:4

Edited and Published

by

Qurrat-ul-Ain

CONTENTS

◆◆◆

These speeches of
Shamim Ahmad Shamim
in parliament are
reproduced from the
original transcriptions.
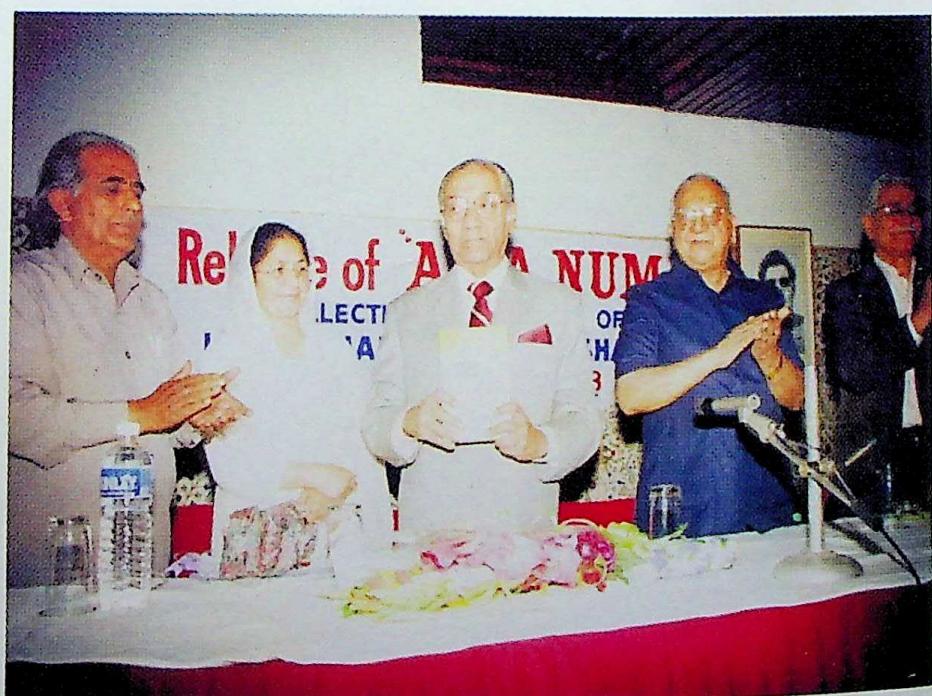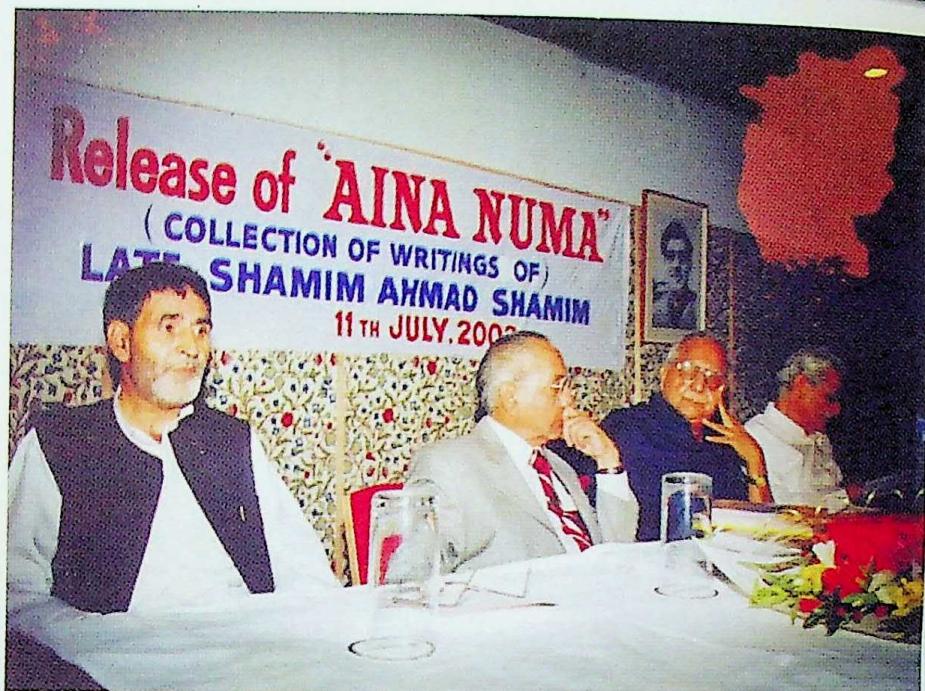
آئینہ نما کے تیسرے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

Release of "AINA NUMA"
(COLLECTION OF WRITINGS OF)
LATE SHAMIM AHMAD SHAMIM
11 TH JULY, 200

آئینہ نما کے تیسرے شمارے کے اجرا کی جھلکیاں

Tyranny of Anti-Defection Law

SHRI S. A. SHAMIM: I think if as an independent anybody has a right to speak on this Bill, it is you and me. You cannot do it, because your office has deprived you of your independence. But I retain my independence yet, though with the coming of this bill, I feel my independence also may be short-lived. How is it that we are trying to prevent individual conduct or misconduct by a piece of legislation? If we take this to its logical conclusion, considering the entire behavior in Parliament and the conducting of Parliamentary business etc, we will have to have 120 pieces of legislation and even then we will not succeed in preventing what we intend to prevent by this legislation.

This Bill only subjects the members of the Parliament to the tyranny of the party whips. It presumes, as many members have said that the elections in this country are fought on the basis of programmes, policies and ideologies. I beg to differ from them. If you survey the election scene for the last 25 years, you will be convinced that in 80 percent of cases, the electorate vote for a particular candidate for his individual merit rather than for his party's merit. How is it that in a

particular constituency in a particular State, a particular party gets the majority and another party gets almost the same vote and if you go into the pattern of voting, the defeated candidate gets more votes than the one who is elected? That means his election is only valid legally because he fulfils certain legal procedure and formalities. It is not a question of ideology.

Take the instance of independents, how come that many eminent independents including myself, have been elected to Parliament? When I contested the Assembly elections in 1967, I confessed I had no political ideology to project. I had only one ideology and that was that my opponent did not have any ideology though he represented the Congress Party. I was able to convince my electorate that this candidate who professed to believe in Congress ideologies did not in fact believe in it. So, I got elected. In my parliamentary election, I defeated Madam Gandhi's candidate, Bakshi Ghulam Mohammed, who apparently had all the cuttings and trappings of Congress ideology. My negative ideology was that the man was corrupt and he corrupted the Congress ideology.

SHRI M. RAM GOPAL REDDY (Nizamabad): He is no more.

SHRI S.A.SHAMIM: True. You also will b no more after some time, but we will continue to talk about you and your misdeeds.

This basic assumption that people vote on the basis of certain ideologies and programmes is not wholly correct. What happens when a party like the Congress gets votes on a certain manifesto and then during the five years of its rule, does not practice it, changes it and defects from that particular manifesto? Would you give the President the right to disqualify the entire party because it has not adhered to the manifesto put by it before the electorate? When you put the whole thing into actual practice, you are going to face many difficulties. It depends upon the individual character of the member. How come that from 1967 to 1971 there were so many defections and there are no defections today? Defections are only a reflection of political instability in the country. Once political instability is not there, there will be no defections. By preventing defections through legislation, you are not going to cure the root cause of political instability. Instead of trying to attack the root cause and educating the voters to elect people who are really honest, who have integrity, who adhere to certain values, we are trying to put a premium on dishonesty. Honest men like myself, who are there in the House, though not in large numbers, would by conviction vote for one measure in one manner and for another measure in a different manner. Why should we prevent them from voting according to their conscience? Why this abuse of parliamentary apparatus to change the basis of the parliamentary institution? It is known

that Hitler misused and abused the parliamentary institution and brought the parliamentary institution into disgrace by converting it into a dictatorship. Does that mean that the parliamentary institution is bad? It depends upon who are the people who are operating it.

Why should an honest man be subjected to an electoral process once he decides to vote according to his conscience? I would have welcomed it, if the electoral system in this country would not have been as expensive as it is today. Each election in this country, in the case of Congress MP, costs not less than Rs.3 lakhs to 4 lakhs. *(interruptions)* I know my Hon'ble friends who are now protesting must have spent more than Rs. 4 Lakhs.

SHRI S. R. DAMANI(Sholapur): Sir, on a point of order. May I know how much the Hon'ble member has spent?

SHRI S. A. SHAMIM : It is not a point of order but a point of information. The expenditure I have incurred for the election was Rs. 12,748.

Normally, for a change of party or not voting according to the party whip, I would have welcomed going to the electorate. But for that the electoral process should be simplified. It should not cost me more than Rs. 1,000. But in this country we are following more the American pattern where only the richest can afford to contest

the elections. It is common knowledge that very many independents, who initially were Independents, seek the party protection and party ticket because they do not have the necessary financial resources to enter into the political arena. Once each member is assured that an election will not cost more than Rs. 1,000 or Rs. 1,500, I would welcome such steps of going to the electorate.

Why penalise an hon. Member if he honestly and because of conviction does not want to support the action of a party? It is surprising that a party which has come into power on the basis of a vote of conscience should come up with a Bill and go against the conscience of the members by saying that we should not vote according to our conscience but we should vote according to the party whip. These whipping boys who want to whip the people of this country want to legislate that from now onwards no honest man will enter the precinct's of this House.

We have adopted the form of the British parliamentary democracy. Let us see what they have done. They could not even think that the parliamentary institution can be put to such an abuse that members in dozens should walk from one side to the other. So, for a contingency which depends entirely upon the individual character, we cannot provide any legislation. Our future generations, when they come to know about it

from the statute book, they will say that their forefathers have been traders, dishonest traders, who would change parties, go from one side to another, merely because they were lured by office.

Instead of putting this legislation on the statute book, I would suggest that the parties themselves should evolve a code of conduct and the members should take an oath at that particular point of time and the party should decide what should be done in case a member walks out to the other side. As it is, this Bill will be telling the world at large that the Members of Parliament and the members of the State legislature in India are soulless people who can be lured by offers of Minister ship, who will defect their party because they are not subject to the discipline of that party. We will not be enhancing the prestige of this House by passing such a measure.

Then, when all is said and done, this Defection Bill will ultimately force people who are born defectors to think of something more novel, something more vicious, and put this procedure to a greater abuse, if they cannot give vent to their feelings, if they cannot subject themselves to the whims and caprices of their minds in any other manner. Therefore, I say this Bill should be withdrawn because it is an insult to the parliamentary genius of this country, because it is an insult to the parliamentary institutions and

because it shows complete lack of faith in the integrity of the members of this House. Merely because a handful of legislators, 2,000 and odd members, have defected, the entire future generation, the future parliamentarians should not be subjected to this penal clause, and they should not be debarred from developing their personality and from deciding issues on merits rather than on the basis of the party whip.

In this manner, we are stopping the intellectual growth of the party, the intellectual growth of Parliament and intellectual growth of our conscience, if any, left in the ruling party. I am sure, the Opposition Members who have welcomed this Bill have been trapped into it because of the fear that up to this day, it was the ruling party which was attracting the defectors. They have lost faith in themselves. They do not foresee a future that very soon, and, probably, roundabout 1976, it will be a thing on that side to decide and I say, they should not welcome this piece of legislation in panic and hurry.

(December, 1973)

Turmoil in East Pakistan

SHRI S. A. SHAMIM (Srinagar) : Mr. Speaker, my heart bleeds for my brethren in East Pakistan and I share the agony and anxiety of this House with regard to the happenings in East Pakistan. But I must say that I am not carried away by emotion. In this hour of great crisis facing the millions of people in East Pakistan, we must not be emotional. Every word uttered in this House should help to promote the freedom struggle of East Pakistan, rather than give a handle to men like Zulfiquar Ali Bhutto, that destroyer of our Fokker Friendship and that destroyer of Pakistan ultimately, to label Mujibur Rahman as an Indian agent. I was a witness to the revolution in Pakistan in 1969 when only one charge was levelled against Mujibur Rahman in the Agartala conspiracy case that he is a spy, an agent of India. Our remarks here should not strengthen the hands of Bhutto. *(Interruption)*. Let us not lose sight of the existing conditions in Pakistan. So far we have got only a part of the report; we have not got the full report of

what is happening in East Pakistan, whether that great freedom fighter Mujib is alive or not, whether he is in the hands of Pakistanis or not. Let us not rush with suggestions that we should recognize East Pakistan. I am giving expression to my views in this case... *(Interruptions).*

SHRI SAMAR GUHA: Yours is an isolated voice.

SHRI S. A. SHAMIM : It may be a minority voice. Still, let it be registered. I have my democratic right to convey my voice of dissent. In the same way as you express your views, I have my basic right to express my view.

Suggestions have been made that the case should be referred to the United Nations. I as a Kashmiri, know what the United Nations does in situations like this. They make a mess of the whole thing. What have they done in Kashmir? You went to the United Nations and you expected a solution in eight days. Now 24 years have passed and still you have not found any solution.

The people of East Pakistan are facing aggression. They are facing the imperialist intrigues. This is not the way to rush with suggestions "let us accept" or "let us not accept". At this stage our agony and anger should find restrained expression. I am in full agreement with the government and I appreciate the stand taken by

the government that the restrained tone of the statement is the need of the time.

Mujibur Rahman, who has started the movement, needs the sympathy of all of us. He never started the movement on the understanding that Indian Parliament, Indian Government or the Indian people will rush to his aid with arms. He is a brave individual. From whatever little I know of him, he is brave enough to fight against Pakistani army. Our expression or sympathy is there and it is placed on record. I am sure he will draw sustenance from this that the Indian Parliament, the representatives of India have expressed their sympathy and their agony on what is happening in East Pakistan.

In this hour of crisis let us not forget that we have situations in this country which can be exploited by those whom we are accusing today in Bengal and in other parts of the country. Are you not aware of the implications of supporting the right of secession to one part of the country or the other? I do not support secession and I do not agree that it should be done.... *(Interruptions)*.

SHRI SAMAR GUHA : Seven and a half crore of people are declaring their independence. You have no right to say what you have said.... *(interruptions)*.

SHRI S. A. SHAMIM : This Government has recognized the Yahya Government. This Government has not withdrawn its recognition of Yahya Government up to this day. I am speaking consciously and I am speaking with a full sense of responsibility. We have to study the implications, legal and political, of what you are saying. My heart goes to the people of Bengal and I am grieved by what is happening in East Pakistan. But our expression should be a dignified expression, our expression should be a restrained expression. I convey on my behalf that in this battle against Pakistan army, in this battle against Pakistani imperialism, the Indian people, the people of Kashmir in particular are with Mujibur Rahman, that great hero, that great freedom fighter.

March, 1973

Gujarat

Upsurge of Popular Anger

SHRI S. A. SHAMIM (Srinagar): Mr. Chairman, Sir, I am very grateful to you for accommodating me for a few minutes. I as an independent unattached Member have many disadvantages but one advantage that I have in a situation like this is that I can be very detached. I do not have any vested interests like those of a political party. If I use that advantage I could very rightly tell my ruling party friends that the Government in the case of Gujarat is behaving foolishly, idiotically and criminally. That it is making a fetish of the Constitution and constitutional procedures. The fact remains that there has been a mass upsurge. The Government are behaving foolishly when they credit the entire opposition parties with this mass upsurge. On the one hand, they say that the opposition has no

moorings anywhere, we have a massive mandate; on the other they say that the opposition parties have been so successful in managing and staging such a big crisis. When they say this, they are paying a compliment to the opposition parties.

The fact of the situation in Gujarat is that there the political parties particularly have become absolutely irrelevant. Of course, all the political parties are trying to cash in on the situation. But the fact remains that it was the people in general irrespective of political parties who have risen in revolt basically because of shortages and then, of course, the rampant corruption. The talk of corruption has not been from the opposition alone. Shri Chimanbhai Patel, who has been thrown out of the Congress, is also talking today of corruption.

The fact remains that the Congress Government has become very insensitive to what people are saying. That is why people are reacting to the situation in the manner they are doing. It will be in the best interests of parliamentary institutions and in the interest of strengthening those institutions if the Government instead of making a fetish of whether the constitution allows it or not, whether they have a majority or not, realize that there is a situation now delay in solving which can only add disgrace to it. If they act, and act with grace, the only solution left in Gujarat today is to dissolve the Assembly. If the Congress Government thinks that

it is the opposition, the goonda elements, it is this political party or that political party which is cashing in on the miseries of the people, that will be known within six months.

Therefore, the best advice which can be given to the Congress Benches is that because the people's demand has become identified with the dissolution of the Assembly, they should not stand on constitutional procedures. There are precedents available. What did they do in Kerala long long ago? At that time, they acted on their own. At a certain stage when a certain legislature or a certain system loses the sanction of the people, that is the time when you must act. Even if this Parliament loses the people's sanction, even though the Congress may be in full strength, the Congress will lose the right to rule the country. Such a situation has arisen in Gujarat and demands appropriate action.

Why it is that in Gujarat alone the people are demanding dissolution of the Assembly? There is discontent in other parts of the country also. Obviously, there is much more to be seen than that at the face of it.

March, 1974

Delhi's Follies in Kashmir

SHRI S. A. SHAMIM (Srinagar) : My State of Jammu and Kashmir is charged with two accusations generally; one that it is getting liberal aid and subsidy from the Centre and another that it enjoys a special status. I plead guilty to both the charges, but I would like to ask the Finance Minister in particular whether he has any idea of what is happening to the money which is being given to the State of Jammu and Kashmir. If you get the figures of aid, loans and subsidies which the State received so far, the hon. Finance Minister and the Members of this august House will be convinced that most of this money is going down the drain.

One piece of evidence which I can place before the House is that when a Commission of Inquiry was appointed against one of the former Prime Ministers of the State, it held that this particular Prime Minister had made tons of money out of the

money which was got from the centre as aid loan. I would not like to name him here. Mr. Chavan knows him very well. This is exactly what is happening to the money.

You will get an idea of what is happening there from the fact that all the industrial estates which we had constructed there are being occupied now by the Central Reserve Police. By no stretch of imagination can the Central Reserve Police be called an industry. The Prime Minister two years ago launched a very intensive campaign of industrialization of Kashmir, but upto this day there is not even one employment oriented Central project that you can talk of in the State.

Another charge against the State is that it is enjoying a special status. It is enjoying a special status in the sense that the State has had no free elections during the last 24 years. Another special status is that the State Government has been empowered to pass Preventive Detention Acts and other Security acts whereby they can detain people for two years without any enquiry. Thirdly, when a Commission of

inquiry declares a particular gentleman to be accused, to be charged with having misused funds, that particular gentleman becomes the congress candidate for that particular constituency. It is interesting to know that the former Chief Minister who is disqualified for standing in the assembly election is qualified for standing for Parliamentary election and representing the Parliamentary constituency. I am one of those who supports special status for Kashmir, but not his special status which the Central Government has given.

I would request two probes to be made. First is about what has happened to the money which has been pumped into Kashmir even at the cost of the tax-payer in the rest of the country, whether this money has been properly utilized and whether it is not going to certain corporations. In Great Britain they have got the BBC- British Broadcasting corporation. In our part of the country we have also a BBC- Bakhshi Brothers Corporation. Let us see that, when this corporation has already misused so much of money, more money is not in any way given to another corporation, whether it is the Sadiq or the Qasim Corporation.

MR. DEPUTY- SPEAKER : The hon. Member may confine himself to the Budget.

SHRI S. A. SHAMIM : This is directly connected with the Budget because money is being provided in this Budget also. My apprehensions are that we will either create a BBC or create such services which ultimately hijack a plane to Pakistan. It is interesting to know that the person who hijacked the plane to Pakistan was a regular employee of the Border Security Force. Therefore, this has to be looked into as to what exactly we were doing in Kashmir. If we treat the BSF and the CRP as an industry, at least let us rationalize this industry. So, my request will be: special status, yes, but special status which can bring benefits to Kashmir. It should not be specialized by a few individuals who are darlings of some one or other.

The problem of educated unemployed in Kashmir is assuming dangerous proportions. The valley is isolated from the rest of the country. The result is that the educated youth do not find ways and means of getting out of the valley and the atmosphere in the country is not sufficiently

conductive to encourage them to come out. Something has to be done. Some Central projects which are employment oriented should be started in Kashmir. We are starting television and other projects. Something which would give employment to the educated youth, to our technicians, to our engineers has to be started, but no such thing is being done. I would make a special request to the hon'ble Finance Minister that he looks into the matter. He should rise above petty party or political consideration. He should give Kashmir a decent life, a clean administration and a cleaner political set-up.

1971

War – A dangerous option

SHRI S.A.SHAMIM (Srinagar): Mr. Chairman, Sir, the defence of a country essentially, basically and ultimately is the extension of its external affairs and to that extent they supplement and complement each other.

At present India is facing the dilemma of Shakespeare's Hamlet — To do or not to do, to go to war or not to go to war. It is an irony of fate that a pacifist like Jaya Prakash Narayan has started talking and working out the arithmetics of war. One of my friends just now sarcastically said that it is an irony that one of the former Commanders-in-Chief talks about the futility of war while Jaya Prakash Narayan the greatest of the pacifists, is talking about the utility of war. To my mind, the only reason that explains this contradiction, is that Jaya Prakash Narayan, that eminent Indian, has read about war while Gen Cariappa has led a war. Cariappa knows what it means to go to war while Jaya Prakash Narayan has seen a war film and has read about it and heard about it.

Sir, I am not opposed to the general state of preparedness in the country. Let us prepare ourselves.

SHRI SAMAR GUHA : Cariappa fought for imperialists.

SHRI S. A. SHAMIM: For once listen, Mr. Samar Guha. Let us not talk about war because war does not mean more of money or less of money. War means more of human misery and not less of it. If anybody could convince me that war has solved or war can solve any problem`I shall say that this country should go to war. Going to war needs courage but not going to war needs much greater courage. To that extent `I think `the prime Minister was right when she said that one does not wage war because of financial considerations and I think that is a word of caution.

Let us not be cowards. Let us accept the realities. All our sympathies are with the Bangla Desh people and for their movement. But, as one hon. Member put it rightly, it is the people of East Bengal who have to win that war and who have to fight Yahya Khan. Our moral sympathies are with them. But let us not talk of war.

I must say that in this context Kashmir is one of our most vulnerable parts as far as our defences are concerned and when I talk of vulnerable, I am not talking of the hilly passes, which are easily

accessible to Pakistan. It is part of our ideological war. Kashmir is not a question of territory alone which we want to retain or secede. It is our ideological plank. It is our ideological basis. With the BanglaDesh movement in East Pakistan, Pakistan lost its ideological basis. Therefore, the defence of Kashmir should be given the topmost priority and in the defence of Kashmir, only the military preparedness is not sufficient. May I take this opportunity to inform the Hon. Defence Minister that all is not well as far as Kashmir's defence is concerned. One of my friends talked about the civilian population being the greatest bulwark against any aggression. The people of Kashmir have shown not once but thrice that they can resist the propaganda machine of Pakistan which has been invoking the name of religion, Quran and Islam. That is the Kashmir People's contribution to the defence preparedness.

It was suggested yesterday that the headman cannot be trusted, that the people of Kashmir cannot be trusted. May I remind you, Sir, that the people of Kashmir, essentially, basically and initially, have defended Kashmir against Pakistani aggression? Who could have saved Kashmir in 1947 when the Pakistani marauders were knocking at the doorstep of Srinagar? It was the people of Kashmir. Much has to be done for the people of Kashmir. We must win their confidence. We have to enable them to participate in the democratic life

of the country and that will keep them satisfied. Then they will act more effectively than the armed forces. But something strange has happened. We have been supplying Pakistan with leaders for subversion from Srinagar jail. I think this august House knows that Maqbool Butt, one fine morning, ran away from the Srinagar Central Jail. How is that who was condemned to death runs away from the Srinagar Central Jail, not only runs away but crosses the borders within 24 hours? This needs high-level probing. Don't put things under the carpet. The policy of the Central Government has been mortgaging Kashmir to one or the other. It was mortgaged to Sheikh Mohammad Abdullah, and then no voice was heard except Sheikh Abdullah's. Then it was mortgaged to Bakshi Ghulam Mohammad, "the greatest of all patriots," and no other voice was heard. Now it has been mortgaged to Ghulam Mohammad Sadiq and no other voice will be heard, because we have mortgaged Kashmir to Ghulam Mohammad Sadiq. But, if you really want to build the defence of Kashmir, Kashmir will have to be mortgaged to the people of Kashmir.

Some very important historical opportunities have been missed where we could have educated the people of Kashmir. The task of educating the people of Kashmir that India is a secular democracy is mine, and I must admit that my task

has become difficult by certain acts of the leaders of the Central Government and the State Government. Democracy in Kashmir is not meant for Sheikh Mohammad Abdullah and Mirza Afzal Baig alone. If they do not 'deserve' the democratic freedom, how about the rest of the people of Kashmir? I hope you know that in this House, Bakshi Ghulam Mohammad complained that his candidates were not permitted to contest elections. What I want to say is this. My emphasis is only this: Win the confidence of the people of Kashmir.

Sir, who does not know that the recent hijacker of Fokker Friendship was none but an employee of B.S.F? The Kashmir Chief Minister protested that we got this information of hijacking attempt 3 months before; we wanted to interrogate Hashim Quereshi, the hijacker. But the Central Intelligence did not permit us. What is wrong? A high-level probe should be ordered. Even when they had got the information 3 months before, and one of the employees of BSF was a hijacker, why was it not possible to prevent it? Is it not possible that Pakistan has infiltrated into our Border Security Force? As I said earlier, the question of Kashmir should not be treated as a law and order question, not even as a defence question alone. The over all picture should not be forgotten. The people of Kashmir feel, and genuinely feel, that they are not part of this great country. By either instincts, by their ideological commitment towards the ideal of

secularism and democracy they would like to feel so and they must be made to think so.

War should be the last resort. India is a great country; India is a country of Gandhiji. Some people say, Gandhiji would have permitted war. Please do not invoke Gandhiji's name. Gandhiji was the last person to talk of war. We would have found Gandhiji in Bangla Desh today facing Pakistani bullets rather than talking of war. War does not mean conquest of territory. War means committing the whole nation, the whole country to disaster with unknown results. Some people suggested that it will take 3 months. I do not know how they calculated. War is something which destroys all calculations and sometimes the calculators. Therefore, let us be on guard. While talking about war do not forget that we did not achieve our freedom, we did not fight election, we did not commit ourselves to democracy, only because we wanted to acquire some territory. We have some ideals before us. We say, garibi hatao. We have not exhausted all our avenues and Pakistan today stands condemned by the entire world community. America has given armaments, but the New York Times, which is the voice of the people of America wrote against it. all the 4 Members who visited, condemned Pakistan. All the Parliamentarians of the various countries have condemned Pakistan.

Mr. CHAIRMAN: The Hon. Member has exceeded the time; he must conclude.

SHRI S. A. SHAMIM (Srinagar)**:** I am just concluding. India has achieved already a moral victory and if we persist with this peace offensive I am sure about our victory, BanglaDesh will also win. Thank you.

July, 1971

Sanctity of Fundamental Rights ---(I)

SHRI S. A. SHAM1M : Sir, the disadvantage of being called at the fag end of the day is, most of what I had to say has. been said by others and I might only be repeating what they have said. In any case, I will try to put the issue from the point of view of the common man. Several members have quoted Justices and Chief Justices and all those who have committed injustices. Some of the members tried to work out the arithmetic as to how many were for it and how many against. I do not think that is the correct approach. That is not the issue before us. My contention is, even if all the Justices and Chief Justices together had debarred this Parliament from amending fundamental rights or any article of the Constitution, this House should have risen in protest and resolved that this right belongs to the people and to Parliament and it should be restored. Without worrying as to how many voted for it and. how many against, I say that this right of amending the Constitution lock, stock and barrel, belongs to the people and it should be restored to them.

The issue involved is, can this present generation bind .the future generation? The answer should be a very clear and positive no. The same applies to the older generation. However patriotic, wise and foresighted they were, they could not have bound the present generation which has come after the constitution was promulgated. This position that Parliament is supreme and fundamental rights can be amended has been there since 1951. It is very intriguing and peculiar and it needs investigation as to where were these self-appointed, nay, nominated champions or *chumchas* of minority, nay, microscopic minority, defending the rights of minorities all these years? Doubts have been cast that this power may be misused or abused. You cannot bind the whole nation out of a complex of fear, born out of nothingness, fear born out of lack of faith in you and in the people. The whole question which was debated in 1951 is very much relevant today. I salute Golaknath, son of Bolanath, resident of Punjab, for having taken the issue to the Supreme Court and got the verdict. Whether this injustice was perpetrated by the Chief Justice or the other Justices is not relevant, but a very relevant issue was raised. As was pointed out here by those who have spoken before me, immediately after this judgment was pronounced Justice Subba Rao has been taking this issue to the streets and he has been speaking in public. If he had pronounced his judgment and kept quiet, that would have been a

right course which a judge could have taken. But it seems that he is committed to such an extent that he is advocating something which the people have already rejected.

It is being said that the Constitution has been amended a number of times. I ask, what is wrong in amending the Constitution a number of times? Is this the only Constitution which is being amended in the whole world? If the Constitution is amended so rapidly, that only indicates that social changes are taking place at a greater speed. How is it that the Swiss Constitution was amended only 11 times during the first 50 years whereas it has been amended as many as 37 times during the last fifty years? The difference in number clearly shows the changes which have to be reflected in the Constitution by amending it properly.

The word 'sacrosanct' has often been used. What is sacrosanct here? I do not think any thing other than divine books is sacrosanct. And, mind you, there are people who challenge even the divine books. And this is a constitution which has been made by human beings. Our Constitution was made by a Constituent Assembly which was not as much representative as this House. That Constituent Assembly gave us this Constitution. How is it that at a particular time we say that this was given to us by our forefathers, we cannot change it; whether it is inconvenient to us or

harmful to us, whether it troubles us or not, we have to put up with it because it is something which has been given to us? This status is given only to divine books and nobody has claimed that right for this piece of Constitution, howsoever sacrosanct it may be relatively.

Shri Atal Bihari Vajpayee, Shri Frank Anthony and many others are also not opposed to change in fundamental rights. Even their mentors, Justice Subba Rao and Justice Hidayatulla are not opposed to the change; they are only opposed to the mode of change. How should we change it? It is not a question of five judges on one side and six judges on the other; it is five judges and Parliament on one side and six judges on the other. Parliament and five judges decided that it will be changed by changing, if need be, article 368.

Now, as a student of law I have gone through all the articles of the Constitution. Of course, I am not as great a Barrister as Shri Frank Anthony. I have not that much time to practise because I have to contest the election, go to the voters and try to persuade them. So, I do not get enough time to go to the court. While I am not as good an advocate as Shri Frank Anthony, as a student of law I do not see any conflict in articles 13 and 368. The conflict arose because of an erroneous interpretation by one judge.

When this House makes a mistake it has a right to correct itself. But when the Supreme Court makes an error, do you think that error should be accepted as a reality, as truth? There must be' some opportunity provided some where to correct even the Supreme Court, because the Supreme Court judges are not infallible as Supreme Court judges, as the advocates of the Supreme Court seem to think. Therefore, this right which has been denied to us *for* the last two years, the sooner it is restored to the parliament the better it would be in the interests of the people and the democratic institutions.

Dr Ambedkar has been quoted as also Pandit Jawaharlal Nehru. I have a hunch that in 1951 when in Sankariprasad case the Supreme Court by a unanimous decision held that the fundamental rights can be changed, this issue was not brought before Parliament for one reason. Because, at that time all those who framed the Constitution were present in the House and they would have clarified what they had in mind. So, this was not done then. This issue was raised in 1967. and remember the circumstances in which it was raised. Justice Subba Rao imported a political theory of "thus far and no further". He said he will not allow Parliament to go beyond that. Even Justice Subba Rao says that the people are supreme. At least he says so. Then, is the Parliament which is the representative of the

people not supreme? Now, as the judgment stands, Parliament is not permitted to do anything. There is nothing which parliament can not do.

This is true of that Parliament. This is true of this Parliament also. There are only certain self-devised checks which we have opted for. Otherwise there is nothing. We can scrap the whole constitution and frame a new constitution. This Parliament has an inherent right to change the fundamental rights. What are these fundamental rights and who is supporting them. It is very important. A particular lobby is supporting them. A rikshawalla or a person who has been sleeping on the footpath for the last 20 years does not know that he has a fundamental right to speech, that he has a fundamental right of property because his only property is footpath and he thinks that it is safeguarded in any way. My learned friend, Mr. Frank Anthony, represents only a microscopic minority. There is no Constitution which can guarantee minorities safety, right and protection. There is only one Constitution and that is the Constitution of the people's will. After partition it was within the power of the Constituent Assembly to declare Bharat as a Hindu Rashtra or a theocratic State as Pakistan has done. What prevented them. There was no Constitution at that time. No Supreme Court gave a ruling that character of the

constitution should be secular. It is inherent strength in the people that will protect our rights. I want to say as a spokesman of the minority that they should not be led away by this talk. Our only guarantee and protection is the goodwill of the majority because these rights will not benefit Hindus, Muslims, Sikhs or Anglo-Indians. These are going to benefit Indians, as such, the labourers and the down trodden. Therefore, it is important that minorities do no become a party in this issue as minority. There is only one minority and one majority. Minority which has assumed the character of majority — the exploiters — who are very small in number but who subjugate a majority and that majority is exactly the minority which must be protected from that minority. I want protection. I do not want minority rights because as I said they are inherent in the basic policy of the country. I want protection from that minority which by dint of force, by hereditary characteristics and character — good character and bad character — both have assumed full strength of power and have nullified the democratic institutions. This majority of teaming millions of people should be protected from this minority. I will conclude by quoting the famous architect of the Indian Constitution no less a person than Shri Jawaharlal Nehru.

"No Supreme Court and no judiciary can stand in judgement over the sovereign will of Parliament

representing the will of the entire community. If we go wrong here and there it can point it out — but in the ultimate analysis, where the future of the community is concerned no judiciary can come in the way — And if it comes in the way — ultimately the whole Constitution is a creature of Parliament — Therefore if such a thing occurs — they should draw attention to that fact — but it is obvious that no court no system of judiciary can function in the nature of a third House – as a kind of third House of correction."

The country was not freed because a few Supreme Court judges will convert themselves into third Chamber. We owe it to our martyrs that this country will be free and not free at a particular point of time. This country will be free to shape its own future and let us not bind future generations. That is why I am supporting this Bill. Thank you, Sir.

August, 1971

Sanctity of Fundamental Rights ---(II)

SHRI S. A. SHAMIM (Srinagar): I am glad that this august House is making the fundamental rights touchable. They were declared to be untouchable by the Supreme Court and this august House restores the respect that we have for the fundamental rights.

Shri Atal Bihari Vajpayee has asked for a referendum. My humble request to the ruling party will be that his demand should be accepted, of course not in the manner in which he is asking. I, on behalf of the ruling party, accept this challenge. He does not accept the referendum of March 1971. I give him a date when we are going to have a referendum, that is, February 1976. Then it will be open to Shri Atal Bihari Vajpayee and Shri Frank Anthony to make an issue of this as to whether this Parliament had the right or not. I assure him that if the people vote for Shri Atal Bihari Vajpayee, the ruling party will not be there and Atal Bihariji will be there.

SHRI ATAL BIHARI VAJPAYEE: But there will be no elections to Parliament.

SHRI S. A. SHAMIM: There will be elections to Parliament. If Shri Atal Bihari Vajpayee has lost faith in 1976 also, I cannot help.

My amendment is that if this parliament decides to abridge fundamental rights, it should be ratified by half the Legislatures in the country. Now that it is amply demonstrated that the people are for a change – and it is proved here in this House that an overwhelming majority of the people are for a change – let us anticipate that the people will express themselves in the elections to be held in 1976 and will give you a majority in the states as well. Therefore there should be no hitch or apprehension that this amendment may not be supported by half the Legislatures. This recommendation was contained in the report of the Select Committee on Shri Nath Pai's Bill. India, having a federal Constitution, and being a federal polity, let the people of the States be also associated with it.

MR. SPEAKER: That is already provided in the Constitution.

SHRI S. A. SHAMIM: Not for the fundamental rights. That is not necessary as far as the fundamental rights are concerned.

MR. SPEAKER: For this amendment of the Constitution.

SHRI S. A. SHAMIM: Not as far as fundamental rights are concerned.

MR. SPEAKER: Of course, not for that. But this one will go to the States.

SHRI S. A. SHAMIM: This will also give the states a sense of participation in this important change. Therefore, this amendment of mine should be accepted.

August, 1971

Kashmir

Dialogue – The only Course

SHRI S. A. SHAMIM (Srinagar): Mr. Deputy-Speaker, Sir, let us thank the President for the speech written in his name by a few bureaucrats, approved by a few autocrats and applauded by a host of turncoats.

The President delivered his speech with great vigour and gusto, and we must admire his performance. Unfortunately, he referred to everything under the sun excepting the most relevant and distressing features of our political situation at the moment. He referred to Andhra in passing without indicating as to what is the solution which Government intends to offer to this burning problem. It is unfortunate that he did not analyse or he did not even hint at the climate of violence which is generated in this country and for which one party alone, that is, the ruling party is responsible. The sheer logic of the way Government of India is behaving has created an impression that this Government which was brought to power by a massive mandate understands only one language, the language of

violence. Violence does not erupt for nothing. It is not that people are seized of a mad instinct to destroy property. What happened in Andhra? Andhra was peaceful. Six months ago, an objective situation existed there. The Prime Minister and her colleagues with their prides and prejudices did not want to recognize the realities of the situation. That is what has given rise to such vast destruction of life and property in Andhra. It was a French student who said a few years after the disturbances: we had to burn a few buses and buildings so that they should take notice of us. This is exactly what the Government of India is telling the people: we will not listen to you howsoever reasonable and justified your demands unless you destroy railway coaches and buses and buildings. Every time there is an abatement of the movement in Andhra Pradesh, the Congress leaders come out with the statement that the movement has fizzled out because there is less violence. It is the Congress Government which has lent respectability and legitimacy to violence. It is unfortunate that the President has not referred to it.

In this context may I refer to the State of Jammu and Kashmir. There is a conspiracy of silence in every corner as far as the state of Kashmir is concerned. Neither the Members nor the parties in opposition nor the ruling party mention Kashmir, the reason being in Kashmir there is no violence. There has been a very healthy, significant

historical development about the situation in Kashmir. We thought of a final solution to the problem of Jammu and Kashmir when we were talking to Mr. Bhutto of Pakistan. The Jan Sangh made a hue and cry of the final solution the Jan Sangh did not understand. I did understand. The final solution, not vis-à-vis Pakistan but a final solution vis-à-vis the people of Jammu and Kashmir. The fact has been recognized that the people of Jammu and Kashmir are not as happy or satisfied as they should have been and it was understood that a dialogue would start with the accredited leaders of Kashmir and this problem would be finally solved. A dialogue did take place and Mrs. Gandhi after having met Sheikh Abdullah talked of opening a new chapter. But that new chapter is a blank and it has been a monologue that has been going on. Sheikh Abdullah and Mirza Beg have made their position clear; they accept the reality of accession and the finality of accession. There cannot be a happier news for the country than this. What has been the response from the Government. The response has been this. The Vice Chancellor of a University, for whom I have great respect, has been allotted a tutorial; he would take a tutorial period with Mirza Afzel Beg and Sheikh Muhammad Abdullah. The Government of India does not even recognize the fact of dialogue why? The most popular, accredited leader of Kashmir says: I have to accept the realtity of accession; I say that Kashmir should continue to be part of

India. But there is no response because there is no violence in Kashmir. If tomorrow there is violence, the way we have in Andhra, Mrs. Gandhi and her colleagues would sit up...

SHRI PILOO MODY: The movement in Andhra is not violent....*(Interruptions)*

SHRI S. A. SHAMIM: Whether it is the CRP people or the police people there, it is for Mr. Mody to judge.

SHRI PILOO MODY: The only miscreants in Andhra are the CRP and the police.

SHRI S. A. SHAMIM: ...And a few who are not interrupting me. It was imperative; the Government understands only the logic of violence. Unfortunately for us who are in Kashmir, there is no railway property to destroy. Railway has been extended up to Jammu & the Jammu people are not interested in accommodating the leaders of Kashmir. It could have been very good news for the whole of the country. I do not think that the situation will remain as it is. The possibilities are that the people of Kashmir will get restive. The Govt. of India does not understand the language of peaceful dialogue and has more or less shown complete indifference to all our leaders have been saying. I should like Mrs. Gandhi to show more of courage. It is all right, Mrs. Gandhi has prestige, pride, everything. But it is not greater than country's prestige or honour. Should she not solve this problem for all times to come? This is

the most auspicious occasion and it is time that Mrs. Gandhi starts a dialogue at her own level. Non-Political vice-Chancellors, however well intentioned they may be, cannot solve a very knotty problem which has resulted in a war with Pakistan. The situation in Kashmir appears to be very peaceful actually. There has been talk of separation of Jammu from Kashmir. Separation of Andhra is not going to be the last. There are people who are deeply interested in upsetting the conditions in Kashmir. They have been talking of bifurcation of Jammu and Kashmir. The author of this theory was Dr. Karan Singh, who happens to be one of the important Ministers in Mrs. Gandhi's cabinet.

I am glad Mrs. Gandhi is in the house and I want to repeat what I said earlier. The dialogue going on between Sheikh Abdullah and Mrs. Gandhi's emissary should be taken up at the level of the Prime Minister and Sheikh Abdullah himself. This is very happy news that Sheikh Abdullah has recognized the realities of the situation. I have a vested interest in this because I have contributed my bit in making the Sheikh realize the realities of the situation. After all what is he asking for? He is asking for nothing more, nothing less than what has been given to him by the founding fathers of the Indian Constitution, namely, internal autonomy within the framework of India, within the Indian Union. India is a vast

country and the people of Kashmir acceded to India in spite of the fact that Pakistan was coaxing the people of Kashmir with Quran in their hands and trying to persuade them through religious bigotry and sentiments. We should be given credit for it. Our act of faith should be recognized and we should not be treated with contempt. Mrs. Gandhi has shown courage. But courage has no boundaries. Every time there is a new challenge, it has to be met with courage. Mrs. Gandhi must realize that this opportunity may never come. You can today ignore Shiekh Abdulah but once he is no more on the scene, the new generation will not understand the language of secularism and the language of Jawaharlal Nehru and Mahatma Gandhi. It is high time you made use of the man who has fought shoulder to shoulder with you in the freedom struggle. You are today sending an SOS to Mr. Subba Reddy, you are inviting him, pocketing your pride because he is threatening to create havoc if Andhra is not separated. You only listen to the language of threat. May I remind you that the stage has come when we should understand the language of peace and understanding. I will be grateful to all the leaders of the opposition also if they break this conspiracy of silence and speak out the way they are speaking, about Andhra and Tamil Nadu and other States. Simply because Kashmir has been given a special status, there is this conspiracy of silence. It is time the people of Kashmir are taken into confidence

and they are given a representative Government. I must take this opportunity of expressing my gratitude and sincere thanks to Syed Mir Qasim, the Chief Minister. He has really broken new ground and tried to normalize the atmosphere. For the first time in the history of Jammu and Kashmir there were fair and free municipal elections. What has been done in the case of municipal elections, I am sure, will be done in the case of Assembly elections. And, let us hope there is going to be fair and free election for Parliament also in Jammu and Kashmir.

With these words, I would like to conclude by saying that the people of Kashmir are looking forward to a fruitful dialogue between Sheikh Abdullah and Mrs. Gandhi.

Feb. 1973

Perks and Priviledges of MPs

S. A. SHAMIM: I am opposing the motion at introduction stage.

Mr. Deputy Speaker: You ought to have given notice.

S. A. SHAMIM: I have sent, I have written to the speaker this morning.

میں اس بل کی مخالفت ساحرلدھیانوی کے اس مشہور شعر سے کرنا چاہتا ہوں جو اس نے تاج محل دیکھ کر کہا تھا ؎

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

Mr. Deputy-Speaker: Mr. Shamim, sit down for a minute.You are entering into the merits of the Bill.I am not shutting you out, but,please Listen to me. All these arguments are against the Bill iself.Now,we are concerned only with its introduction. Have you any ground, constitutional or legal, which would prevent this Bill to come

before the House? What you are saying from what I understand, is that you are opposing the contents of the Bill which you can do when the Bill is taken up.

SHRI S.A. SHAMIM : I must speak in English. Obviously, you do not understand the language, which I am speaking. The Rule Book does not say legal or constitutional, at least the one which I possess. My objection to the Bill is that this is obviously to malign the MPs and the motives are playing to the gallery and cheap gimmickry. All these privileges, when calculated in terms of money, are absolutely nothing. I get a salary of Rs….

MR. DEPUTY SPEAKER: This does not change what I have said that you are entering into the merits of the Bill. You are entitled to these views, but at the stage when the Bill is taken up for consideration. Now, we are concerned only whether this Bill can be introduced or not.

SHRI S.A.SHAMIM : Whether this Bill should be introduced or not? In any case, this is going to be put to vote. I am opposing this Bill on principle.

MR. DEPUTY SPEAKER: Please sit down. Kindly understand me also. The question of whether the Bill should be introduced or not is the responsibility of the Committee on Private Members Bills and Resolutions. Here, we are concerned only with whether the Hon. Member has

any legal or constitutional objection to the Bill being introduced. What the hon. Member is saying is that..this Bill is not right, is not proper and therefore, it should not be accepted. That is the burden of his argument.

SHRI S. A. SHAMIM : You have not unfortunately seen what the rule says. The rule-book only says that if any Hon. Member wants to oppose the introduction, he may do so, and leave it at that. The heavens will not fall if you bear with me for a few minutes. I shall try to explain that this Bill has a motive, namely that the Member of this Parliament should be brought into contempt before the people. His case is that the Members are drawing allowances, and if you care to read the Statement of Objects and Reasons, you will find that it says:

" The Members of Parliament enjoy a spectrum of privileges and allowances."

This is not charity. These privileges are there because we are supposed to perform certain function. Why not introduce a Bill providing that Members should have no salary and they should not have any allowance?

All these days, we have been trying to raise the issue of price. The two Maharajas who intend to move this Bill.

DR. KARAN SINGH : There are no Maharajas now.

SHRI S.A. SHAMIM : I am sorry. I am referring to the two ex-Maharajas who want to move this Bill. The rise in prices applies to MPs as well as non-MPs. I want to submit before this House that an MP is as adversely affected as the common man. After all, all of us do not have a private income as these Hon. Members have. Actually, they do not need any allowance, and they should come forward and say that they do not want any allowance. Dr. Karan singh was telling me that he was not drawing any allowance. The nation is grateful to him (interruptions.) It should be credited to the National Defence Fund. Only to win cheap popularity these ex-Maharajas have turned socialist, they want to decrease the allowances and put income-tax barriers. My humble submission is that this is not just and this is putting Hon. Members who have been talking about socialism etc. to a very difficult test.

MR. DEPUTY SPEAKER : I think the Hon. Member has made his views quite clear....

•

SHRI S.A. SHAMIM : I have just started. This is going to affect your salary also. Once this is accepted, it is going to affect all of us, and once this affects our allowances, it will affect our functioning, and once it affects our functioning, the whole parliamentary democracy would be in

danger, and, therefore, my plea is that this Bill should not be allowed to be introduced.

DR. KARAN SINGH : I would very humbly like to place before the House that it is not my intention at any stage to bring the House into contempt with the people. However, I do feel that since the country stands to oppose all kinds of privileges, it is necessary that we in parliament and that includes me too, because when it comes to ex-Princes and Members of Paliament, it does not exlude us. We should all practice what we preach. It is because of this that I had expected that the House would have applauded this Bill. I am not opposed to sums of money spent...

SHRI S.A. SHAMIM : This is a Bill with a vengeance.

SHRI HEMENDRA SINGH BANERA (Bhilwara) : He has received crores of rupees by way of privy purses all these years without any income-tax. (*Interruptions*).

SHRI S.A. SHAMIM : My telephone bill is Rs. 1,000. I am a poor Member; I have no private income.

MR. DEPUTY SPEAKER : Shri S.A. Shamim has made his point clear already. Now, let us hear Dr. Karan Singh.

DR. KARAN SINGH : I do not know why the Hon. Member is so apprehensive, because if his slab of taxation is more.... (*Interruptions*).

MR. DEPUTY SPEAKER : Order, Now, let us hear Dr. Karan Singh. I shall put the question before the hon. Members and it is for them to decide.

SHRI S. A. SHAMIM : The great marksman has missed his mark.

Feb. 1973

Darkness of Emergency—(I)

SHRI S.A. SHAMIM (Srinagar):

Mr. Chairman, Sir, the darkness which started at the noon of 26th June is becoming deeper and deeper and, if any proof is needed, the proof can be found in this August House, Indian Parliament. Having heard a few speeches in support of the amendment to the MISA, I am convinced that certainly this is going to be the last free session of Parliament of course, free within, not free without. Whatever is happening will be known to a few Members of Parliament. The Opposition has been got rid of. There is no question of dialogue, Minister proposing, Members agreeing and pieces of legislation getting passed.

Sir, when this House passed MISA, at that particular point of time, it was for smugglers. In this very house, the Hon. Member who has now chosen to support Mrs. Indira Gandhiji and 'her

Government due to domestic compulsions asked Mr. K.C. Panth who was piloting the Bill then, "Please give us an assurance that this MISA which has become the Messiah for this Government will not be used against political leaders". I remember, Mr. Pant saying, "I assure you, this is a positive assurance that this MISA will never be used against political parties or political leaders." He did not qualify it at that time. Normalcy was not to be defined by the Minister of State for Home Affairs or for that matter the Prime Minister. I am referring to a historical event and the record of the House bears witness to that. Once we conceded that in the case of smugglers, then it was left to the caprices of the Government that it would be used against political parties and political persons.

The other day, Mrs. Indira Gandhi said, "We have made very selective arrests. The total number of arrests may be one thousand but there are only one hundred political persons under arrest." The Opposition parties also wanted a selective head. They wanted the head of Mrs. Indira Gandhi. They did not want the heads of all party leaders. Some times, by being selective, you destroy the basis. You have arrested all those who opposed you. I did not oppose you. Therefore, I am free. I do not know what will

happen now. For the last three days, according to you and according to Mrs. Mukul Banerjee, I have violated all laws. Therefore, I do not know what is going to be my fate now. In the name of selective arrests, all these articulate Members of Parliament, all those who opposed- Mrs. Indira Gandhi and her Government, have been arrested. She says, "I have made very selective arrests."

Now the Members on the other side and unfortunately, some Members on this side also stand up and say, "Well done, Madam. More of it." This is how freedom comes to an end. When freedom comes to an end, you never know what will be the next step.

The first casualty was a free press. I was hearing Mr. Indrajit Gupta saying, "Punish the *Hindustan Times* with retrospective effect". Why? Because the Editor of the *Hindustan Times* wrote a particular editorial on 25th June. Not that he violated any Emergency law. It is because he wrote a particular article saying that Mrs. Indira Gandhi should resign. Therefore, he said the Editor should be punished retrospectively. The Editor of the *Hindustan Times* does not have the right to reply to Mr. Indrajit Gupta, within or without you would like to hear only one voice, and that is your own voice; and this is where the end of democracy starts.

Sir, about freedom of the press a letter has been written to Prime Minister Indira Gandhi- the Prime Minister of the greatest democracy of the world. This letter has been written by some of those who have fought in the freedom struggle and the letter being addressed to Madam Gandhi, I hope there is no ban on my reading it out. This quotes Jawaharlal Nehru. There is still no ban on quoting Jawaharlal Nehru in this House but you cannot quote Jawaharlal Nehru outside. You can quote Jawaharlal Nehru's daughter but you cannot quote Jawaharlal Nehru.

AN HON'BLE MEMBER : Who said so.

SHRI S.A. SHAMIM: Shri V.C. Shukla: *(Interruptions)* After your theatrical performance, madam I was in tears. Let me recover now and say what I have to say.

Shri Jawaharlal Nehru, the father of Shrimati Indira Gandhi says :

"To my mind , the freedom of press is not just a slogan from the larger point of view but is an essential attribute of the democratic process. I have no doubt that even if the Government dislikes the liberties taken by the Press and considers them dangerous, it is wrong to interfere with the freedom of the Press. By imposing restrictions you do not change anything; you merely suppress the public manifestation of certain, things thereby

causing the idea and thought underlying them to spread further".

Instead of taking this advice of the father, by violating that advice, Mrs. Gandhi is becoming the instrument of spreading these very ideas she wants to suppress.

Shri Jawaharlal continues:

"Therefore, I would rather have a completely free Press with all the dangers involved in the wrong use of that freedom than a suppressed or regulated Press".

But, here, the *Hindustan Times* is to be punished because, on the 25th June, not knowing that emergency was coming, the editorial demanded the resignation of Mrs. Gandhi. Sir, I also should be punished accordingly because, on the 15th June, I had also requested Mrs. Gandhi to declare her intention of resigning. I don't know under which law I can be hauled up.

Then, Sir, Mr. Borooah and I met on the 14th June. Mr. Borooah the Congress President, came to me with Sheikh Mohammad Abdullah, the Chief Minister of Kashmir. He had a copy of the Times London in his hand. He said, "I don't read any other paper; they are trash". *The Times,* London, carried an editorial saying that the offences with which Mrs. Gandhi was charged were petty and under the English law they are no offences. On that

date, Mr. Barooah read the Times, London but from the 25th June these imperialist papers are not being read. Suddenly they have become imperialist newspapers. I don't know whether Mr. Barooah reads *The Times* London now or not; I am sure he cannot.

Mrs. Gandhi says that those papers are opposing her now, and describing what has happened in India as the start of dictatorship. Madam Gandhi, you are wrong. It was the Nixon Government which supported Pakistan, but the people of America, the *New York Times* and *Washington* Post and the people of America supported India. And, today the American Government is silent again, supporting what you are doing. It is the *New York Times,* the *Washington* Post and the *Times.* London, which are opposing you. Don't curse them when they criticize you. It is a free press; they can afford it. but don't try to put perverted logic before the nation because only your voice is heard.

Sir, the need for emergency now is not a justiciable question. Probably the President, in his wisdom, thought that an emergency arose. But where are you taking this emergency to? To which extent, to which limit are you taking it? you are taking it even to the limit that an ex-M.P, cannot enter the Central Hall, that Journalists cannot enter the Central Hall. This is the fear again that

Mahatma Gandhi's quotations are allowed in Parliament but they have been banned in the Press.

May I again remind this House of what Pandit Jawaharlal Nehru said about fear which Mrs. Indira Gandhi, Mr. Brahmananda Reddy and others are inculcating in the minds of the people?

"The greatest gift for an individual or a nation, so we had been told in our ancient books, was *abhay* (fearlessness), not merely bodily courage but the absence of fear from the mind. Janaka and Yajnavalka had said, at the dawn of our history, that it was the function of the leaders of a people to make them fearless. But the dominant impulse in India under British rule was that of fear- pervasive, oppressing, strangling fear; fear of the army, the police, the widespread secret service; fear of law meant to suppress. It was against this all-pervading fear that Gandhiji's quiet and determined voice was raised: 'Be not afraid'."

Without saying that this was said by Pandit Jawaharlal Nehru, anybody can apply this to the present state of situation, to the present state of affairs, in this country. You have the fear of the people, the fear of ex-MPs, the fear of the Pressmen, and yet, you say, 'People are with us'. I cannot understand this melodrama, your saying that the whole country is with you except a handful of people like Mr. Jayaprakash Narayan, Limaye and others. *(Interruptions)* I do not know what that

lady is saying. One lady has clamped emergency and another lady does not allow us to speak. There must be an end to ladies' caprices.

We are talking of the *Hindustan Times* being punished. The *Hindustan Times* may or may not be punished. But one criminal at large, Mr. Baburao Patel, who has been spreading poison in this country for the last 20 years, was arrested under the MISA and was then released because the authorities concerned thought after putting him in jail for 7 or 14 days he was purified. By this standard, Shri Jayaprakash Narayan, Shri Morarji Desai and the others also should have been released because if Shri Baburao Patel, a poisonous snake I would call him, can be purified by being put in jail for about ten days only, it is time that Shri Jayaprakash Narayan and all other leaders also were released.

Mrs. Indira Gandhi says that the fact that Parliament meets shows that there is democracy in this country. Mrs. Gandhi has the right to say so because there is no other voice to tell her that this is not the real Parliament, this is a mock Parliament which we used to arrange and stage in our schools and colleges. Excepting the Chairman, every body here is a mock-piece. If you were not in the Chair, Mr. Chairman, I would have said that the Chairman was also a mock-piece. Having arrested all those and not allowing them to come

here-members of the Opposition- she says that Parliament meets.

Nothing can go outside except the Prime Minister's speech and Mr. Brahamananda Reddy's speech, and yet, she says that Parliament meets and, therefore, democracy is functioning. Why is Mrs. Gandhi keen to maintain this façade of democracy? She used to be a very brave women; she used to be a great fighter. But this 'fear' seems to have gripped her now. Why is she keen to show to the world, particularly to the imperialist world, that democracy is functioning here. Why does she not say, "Democracy cannot function in this country; in this country we experimented democracy but we found sluggishness, we found laziness, we found people coming to office late, and therefore, we dispensed with democracy"? Why is she keen to show that there is democracy functioning here?

I was telling you that the shadow of darkness had deepened. I want to prove this to you. With this Amendment Bill, what is Mr. Brahmananda Reddy trying to do? I will only refer to one clause, clause 7, where it is said that the following section shall be inserted, namely :-

"No person (including a foreigner) detained under this Act shall have any right to personal liberty by virtue of natural law or common law, if any."

I am sure that Mr. Brahmananda Reddy does not know what he is saying in this. He does not know what is a natural law or a common law. I do not know about his educational qualifications, but obviously, he is not a lawyer, and if he is one, he must have passed through backdoor method, if he is a lawyer, this will be the saddest day for the country that a Law College had given him the Degree. *(Interruptions)*. He does not know what is a natual law and what is a common law. Natural law is a law inherent in nature. This is the result of thousands of years of the struggle of man that, irrespective of what is written in a Constitution or in the Penal Code, men have certain natural laws. The Common law is not peculiar only to Britain. We have our own common law based on customs and traditions. Mr. Brahmananda Reddy does not seem to be satisfied with changing the Penal Code. He wants to destroy the natural law and the common law. I am sure he does not know what is natural law and what is common law. If he were a law graduate or a barrister, then he would have tried to camouflage it as he has done a number of times, and he would not have so expressly put this idea, depriving the human beings of their natural law.

On 26th June, apparently nothing happened, but a system was destroyed. The system was a very sluggish system, a weak system, a defective system, but all the same it was a system. We knew

that after five years there are going to be elections; people will reject one party and accept another. On 25th June, we did not know what would happen on 26th June.

We do not know Mrs. Gandhi may be an honest lady, she may be the greatest of ladies the world has produced, but she has destroyed the guarantee and continuity of a system. Now onwards, it will be one man's word, one persons word, and that person can tomorrow decide and put Shri Brahmananda Reddy under arrest under MISA and Shri Brahmananda Reddy would have no appeal. Then Shri Brahmananda Reddy will like to speak from these benches, but these benches must have been closed. We may be the last of the Parliament; everybody must see us curiously and attentively. We are the last specimens; we will be preserved in a museum. Future generations will come and pay heavy tickets to see, who were the last Parliamentarians of the Parliament of India. I am not sure, if Shrimati Gandhi will find a place or not, but she will find a mention as one person who converted a living organism into a museum of historical importance. and had this piece of legislation. When Shri Brahmananda Reddy dies and I am sure he will die very soon not a physical death, I am talking of spiritual death-then I will get

these words engraved in the *shamshan,* "No person including an Andhrite or a foreigner detained under this section will have any right to personal liberty by virtue of natural law or common law".

I am exonerating Shrimati Indira Gandhi, because she told us. "I do not know the implications of law". She, therefore stands exonerated. She does not know, what she is made to sign Shri Brahmananda Reddy, I understand knows law. By destroying the natural law, he has destroyed the dignity of the human being he has destroyed the great culture of India, he has destroyed the spirit of Mahatma Gandhi and he has destroyed the philosophy of Jawaharlal Nehru. I consider this the black day in Indian history. The black day started on 25th June, but still the blackest day had to come and this is the day.

Sir, the other day, one Congress M.P. in the Central Hall was telling me, "Please put up with this for a few months. How does it matter if your speech does not go out and how does it matter if the press does not report it?" I told him that if it were for only a few months, I would have put up with it. The question is, once you get used to it for a week, you will like to extend it to two weeks, and when it is two weeks, you will like to extend to further to two years and ultimately you find it so convenient that you will like to keep it permanently.

All the arguments that were given, strangely enough, find a strange similarity with the diction and dialogue of all the dictators. I have never lived under a dictatorship except for forty days when I was in Pakistan. Therefore, I had no experience; I had read about it only. I find the same arguments, the same logic, being given by dictators every time they imposed dictatorship. And then they get used to it. They do find people-ladies like Mrs. Ray and lords like Mr. Parashar who support this without knowing that one day this axe will fall on them. So, presently the Congress Members, the Ministers and their wives and the Chief Minister and their wives extend full support not knowing for whom the bell tolls. Mr. Brahmananda Reddy and all others- this piece of legislation which is being passed against smugglers, I make a forecast that all of you one day will be arrested and the common man will know only that you are also smugglers.

So Sir, I oppose this Bill with all the vehemence and force at my command.

SHRI SYED AHMED AGHA (Baramulla): About the hon. Member, Shri Shamim who has just spoken, I would only say:

He has given me three impressions. First he thinks that he is wiser than the wisest. The other impression that he gave was that he is here to support the US imperialism and the US journalists. The third impression he gave me was that he was

very sad that the journalists who used to come to the Central Hall are not there now... *(Interruptions)* I did not disturb him when he spoke. Why should he disturb me now?

SHRI S.A. SHAMIM: Why did you not do it? That was your natural law.

MR. CHAIRMAN: It is very difficult. Mr. Shamim, please don't interrupt.

SHRI S.A. SHAMIM: Let him not speak about me. Let him speak about the Bill.

Darkness of Emergency–(II)

SHRI S.A. SHAMIM (Srinagar): Mr. Chairman, much is not to be spoken against this Bill because I am not sure whether the mover of the Bill is also as serious about the Bill. This, to my mind, is one of the most elusive pieces of legislation intended to be brought before the House. But I would like to make one submission. Probably the mover of the Bill has either forgotten, or is not aware, that during our freedom struggle this was the most effective weapon. I am told that he was a participant in the freedom struggle. Gandhiji's greatest contribution to the freedom struggle and to the new values which we cherish today is that he made us able to differentiate between violence and *satyagraha*. When you inflict wound or when the subject matter of the voice is somebody else, then it is violence. Satyagraha is a form of a sacrifice where you choose your own self to undergo some agony so that much good is brought about to the rest of the

people. In the case of *satyagraha* not only the person who undertakes it is benefited but the society in general and the people at large are also benefited. It needs great courage and a high degree of discipline to undertake a fast. Luckily there have not been many deaths due to hunger strike. I am reminded of only two which brought about so much good. Therefore, I do not think when we have reached a stage when we cherish the values which Gandhiji stood for – Gandhiji did not preach only but he was a symbol of doing what he preached- it will be a great violence to Gandhiji's ideals if we deprive the common man of the basic right of hunger strike which does not do any violence to any man but brings moral pressure on the officials. In a democratic set-up we must have the basic right of protest and one of the most civilized way of bringing pressure to the Government is to suffer yourself and not spread the suffering to others.

December, 1975

Darkness of Emergency---(III)

Democracy is a very inconvenient system for you. People talk against you, people oppose you but democracy has fundamental value in that ultimately the majority will prevail. But it seems that the present-day majority has taken this upon itself, not to have the inconvenience of a minority. This House is a witness to many dramas of the opposition. But the House has it on record that only that was passed which had the approval of the majority. How is it that in spite of what the opposition did, ultimately that piece of legislation has become inconvenient to you now? An illogical argument is being made that because of the emergency the efficiency has improved, the government employees attend office at 10 A.M., the efficiency in the railways has improved, and all that. By implication it means that this parliamentary system which has been there with us for the twenty-seven years has been wasting our time; by implication it means that this is a sort of 'useless organ'; by implication it means from the day you proclaimed the emergency, things have terribly improved. What is the logic of this

argument? You say, let us not have this facade of a parliamentary democracy, it impedes the progress of the nation.

And then let us go to the freedom of press. You have brought press censorship. The stalwarts who have fought for the freedom of press and freedom of the country today are trying to give justification for censorship by saying that if a certain rumor was allowed to be spread, the country would have collapsed. Indira Gandhi yesterday in her speech said that she was told that the sword recovered from the RSS office was a wooden sword and then she said. 'Either you have a sword or you don't have a sword'. This is true also of the freedom of the press. You either have a free press or you don't have a free press. It is not that you have only a press which publishes only what you want them to publish. The essence of democracy is that both the view points must be put before the people and the people in their wisdom must be allowed to judge what is right and what is wrong. You know what newspapers wrote in 1971 and yet people voted for you, they did not go by what the newspapers wrote.'The myth and the reality' did not change the situation. How is it that today the mere suspicion of a rumour from the opposition shakes the entire government? If this particular piece of legislation, this amendment, was brought in, in good faith, I would have supported it. But this is brought in, in bad faith.

You have declared war on the people of this country. You have brought this in just to denigrate the judiciary and the courts and the whole world knows the reason for this. You have no faith in the courts; you have no faith in the judiciary.

I have all the differences with Morarji Desai. I do not like one word of what he says in this house. The house has witnessed that on the day when he became the spokesman of the entire opposition, I stood up and said:"He cannot speak on my behalf " I have said that whatever respect I had for Shri Jayaprakash Narayan,when he presided over the *Jana Sangh* session I did not see eye to eye with him, I never supported him the moment he attended the *Jana Sangh* session and after his demand for the dissolution of the Bihar assembly. But I must tell you that I will never accept that he is a smuggler. Then why has he been arrested? In the case of Morarji Desai it seems he became a security risk; he was a smuggler. That is why he has been arrested.

What have you done today in the name of emergency? About the emergency, I agree that conditions were such that in truth drastic measures were called for. But against whom have you taken these measures? You have taken them against the whole nation. You have taken drastic measures against those people who are with you. You have swallowed up the freedom of those who respect the

laws. It is not justice that you should snatch away the rights of anyone because someone has done something you do not like. The heads of the big people in parliament, who used to make great assaults, were cut off in 1971.The people cut off their heads. Today again, if you had gone to the country and said these people do not allow the parliamentary system to work, you would have seen that the people would once again have given you a majority and would have turned down these people. But this did not happen.

This parliament may be the last parliament of this country. The evidence for this is that statement of Mrs. Gandhi in which it has been said pre-emergency normalcy cannot come back now. She has named that licence. The country in which one individual decides what constitutes normalcy,what licence, what freedom, on the gateway of that country is the sign of dictatorship.Mrs.Gandhi is not a dictator, but she has begun to walk the road to dictatorship. The greatest merit of dictatorship is that in the beginning principles are moulded with great care and excellence.They are moulded in beautiful words. Gradually people begin to find pleasure in them and then men tend to say that these are the principles of democracy. This happens not only here. In Russia, in Germany, in other countries where there is dictatorship, commonly the people praise democracy and talk its name.I want to tell Mrs. Gandhi one thing. She

is a very clear - speaking woman. Whatever she wishes to say she says very lucidly. It means to me that her belief in the parliamentary order has been lost. It would be a very good thing if she were to say clearly that today in this country there is no place for this system. Let the causes of that be what they may, I do not wish to go into them.

December, 1975

After Sheikh Who?

"Cemeteries of the world are full of indispensable men", said France's De... How true; And yet every politician in power believes that the world cannot go on without his 'blissful presence' and noble manipulations. This is one reason politicians in this country seldom retire and when they occasionally do (like Acharya Kripalani did at the age of 90), makes front page news.

Some people are so obsessed with their indispensability that in the process they are convinced of their invincibility too. For a politician in power this marks a danger signal which can prove to be the beginning of the end. Indira Gandhi and Pakistan's Z.A.Bhutto are the two recent examples of this paranoia in politics.

Long back in 1953, Sheikh Abdullah, the charismatic Kashmiri leader, also became the victim of his megalomania. He believed or wanted to believe, that he was indispensable for the country and invincible in his own state. His

subsequent dismissal and arrest were the inevitable consequences of an ambition run amuck and Sheikh's successors, Bakhshi Ghulam Mohd., Ghulam Mohd Sadiq and Syed Mir Qasim shattered his delusions. They proved it beyound reasonable doubt that he was neither "indispensable" to Kashmir's relationship with India nor for the smooth running of the state administration.

For 22 long years the state was run by some of his senior and not so senior deputies with considerable efficiency though against numerous odds; one of these being Sheikh himself. After more than two decades, when the Sheikh came to power in 1975 as a result of an agreement with Indira Gandhi, he must have been shocked to see the progress the state had made without his being at the helm of affairs.

The July 1977 elections brought him back to power on his own, with a popular backing and a massive mandate. The landslide victory of the National Conference, the party headed by him was his personal triumph and a crushing blow to all his opponents which included some of his erstwhile colleagues and lieutenants.

The Sheikh has now emerged as the most important central figure in the state's politics. It is his personality, more than policy and politics,

which dominates not only the ruling party but the whole political spectrum of the state. The awe he inspires and the authority he wields, has no parallel in the state's political history.

This has made his position in the party – National Conference – unassailable and with the near complete rout of the opposition, he is virtually running a one man show due to his long standing of nearly 30 years in the state politics, people of the valley, in particular, have grown accustomed to Sheikh's image that they cannot think of the past and the future without him.

Beginning from July 1931, the Sheikh has throughout dominated the political scene of the state either as a political prisoner or the one who would send others to prison.

His latest in this game, is the Public Safety Act which provides for the detention without trial (Ironically, he was the first victim of this law in 1953, against which he fought for nearly 22 years). With his advancing age (he is 73 years old) and failing health (he had a very severe heart attack during the July 1977 elections which according to some observers helped him considerably in his electoral fortunes). The subject of his succession, though not discussed openly, is assuming great importance and relevance.

The question 'After Sheikh who?' is a serious and urgent one deserving attention and careful consideration.

Looking at the present heiıarchy of the ruling National Conference, the first name which comes to mind, as a natural successor to the Sheikh is his senior most colleague Mirza Afzal Beg, the vice president of the party and the deputy Chief Minister of the state. But to those who know it only proves how deceptive appearances can be.

Some time back the Sheikh did refer to Beg as his successor and Beg did behave like one. But that is when the prospect of political power was a mere dream and not a reality. As expected, the power game has brought in new factor and after assumption of office by the Shiekh in February 1975 the equation between him and Beg has undergone a sea change.

Even though Beg was designated as deputy chief minister by Sheikh after his electoral triumph in July 1977, 'insiders' believe that it was more out of political compulsions and expediency than for any love and regard for Beg.

Both leaders, in fact, have been drifting apart for quite sometime and it is very widely known that Mirza Afzal Beg's ouster as president of the National Conference in 1976 was part of a

concerted move by an anti-Beg faction to liquidate him politically.

Beg had felt so slighted on this shabby treatment that only a few days before the withdrawal of support by the congress legislature party to Sheikh's Government in March 1977, he had made up his mind to resign both from the government and the party. The resignation letter was about to be released to the press when Sheikh got wind of it through the then chief secretary Soshital Bannerji.

The Congress party's withdrawal of support delayed Beg's release of the letter by a day and Sheikh, in the meantime, begged him to reconsider his decision and withdraw the resignation from the party. Beg reluctantly obliged All was apparently over. But Sheikh and his family have neither forgiven nor forgotten.

A strong lobby headed by son-in-law Ghulam Mohd. Shah, a powerful minister in his cabinet, is busy cutting Beg to size with Sheikh's blessings. To counter Beg's influence and weight in government, Sheikh has been promoting Devi Dass Thakur, a former judge of High Court and a political light weight from Jammu; and it is Thakur who has been acting as deputy chief rather than Beg.

In the organisation, Beg's waning influence is directly proportional to Shah's rising power. But it is the Shiekh's elder son Dr. Farooq Abdullah who poses a greater threat to Beg as success or than son-in-law Shah.

Farooq, 44, is a fulltime politician with undisguised ambitions. Though he has lived and practiced medicine in England for 13 long years, his professional accomplishments as a doctor are yet to be discovered. Sheikh Abdullah had been grooming him as his successor even when he was away in England.

Earlier he had settled in England taken up British citizenship and married an English nurse; but immediately after Sheikh became Chief Minister, Farooq wound up his practice and flew back to Kashmir alongwith his wife and children to settle here permanently.

Farooq's return must have upset the applecarts of both Beg and Shah's ambitions but they have learnt to live with the threat by competing with each other keeping the young doctor in good humor.

Farooq is presently Director of the eleven crore project 'Sher-I-Kashmir Medical Institute', under construction in Srinagar. But this is only an alibi. He has political ambitions and in the words of Mr.

Desai "is getting experience for the time being". Young and dynamic, he is assiduously building a political base and is closely associated with the Youth Federation – the youth wing of National Conference.

G M Shah, the son-in-law, and Tariq, the second son of the Sheikh are known for arrogance and impertinence. Farooq is popular for his soft spokenness and sauve manners seems to be his father's choice and if political weather favours him he may win the battle of succession wihtout much difficulty. The only two rivals he will have to confront with are his mother and brother-in-law Shah.

Begum Abdullah, 65, popularly known as *Mader-i-Meherban* (the kind mother) was elected to the Lok Sabha from Srinagar in March, 1977. She is widely respected for her poise, dignity and devotion to her husband and the causes he has espoused. Deeply religious but modern in her outlook, Begum has effectively led many campaigns, whenever her husband was detained or prosecuted in the course of turbulent political life.

Begum came in the open for the first time during the 'Quit Kashmir' movement in 1946, organised peace and food committees in the valley. After Sheikh's arrest she did not participate in any overt activity but her name did figure in the

accused in the conspiracy case against her husband and some of his colleagues.

She was alleged to have received huge sums of money from across the border through carriers and couriers. Her successful, campaigning against Bakhshi Ghulam Mohammad, the ex-Chief Minister of the state in the 1971 parliamentary elections when the Sheikh was externed and his party 'Plebiscite Front' banned, was the one major factor responsible for my victory against the Bakhshi.

Though her own election in 1977 was not a very smooth and clean operation, Begum's campaigning during the July 1977 assembly elections was a most remarkable performance. Making full use of the Sheikh's sudden illness during the campaign, she succeeded in operating a mass hysteria in the valley resulting in a landslide victory for the ruling National Conference.

Though a successful campaigner, she is essentially a non-political being who neither understands the political niceties nor is capable of comprehending the political situations. She has no opinions or ideas of her own but her association and identification with the Sheikh for the last 40 years is a very important factor in her favour.

After the Sheikh, she alone has the charisma and the glamour, so essential for a leader in a

politically backward and intellectually stagnant society. The Begum, in all probability, may emerge as the most acceptable choice to fill the vacuum. She seems to be preparing herself for the 'new-role' and between son Farooq and son-in-law Shah, many in the party may prefer her.

Even Beg may throw his weight behind her to avoid the possibility of Farooq or Shah gaining the ascendancy. Begum Sahiba, too, having tasted the elixir of public adulation would like to have a fling at weilding power herself. In that case Farooq may have to wait.

The most eager, enthusiastic and impatient contender for the Sheikh's mantle seems to be his son-in-law Ghulam Mohd Shah. Insolent, short tempered and the most unpopular member of the Sheikh family, Shah's sole claim and qualification for his ambition is the accident for his matrimony. He was a government officer during the Sheikh regime after 1947, when he married Sheikh's eldest daughter Khalida Jan. In 1953, after Sheikh's dismissal and arrest, Shah was also arrested and thus launched on his political career.

He became General Secretary of Plebiscite Front and was considered to be closer to Beg, the president of the Front, than the Sheikh. In 1974 he resigned from the Front and attacked Beg virulently for his bossism and lack of scruples.

Since then, Shah is Beg's bitter critic and arch opponent in the party.

Conscious of his image as an arrogant, haughty and short tempered bully, Shah has been trying hard to put his best foot forward. He is trying to build a base for himself in the organisation and, it must be admitted, he has succeeded to some extent. But I do not think he has many chances against Begum or Farooq. He can at best make Farooq's succession difficult by supporting Begum Abdullah.

Sheikh's decision to include Shah in the cabinet was a clear rebuff to Beg who seems to have 'reconciled' with the painful situation of being number four in the power heirarchy. The fact that Sheikh no more refers to him as his successor coupled with the importance which he has been giving to finance minister D D Thakur and G M Shah, must have disappointed and disillusioned Beg considerably.

Another factor against Beg is his health and the physicians looking after the Sheikh and Beg are not very sure as to who will survive whom. Commenting on the miraculous recovery the Sheikh made after the heart attack and his robust health, a top physician told me: "the question after Sheikh who?" is neither urgent nor relevant."

Apart from the three family contenders and Mirza Afzal Beg, one man who must be nursing the ambition of succedding Sheikh is young, energetic and flamboyant DD Thakur, a Rajput from Jammu.

Earlier as law minister and now as finance and education minister, Thakur made a mark and won the Sheikh's confidence. But winning the Sheikh's family is a dangerous portent. It arouses intense jealousies in Sheikh's family which can prove to be the beginning of the end. Thakur has other handicaps too. He hails from Jammu. He is a Hindu and has neither political stature nor any roots.

The fact that Sheikh Abdullah's line of succession in his party can only be traced to his family is an eloquent commentary on the state of his party. Like a banyan tree he has not allowed anything to grow beneath it. With the passage of time and the process of elimination, the National Conference headed by Sheikh is completely devoid of any intellectual or political commitment and denuded on any talent.

It is a party revolving round a colossal whose personality is its policy and politics. It cannot see beyond the personality factor and therefore, has to sustain itslef on a cult – the cult of personality.

That explains the narrow choice before the party. A choice that has to reflect the dominating personality of the Sheikh and who can reflect it more closely the son, the wife or the son-in-law.

Courtesy : ***Onlooker***,Bombay---1978.

A 'Third rate people with fourth rate' leaders

Those who had congratulated the Indian people for their total commitment to democracy and democratic institutions only a year ago, are intrigued by the strange phenomenon called 'Indira Gandhi'! The politicians, political analysis and the intellectuals who, in a self-congratulatory mood had described the March '77 elections and their outcome as the second battle of independence, are baffled by the Indira wave sweeping the country.

Some of them can hardly conceal their nervousness and have started talking of disenfranchising the lady. For quite sometime they had tried to explain Mrs Gandhi's victories in the South in terms of voter's ingorance of excesses committed during the emergency. An eminent economist like Late BR Shenoy had convinced himself that Mrs Gandhi had rigged the parliamentary elections in the South (He told me so in a seminar held in Agra in August 1977 when I expressed my doubts about Indian peoples'

commitment to democracy and democratic values citing the election results of the Southern states). Many others believed that when the whole truth about Indira Gandhi's emergency raj is known, the south will also rebuff and reject her the way North had done a year before.

But the election results of the state assemblies in Andhra Pradesh and Karnataka proved these prophets of Mrs Gandhi's doom wrong and their expectations a mere wishful thinking. The south not only ignored the 'excesses' and 'illegalities' committed during emergency and exposed by the Shah commission, it also endorsed Mrs Gandhi as the only leader of national stature and accepted her party Congress (I) as the only viable alternative to Janata.

The dismal failure of the Janata in these states and the complete rout of the Reddy Congress was so embarrassing to the champions of democratic revolution of March 1977 that they were rendered, speechless for a while. Later, they resorted to the game of statistics to prove that the Janata Party had secured more votes in assembly elections than it polled during parliamentary elections. In a bid to decieve themselves some Janata stalwarts challenged Mrs Gandhi to prove her strength in the North. The irrespressible Subramaniam Swamy threw a challenge to Indira Gandhi to contest the Azamgarh by-election in UP and see where she

stood. Swamy was confident that Mrs. Gandhi would not dare accept his challenge.

This was about a month before Mrs Gandhi administered the first shock to the Janata Party in Karnal by-election where her nominee lost by a not very significant margin. In Azamgarh, two months later, her candidate Mohsina Kidwai, an 'outsider', defeated two powerful local Yadav opponents of Janata and Congress by an overwhelming margin of 35,000 votes. Poor Chanderjeet Yadav, who had held the seat for three successive terms, lost his deposit also. I do not know how the Subramaniam Swamys of the Janata Party reacted to Indira Gandhi's spectacular triumph but the crisis in the higher echelons of the party touched off by the Azamgarh debacle, is still unresolved.

Unable to reconcile themselves to the fact that the tide had started turning against them and in favour of Indira Gandhi, the Janata leaders are trying to find scapegoats and inventing 'causes and becauses' of their well deserved defeat.

Why are people disillusioned and disenchanted with the Janata rule within the short span of one year? Why have they started lionizing Indira Gandhi whom they had rejected and humbled hardly a year before? Why are they indifferent to the exposures of Shah Commission regarding the emergency mis-rule of Indira and her son, Sanjay?

Why did the South behave so differently from the North during parliamentary and state assembly elections? Why and how is she retrieving the lost ground in the North as is apparent from the huge crowds she attracts? Why on earth is the Indian electorate behaving in this peculiar maner? These are a few pertinent questions which Janata leaders in particular and the political commentators in general are averse to answer.

Though the euphoria of democratic revolution in March 1977 started evaporating soon after the emergency heroes entered the portals of power, some basic assumptions and interpretations put forward to explain Indira Gandhi and her party's debacle in the North are still considered to be valid. This is what prevents and clouds the objective analysis of the phenomenon called Indira Gandhi. To understand and appreciate the whimsical behaviour of the electorate, a few myths based on false premises and wishful thinking are to be exploded.

One such myth, nursed over years is the politically conscious voter, who has been invested with wit, wisdom..and what not.

This voter is further accused of dedicated commitment to democracy and democratic institutions. The politicians have vested interest in promoting this myth and are exploiting it for their

own ends. But what is surprising is that the intellectuals, academicians and publicists have also fallen prey to this make-believe. To build image of India, as the greatest democracy of the world and living up to this image we have been using and abusing the democratic jargon, with no efforts to create a democratic temper and traditions. We seem to have convinced oursleves that adoption of western democratic institutions and universal franchise has given us a right to call ourselves the greatest democracy of the world. Some western commentators and columnists, for some known and unknown reasons, have also been feeding our ego, illusions and delusions.

Mrs Gandhi is the first leader and politician who shattered this myth in June 1975. She obviously, knows the ordinary Indian voter and his mind and is, must be admitted, reaping the harvest of her knowledge even today. The declaration of Emergency in June 1975was a risk.but obviously, a calculated one. She seems to have been so sure of her that she did not even bother to consult her cabinet colleagues. She was right. Not a single cabinet minister of the greatest democracy raised even a feeble protest. Mrs Gandhi, with one stroke exploded a great myth which her father had done much to promote and preserve.

What followed the declaration of emergency is too recent to need recounting, but for the benefit of

those who have short memories and a tendency to live in a world of make believe, it is pertinent that the "democratic minded and freedom-loving Indians" by and large welcomed the measures curbing the freedom of individual and the press. The man in the street and the man in the "Wall Street" both accepted the new system without any protest barring the political activists and intellectually oriented, the country, on the whole greeted the declaration of emergency with a sense of relief. And the protest of the political elite and intellectual community was so feeble that Mrs Gandhi could rightly claim that "not even a dog barked."

However painful and shameful it may be, there is no escape from the fact that emergency was not only accepted but also quite popular with a majority of the people all over the country. The immediate relief it gave to the people from the constant chatter of politicians, student indiscipline, labour unrest and unstable prices were accepted as gains of emergency and nobody seemed to bother about loss of fundamental rights & freedoms. At least, it was so till t he enfant terrible of the emergency S. Gandhi appeared from behind the curtain and moved right on to the stage.

This proved to be a watershed and Mrs Gandhi's grip on the situation started loosening. What followed in the name of family planning

programme and beautification-cum-rehabilitation drive is now our recent history. The results of the March 1977 elections were, in fact, in essence a protest against excesses committed and in the implementation of these programmes and it would be wrong to subscribe to people's anger over 'loss of freedoms and fundamental rights'; which some would like to believe.

To quote Prem Nath Bazaz, a well known Kashmiri and Publicist : "It is certainly no resolution, partial or total at best we can say we have made a telling Protest against oppression and suppression. That is all".

Bazaz said this in April 1977, hardly a month after the electoral triumph of the Janata party, when it was fashionable to describe it as a great revolution. The later events justified his cynicism.

It might hurt our pride and democratic sensibilities but it is a fact that the edifice of Indira Gandhi's dictatorship did not collapse because of people's organised might or irresistible desire for freedom but for its sheer inefficiency. As the Guardian pointed out:

Mrs Gandhi who had been a very good Democratic politician, grew to be an amateur as dictator".

In other words, if she had acted as a professional rather than an amateur, and not made the costly error of calling for elections, most of our today's war heroes would have succumbed and surrendered unconditionally. And it is an open secret that some of them were already negotiating for it.

After the Janata victory in March 1977, the so called 'resistance' to the dictatorial regime of Mrs Gandhi, has been highly exaggerated and over publicised. Barring Turkman Gate and Muzaffar Nagar clashes resulting in the death of about one hundred people, the 'resistance movement', which is supposed to have forced the lady to go for the elections, is completely shorn of any heroic deeds. And Turkman Gate, Muzaffar Nagar incidents, by the way had nothing to do with people's burning desire for the restortion of civil and constitutional freedoms.

Why didn't our leaders, politicians and intellectuals put the resistance against the emergency which Bangladesh (then East Pakistan) put against the military might of West Pakistan. Just to recall one incident. The Chief Justice of East Pakistan had refused to administer oath to the Government General Tikka Khan whom Yahya Khan had appointed in the wake of the growing resentment in East Bengal (now Bangladesh). Many judges, civil servants, university professors

had resigned as a protest against the high-handedness of Pakistan rulers.

What happened and is happening in neighbouring Pakistan is still more valid. More than three hundred people died after it became known that Bhutto had rigged elections in July last. Ambassadors accredited to various countries resigned in protest against Bhutto's suppression and oppression of his opponents. And now, it is the journalists who are in the forefront against the military dictatorship of general Zia. They are whipped, jailed and tortured but there are no signs of their compromising on the issue of freedom.

In a seminar on 'Crisis in Democracies' held in New Delhi in January this year under the auspices of Indo-British exchange, a British participant asked a very uncomfortable question: "How many judges of the Supreme Court or High Courts, professors in the universities or colleges, civil servants, members of parliament or journalists resigned their jobs protesting against the subversion of rule of law and democratic institutions by Mrs Gandhi.

The Indian participants, including myself, were rather embarrassed because the answer to this 'impertinent' but very relevant question was "NONE". Our Supreme Court judges preffered to interpret statutes according to their 'literal'

meaning. The High Court judges were more forthright and courageous but not courageous enough to resign. The professors and other intellectuals protested in silence. The civil servants were competing with each other in Parliament with a few honourable exceptions, marked time. Madhu Limaye and Sharad Yadav were the only two MPs who resigned their seats after the life of the Lok Sabha was extended beyond its prescribed limit. The journalist world surrendered unconditionally and the few exceptions to this mass surrender, are the few individuals who put up a brave fight and suffered in consequence.

The fact that the return of Mrs Gandhi to power is being discussed and debated seriously these days is a sad and silent commentary on our democratic instincts, temper and traditions. Contrast it with the American situation. Can anyone in America ever think of Nixon's return to power? Not even Nixon and don't forget that compared with Mrs Gandhi's crimes, Nixon's conduct in watergate was a mere misdemeanor In India Mrs Gandhi is not only forgiven for her acts of commission, she is, infact, adored and admired for being a strong leader compared to the Janata weaklings.

Sorry my saying so, but we Indians have a strange fascination for a powerful, ruthless and charismatic dictator. Nehru also owed his power and popularity to his benevolent dictatorial bent of

mind. Compared to his daughter, he was, of course, a great democrat. But this is no compliment. I will not be divulging a secret if I say that most of the people today miss Mrs Gandhi's strong, unprincipled and ruthless misgovernment of 19 months. They talk nostalgically about the discipline, 'the stability of prices' and the comfortable law and order situations prevailing throughout the country then. Strangely enough, a number of achievements which even Mrs Gandhi does not claim, are attributed to this era of "*annushasan*" called emergency. In other words Mrs Gandhi is becoming a legend in her life time. That explains her growing power and the Janata's diminishing strength.

The fact that this country needs a legislation to curb and curtail the growing tendency among legislators to defect from one party to another should finally make us give up our democratic professions and pretensions. A country where elected members of an assembly or parliament are to be prevented by legislation, from leaving their party, cannot claim to be a democracy. The essence of democracy is the free will and the free choice of the individual and a system in which the curbing of such a freedom becomes necessary to sustain the system can be called anything but democracy.

Whatever may be the compulsions of the rulers to prevent defection from one party to another, the

introduction of such a bill speaks volumes about the quality of our elected representatives, their character, calibre and commitment to certain values. It indicates, at the same time, the level of political consciousness of our electorate, the state of development of our political morality and democratic institutions and above all our national character. We have adopted the Westminister model of democracy to delude ourselves and deceive others but we can neither delude ourselves nor deceive others for all times to come.

Let us face the fact that we are a third rate people with fourth rate leaders. The illusion of our being the greatest democracy has absolutely no relation to the ugly reality of our hypocrisy. We are, in fact, the greatest hypocrites in the world. How else can we explain the rise of the most corrupt, the most unscrupulous and the most unprincipled to the dizzy heights of power and politics in this country.

Courtesy : ***Onlooker***,Bombay---1978.

AINANUMA

(4)

Qurrat-ul-Ain